

مندرمیں محراب

نور اہل نیازی

PDFBOOKSFREE.PK

یہ جو میں نے عبادت کا سفر کیا اور جب یہ تحریر لکھی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ صرف اسی سفر کا قصہ نہیں۔ میں نے ان سفروں کے تجربات بھی لکھے ہیں جو مجھے اسے بھی کیے تھے۔ ان بگڑن والی جگہوں کے جہاں جاسے کی آرزو ہے، ان زمینوں کا تذکرہ بھی ہے جہاں جانا منع ہے۔ شاید ان خواہشوں کی بات بھی ہو چکے ہوں گے تھے۔

یہ کتاب کرنی دوادائیں۔ ایک واقعہ ہے۔ کئی واقعات سے بنا ہوا واقعہ۔ ایک تعلیقی مشاہدے کی جھلک ہے جس نے گزشتہ پچھلے کسی نئی کو بچھڑنے نہیں دیا ہے۔ سفر اپنی منزل سے بے خبر ہو کر بیان کرتے ہوئے ٹھکن اور ملن دو مختلف کیفیتیں ہیں جہاں تب ہمیں ادھر و ادھر میں قلم ڈبو کر کھنا آتا ہے۔ میرے جیسے بے ایمان کے پاس خاک آلود خوابوں اور خوشچلن خواہشوں کے علاوہ اور کیا ہے۔ میرے نزدیک سفر کرنے زندگی کرنے محبت کرنے اور نیند کو خواب کرنے میں کچھ فرق نہیں۔ ہر عمل مقنا یا معنی ہے اتنا ہی بے معنی ہے۔ جو بندہ مرناسے مزنا کب ہے۔ بے سفروں پر جاتا ہے۔ کوئی آدمی مگر زندہ ہو جائے اور کچھ لکھے تو سفر نامہ لکھے۔ میں اسے اُمِّ الاصناف کہتا ہوں۔ تمام اصناف میں اس طرح دل ملا ہوا ہے سفر نامہ جس طرح گرسے وادیوں میں پانی آدمی۔ ہوا کا جھجھکا ہوا میں اود ہوا فضا میں۔ میں نہیں جانتا مگر میری یہ تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہوئے کسی نہ کسی نکتے پر مجھے تقریباً ہر صفت کا گماں ہوا۔ اب جو بھی طرح محسوس کسے وہی لکھ گئے۔

میں پاکستان کا ہم عمر ہوں اور اس کا ہم عصر بھی ہوں مگر میری زمین اپنا زمانہ دھندلی ہے۔ میں اپنے محبوب وطن کی طرح سٹپلا اور انتشار کا شکار ہوں۔ ٹوٹا اور ٹوٹ کے بڑا ایک تعلیقی عمل ہے۔ تیسرے کو توڑ کر دیکھیں تو ہر کچھ ایک آئینہ بن جاتی ہے۔ ہر چہرہ ملک کے نقشے کے ہم عمر ہیں کیوں کہ جاتا ہے۔ اس خوف نے ہمیں بدل کر دیا ہے۔ ایک ہمارے گوشہ زمین کے لحاظ سے آئینہ بنی اور آئینہ میں پاکستان کے لیے نغمہ تو ہیں۔ البتہ وہ صورت حال ابھی نہیں کر کوئی مصلحت ماحول ہمیں نصیب ہو۔

پاکستان ایک شفاف حقیقت ہے۔ لٹے گا تو کئی پاکستان بن جائیں گے۔ بٹتے چلے جائیں گے۔ پاکستان میں پٹنے والی مختلف تحریکیں تحریک پاکستان کا عکس ہیں۔ ہر صغیر پھر ایک تحریک پاکستان کا منتظر ہے پاکستان جیسے خود کو تحریک پاکستان کا میدان بننا چاہا ہے۔ ہر ملک تو کسی کرانے کا دیوار چاہتے ہیں۔ ہمارے ان بحران ایک ایسے لمحے کے دل سے پھوٹ رہا ہے جو ہمیں دہان لاکھڑا کرے گا۔ جہاں سے ہمارا ایک اور زمانہ شروع ہوگا۔ وہ ہم پر ہم ہرے ماحول کی آتش فشاں میں کرنی کہیں ہو رہے۔ ہمارے یہ سب کچھ۔ کب تک ہوگا آخر۔ الاؤ تھے گا تو بن جائے گا۔ اور روشنی اپنے راز ضائع نہیں ہونے دیتی پاکستان روشنی کا ایک دانہ ہے۔ ہر راز عام ہوگا کبھی۔ کب تک ایک ملک کے باشندے ہوں گے اور دنیا بھر کے انسان کا مذہب ایک ہوگا۔ کوئی آخر ایک مقام پر مذہب بن جاتا ہے۔ نظریہ کسی کو صاحب نظریہ بنائے تو وہ ظالموں کا پتھارا بن جاتا ہے۔ تنگ نظر لوگوں نے دنیا کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ نظریہ پاکستان ایک صداقت ہے۔ صداقت بڑوں کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ اسے ڈسوا کر دیتے ہیں۔



ناشر: طاہر اسلم گودا



جملہ حقوق محفوظ

۱۹۹۱ء

پاکستان پبلشنگ اینڈ ڈسٹریبیوٹرز سوسائٹی

ہے

پہلی بار

تعداد

ایک ہزار

مطبع

طیب اقبال پرنٹرز لاہور

قیمت

۹۰ روپے

میرورق

اجدرشق

احمد ندیم قاسمی
عطیہ الحق قاسمی
کے نام

دہلیز

۱۳

سفر اور خواب

۱۹

ہم سفر لمحے کی آشنائی

۲۰

پاکستان کی مہر

۲۲

ہند میں سرزمین

۲۳

شاعروں کی مکہ

۲۵

ڈنس ٹو بے سڈ

۲۸

مرحوم ہندو شاعر

۳۰

بے چارہ آتشیں بادشاہ

۳۱

بچہ چھوڑا

۳۲

سکھ اور شراب

۳۸

مزار پر ہندو عقیدہ قند

۴۱

بھارتی عہد کی پاکستانی مٹی

۴۲

پکے لاسکیو لرازم

۱۰۶	ایک مرد کا عورت	۴۹	مامہ مست قلند
۱۰۹	تھکن میں تھکن فرانسین	۵۲	پانی پت کی چوٹی لڑائی
۱۱۰	اے مجبور الہی! ہم مجبور الہی کیوں ہیں؟	۵۳	سکھ کارڈ
۱۱۶	خوشحال سمان کا ترجمان	۵۷	شہرہ ماہرے کا راز
۱۱۹	تبلیغی جماعت کا اصل کردار	۵۹	دل سے دلی - ہل سے ہولی
۱۲۳	پیلے تلوپوں کی قطار	۶۶	کعبے میں گاڑ جو برہن کو
۱۲۵	غائب مغلوب کے ہاں صدا دین	۶۸	گھر پر عورت کی پردہ بازی
۱۲۷	آل انڈیا ریڈیو میں سنسر شپ	۶۹	کششی دلی سے من مشقہ
۱۲۸	نارنجت میں جاتے گے	۷۲	آپاں سوچ تے جاواں گے
۱۳۰	پنج بھٹناں دی جوڑی	۷۵	سائیکل سوار سادھی
۱۳۲	یادری لو اس میں حسن فرداں	۸۰	گجراں اور محبت جلی کا کمال
۱۳۵	بھارت کا راسچوٹین	۸۳	مسلمان افسر کا ڈرائنگ روم
۱۴۰	ولینٹین میں سویت لینن	۸۶	ہندوستان یا بھارت
۱۴۳	آنکھ پھولی کے لئے بند باغ	۸۹	کھانے کی دعوت میں باگڑ بند
۱۴۵	مست مجبور! یہیں آکر بلا کر کھجور	۹۲	دین اور دین
۱۵۰	جو گندہ پہل کے دل پہلا فے	۹۳	ہرمل سے ہرمل
۱۵۳	مسلموں کی سیکولریت	۹۶	دولوں جڑیوں کا حسن امتزاج
۱۵۶	کھوٹے کھوٹے	۹۸	اردو گھر میں بے گھری
۱۵۸	مسلم انڈیا اور مسلم روس کی یکجہتی	۱۰۰	ترکان گیت سے بھارت کا منظر
۱۶۱	جسویں صدی کی ادبی نصابت	۱۰۳	خیکا گاندھی کی سیاسی مردانگی

۲۳۱	میاں زالی نگر
۲۳۳	'دعوتِ ملت' اور 'شہرِ مریاں'
۲۳۶	ٹوپی والے بچے
۲۳۸	ہمارا گاندھی پردہ سکرین پر
۲۴۲	گھر کی راحت
۲۴۴	شعبہ اقتدار کی یادگار
۲۴۹	میل کیلی چٹوں سے تھک جھک
۲۵۱	اس کے ساتھ ہجرت بھی کی جاسکتی تھی
۲۵۳	حیران کر دینے والے بابے سے مکالمہ
۲۵۷	سکرپان پر مجیٹا
۲۵۹	پتھان نے سیل شے
۲۶۱	نگلی عورت اور سانجی قبر
۲۶۴	ہوس کے پھول
۲۶۶	گر لڈن ٹیل میں سٹھنے دی لاٹ
۲۶۸	یہ بریل سنگھ مجید انوار
۲۷۰	جہلی نیازی بھی زندہ ہے گا
۲۷۱	کچھ سلم اتحاد سے پہلے قرانی
۲۷۳	تھی سلمی دیوی کرپام
۲۷۴	انسانی چوٹی
۲۷۵	پاک جسٹس سے پتا پاکستان ملک

۱۹۴	ٹھٹھ اور پڑی کی دلہائیاں
۱۹۶	جمہوری یونگیں
۱۹۷	ایک ممبر پارلیمنٹ کا اسٹوپ شمر
۱۹۹	علی کی عیتیں
۱۷۱	کونٹوائے کی محفل ذکر
۱۷۴	ہم ٹری اور ہم سفری کے مزے
۱۸۵	حسن آغا کی جیسی عورت
۱۸۹	ایک بے شانت افسانہ نگار
۱۹۱	غیر محفوظ بادشاہ کا قلعہ
۱۹۵	تمازی مکران کی ذاتی شخصیت
۲۰۰	جامع مسجدیں سیر سپا
۲۰۳	بجارت میں اردو صحافت
۲۰۹	پورے سے مینار کا اعتبار
۲۱۱	یکہر جاناں میں کون
۲۱۶	مصاحف کا عکس
۲۱۷	قادر اعظم زمنہ باد
۲۱۸	قیمت کی جمع قیامت
۲۲۰	گڈی کو کر مینڈے سے
۲۲۶	دبستان کھنڈ کے دروازے پر
۲۲۸	ادبی گاندھی کی بیٹی لڑکی

سفر اور خواب

کنز الخیر میں نے لکھا ہے کہ تخلیق کے دو ماخذ ہیں سفر اور خواب۔ ڈاکٹر سیل احمد خان نے اس بارے میں انتظار میں سے بات کی تو اس نے کما ستر میری زندگی میں کم ہے اور خواب زیادہ ہیں۔ مجھے ایک بڑے افسانہ نگار کا یہ جواب بھی اور اچھی سا لگا۔ مجائے انتظار نے خوابوں کو کیسے کارواہ کر لیا ہے اور اس نے کہانیاں کیسے لکھ لیں۔ اس کی کچھ کہانیاں کئی سفروں اور خوابوں کی نشانیاں ہیں شاید آدمی جو سفر کرتا ہے خواب دیکھتا ہے، خوابوں میں سفر کرتا ہے تو اس کو خبر نہیں ہوتی اس کے اندر کسی اور کو خبر ہوتی ہے اس کی مرضی ہے تائے نہ تائے۔

یہ جو میں نے بھارت کا سفر کیا اور جب یہ تحریر لکھی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ صرف اسی سفر کا قصہ۔ تو نہیں۔ میں نے ان سفروں کے تجربات بھی لکھ دیے ہیں جو میں نے کئے تھے۔ ان جگہوں کا حال بھی ہے جہاں جاسے کی ابھی مجھے آرزو ہے اور ان زمینوں کا ذکر بھی جہاں جانا منع ہے شاید ان خوابوں کی بات بھی ہو گئی ہو جو مجھے بھول گئے تھے۔ خواب بھول جاتے لگ جاتے تو یاد کا جزیرہ آباد ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب کوئی روداد نہیں، ایک واقعہ ہے کئی واقعات سے بنتا ہوا واقعہ۔ ایک تخلیق تجربے کی جھلک ہے جس نے گزرے ہوئے کسی ٹیل کو چھڑنے نہیں دیا۔ سفر اپنی منزل سے بے خبر ہو تو اسے بیان کرتے ہوئے جھٹکن اور لنگن دو مختلف کیفیتیں نہیں ہوتیں تب دھول میں کلم ڈبو کر لکھنا آ جاتا ہے۔ میرے جیسے بے مایہ انسان کے پاس خاک آلود خوابوں کے علاوہ اور کیا ہے۔ میرے نزدیک سفر کرنے، زندگی کرنے، محبت کرنے اور فیئر کو خراب کرنے میں کچھ فرق نہیں۔ ہر عمل جتنا ہی معنی ہے اتنا ہی بے معنی ہے۔

معلوم سے نامعلوم کی طرف اور نامعلوم سے معلوم کی طرف۔ جو بندہ مرنے ہے مرنے تک سفروں پر جاتا ہے۔ کوئی آدمی مرکز زندہ ہو جائے اور کچھ لکھے تو سفر نامہ لکھے۔ میں اسے ام الامان کہتا ہوں۔ تمام اصناف میں اس طرح رانا ملا ہوا ہے سفر نامہ، جس طرح گھر سے دیا توں میں مٹی اور پانی گھلے ہوئے ہیں میں نہیں جانتا کہ میری یہ تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہوئے کسی نہ کسی موقع پر مجھے تقریباً ہر صنف کا ملال ہوا۔ کئی جگہوں پر بڑا گمانی ہوئی۔ ڈاول، افسانہ، آپ بیتی، خاکہ، مثنوی، نظم یا کچھ اور۔ اب جو جی طرح محسوس کر رہی تھی۔ یہ بکھری بکھری باتیں ہیں جو شاید کہیں بکھری بکھری لگیں۔ ٹکھرنے کا ٹکھرنے کے ساتھ کوئی تعلق تو ہو گا۔ میں نے کسی خاص تسلسل کی کوشش نہیں کی کسی بکھراؤ کا بھی شک ہو شاید نہیں۔ اس حوالے سے شک کا قاعدہ چھٹنے والے کو دیتا ہے کچھ تو لکھتے والے کو بھی ملنا چاہیے۔ لکھا ہوا لفظ اور خیال اور تجربہ جس بھی صنف میں ہو کسی نہ کسی سڑی یاد دلاتا ہے۔ سفر آدمی اپنے اندر کرتا ہے یہ سفر تو

ہوتا رہتا ہے۔ ایک سفرنامی کی طرف ہوتا ہے۔ مستقبل کی طرف بھی ہوتا ہے۔ دونوں طرف یکسو تہی ہوتا ہے۔ پھر سفر کسی نہ کسی انداز میں کھو جاتا ہے۔ جیسے ہوا کا جھوکا ہواش اور ہوا فضا میں۔ ایک سفر میں جو لوگ ملتے ہیں جو مشترک کچھ ہیں کس اور بھی ایسا ہو چکا ہوتا ہے۔ جیسے کسی آدمی کو پہلی بار مل کر آدمی سوچتا ہے۔ اسے میں کی بار مل چکا ہوں کچھ لوگ جو مجھے نئے عمارت میں کہیں اور میں تو شاید بالکل اچھے نہ لگیں۔ جو رنگ دیکھے، کسی اور ملک میں ہوں تو مجھے کیسے ہوں۔ میں اگر پھر عمارت جانوں تو مجھ کو حال ہو میرا۔ بس انہی خیالوں، یادوں، ٹیکنیتوں، مشاہدوں اور تجربوں کی انفرادیت کا بیان سفر نگاری ہے۔ ادب ہے۔ ویسے مجھے بار بار کہیں جانا چاہیے لگتا۔ بار بار چرچا جاتے والے بھی کاروباری سے لگتے ہیں۔ روئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری کی بات الیت اور ہے۔ اگر آدمی کسی نئے جذبے سے بھر اہوا چائے تو ہزاروں بار بھی جائے گا تو بار و گرجا جائے گا۔ پہلی بار جائے گا۔ کچھ لوگ، کچھ جگہیں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ جب دیکھو ایک نیا جہان ہوتا ہے۔ محبوب چیزوں سے ملتے ہوئے ان محنت ملاقاتوں کے بعد بھی ایک اور زمانہ ایک اور زمین دل میں ہوتی ہے۔ یہ ہوتا ہے ان دیکھے کو دیکھا سب کو نظر آتی ہوتی شے میں اسے دیکھا جسے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ میں یہ بات کرتے ہوئے ادھر ادھر ہو گیا ہوں۔ مگر درہم برہم میں ہوا راجہ الجمن نہیں دو بھٹتے بھی نہیں۔ مگر لوگوں نے عمارت جانا کیا۔ دشمن بنالیا ہے خود کو اور اسے کی رسی سے باندھ کر گھسیٹتا رہا تو قاعدے کی لاشی سے ہاتھ کیلے جاتا کوئی سفر ہوتا ہے۔

جب آدمی سفر نامہ بناتا ہے اور وہ ہمسفری کا رشتہ تحقیق میں کرتا تو بہتر ہے وہ انشائیہ لکھ لے۔ ورنہ جیسا وقت لے گا کہ ”میرے کئی ادب کا مطالعہ پر دین کی سیاحت چھیلے۔“ اس حوالے سے سفر نامہ تو بار بار دہرایا ہے۔ نئی جگہوں پر ذہن دل میں سوال بہت اٹھتے ہیں۔ میں نے ان سوالوں کو اٹھا کر اپنے چاروں طرف سمجھ دیا ہے۔ ان سوالوں سے جو مکالمہ جس کا تعلق چاہے کرے یا نہیں اپنا خواب بنائے یا جگرتا۔ استفہام اور الہام کسی سفر میں تو ایک مقام پر آکر گرسے گا۔ ایک سوال تو سیدھا سیدھا ہے بالکل کہ عمارت کے سفر میں ہندوستان کی سیر کیسے کریں۔ ہندوستان ایک ملک تھا۔ عمارت ایک اور ملک ہے عمارت کو اس کی سیاسی قیادت نے پاکستان دشمنی کے چکر میں اپنی تہذیب سے جدا کر دیا ہے۔ اپنی تہذیب سے بچھڑنے کے عذاب سے بڑھ کر کیا سزا ہو سکتی ہے اور مسلم ہندوستان کی اپنی تاریخ ہے اس خٹے میں کسی خٹے میں جس کی تاریخ ہو اس کی تہذیب بھی ہوتی ہے۔ انگریز چلے گئے یہاں سے مگر ان کی تہذیب کے اثرات ابھی تک موجود ہیں عمارت اور پاکستان میں۔ عمارت میں یہ دیکھنا ہے مگر ہندو اسلامی متشوک کچھ کی بازیافت اور دریافت کے عمل میں خلوص نہیں۔ عمارت ہمارے لئے ایسی جگہ ہے جس کی فضا میں اپنا عیت اور غیرت پر ابر براہِ موجد ہے۔ سفر میں خوشی کی لہر اور خوف کا سامنا ہے جو ”تجربہ ہو ماز کی نہ ہو“ کیا عمارت کچھ ہو ”پہا کچھ بھی نہ ہو۔ مروت اور صبرمان نوازی ہو“ سبے نیازی اور سبے ادنیٰ نہ ہو تو بھلا کیا سفر ہو۔ سفر کے بغیر سفر نامہ جھوٹا عمل ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی بظاہر کہیں نہ جائے اور وہاں کی سیر کر لے۔ مگر ابھی ایک سفر ہے ایک سیر ہے ایک خواب ہے۔ سیرتی الارض میں بجائے کیا کیا ملاتے آتے ہیں سیر

محمد اہمل نیازی
گورنمنٹ کالج لاہور
۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء

ہمسفر لمحے کی آشنائی

پاک سرحد پر قدم رکھتے ہی میں اپنے اندر جا بڑا۔ میرے ہمو میں وہ لحد رقص کرنے لگا جب ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں پر پناہ تھا اور وہ لحد بھی دب پلا انسان اس خاک میں جا گھا۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کو اپنا ہمسفر بنایا۔ یہ دونوں شخص اس لمحے میں یکجا ہو گئے جو میرا ہم عمر ہے۔ لحد بنا دن سال میں مکمل گیا۔ سال صدیوں میں دفن ہو چکا گیا۔ صدیاں زمانوں کا رنگ اختیار کر گئیں۔

"زمانے کو برامت کو زمانہ میں خود ہوں" (اللہ تعالیٰ)

پھر یہ نیا دور پرانا زمانہ کیسا ہوتا ہے اور یہ کہاں ایک ہوتا ہے آج خدا مجھے بتا دیتا مگر کئی نے سلمان زمین پر رکھنے کی پکار کر کہا میں آگے کی اجازت نہیں۔

گھر سے چل کر میاں ہم ایک گھنٹے سے بھی وقفے میں پہنچے تھے۔ گھر اس سے پہلے ایک ماہ سے زیادہ کا عمر مائے تمام گھنٹوں سمیت صرف ہو گیا تھا۔ اس دوران بھارت جانے کی خواہش ایک طویل اور تکلیف دہ کوشش میں مسلسل بدلتی چلی گئی۔ کئی دوست مختلف ضابطوں کے درمیان چنن کر رہ گئے۔ اس سارے معاملے میں ہم اپنی نظروں میں مفلک ہو گئے۔ اب ہمیں محسوس ہوا کہ قصہ سرحد پار بھی دوسرا نہیں اس سلسلے میں واہٹے سے آگے والے ہم سے کسی طور پیچھے نہیں۔ دُور سے ہمیں نٹول نٹول کے بھیجا گیا۔ اور کھول کھول کے دکھایا گیا۔ لگتا ہے قلعہ دونوں طرف کے افسروں کی ہوئی نہیں۔ ہمیں ابھی سے یقین ہو چکا تھا کہ ہم جیسے الف کے بد معاش ہیں۔ میرے لہائی تھا نیندا تھے اور میں خوب جانتا ہوں کہ سید الف کے بد معاش کیسا تھو کیا سلوک کیا بیارنا ہے۔ وہ پیشگی اجازت کے بغیر شرمیں چھوڑ سکتے۔ شرمیں ان کی موجودگی کی قضاے میں خبر ہو گئی رہتی ہے۔ یہ الف جہاں بھی ہوا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ تینوں کو الف درکار مگر یہ پاسپورٹ پر سے شروع ہوتا ہے بلکہ "لی" سے۔ اگر بڑی کا خوف اور دوش لکھیں تو اس کے معانی کتنے بدل جاتے ہیں ہم معافی کے پیچھے پیچھے ہیں۔ ہم حرفوں اور ہندسوں کے پیکر میں پڑ گئے ہیں۔ ہر بڑے لکھے کے اندر ایک جاہل ضرور ہوتا ہے یا ہونا چاہئے۔ جاہل اور ان پڑھ میں فرق ہوتا ہے۔ ہر شریف آدمی کے اندر ایک چھوٹا مونا بد معاش ہوتا ہے یا ہونا چاہئے۔ بد معاش اور فتنے میں فرق ہوتا ہے۔ آدمی کو اپنے اندر ان دونوں کے ساتھ اس سے کچھ مختلف معاملہ کرنا پڑتا ہے جو ہم اپنے باہر ایسے بندوں سے کرتے ہیں۔

میں بھارت جانے میں دشواریاں تو ہوئیں یعنی ہونی چاہئے تھیں کسی اور ملک میں اس کا پڑاؤں حصہ بھی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ فرق خود دوسرے ملکوں اور اس ہمسایہ ملک میں جس کے بارے

میں کہا جاتا ہے کہ کبھی یہ ایک ملک تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبھی یہ ایک ملک نہیں رہا۔ ہم نے بھارت کے لئے بیش ہمسایہ ملک کا خطاب سنا اسے دوست ملک یا دشمن ملک کو مسافرتی وضع واری کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ دونوں طرف کے سیاست دانوں "سیاقوں اور سوچنے والوں کے کندھوں پر دو جتنی اور دشمنی کا پر اور پر اندر جو ہر وقت لدا رہتا ہے۔ میں اس پر جو بحثے دبا ہوا پاکستانی اور بھارتی "چوکیدار افسروں" کے سامنے جتن ہو ہو کے ہانپ رہا تھا کہ کانپ رہا تھا۔ وہ لوگ جو اس دروازے سے ہو کے نہیں جاتے حوے میں رہتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے پوچھ کر گزرنے کا قصان۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے ایک صاحب اور سردار حم کے چوکیدار نے اجازت لے کر اندر جانے والے کو روک دیا۔ دوسرے لوگ دھڑا دھڑا جاتے رہے تو اس شریف آدمی نے کہا حضور یہ جو بار ہے ہیں اس میں بھی دیکھو تو "صاحب" نے جواب دیا

"یہ جو بار ہے ہیں انہوں نے کوئی مجھ سے پوچھا ہے"

میں بھی کھڑے کھڑے بتا دیا گیا کہ قانونی طور پر واپسی بھی اسی راستے سے ہو سکتی ہے۔ میاں آئے اور جانے کا ایک ہی دروازہ ہے۔

ہم نے اپنی گھڑیوں کو آدھ کھینے آگے کر لیا اور خود وقت کے پیچھے ہو گئے۔ کرنسی تبدیل کرانی۔ ایک لیکر بھارت کرمت کچھ بدل گیا تھا کہ بظاہر کوئی خاص تبدیلی نظر نہ آتی تھی پہلے وہ جہاں میں سیاقوں اور پرندوں میں فرق تھا۔ وہ فضا کے کوارٹ تھے۔ زمینوں کے سمان تھے۔ میں ہیل چلنے والوں کی بات کر رہا ہوں جن کے قدموں کو مٹی چھو سکتی تھی جب وہ گھوڑوں پر بیٹھ جاتے تھے تو حملہ آوری بن جاتے تھے میں جیسے ہیں۔ اس طرح بھی جنگی "فرائض" ادا کئے جاتے ہیں۔ لیڈر تو اپنے ملکوں "ضروں میں بلٹ پروف کاروں میں بھرتے ہیں۔ ڈرانے والے خود کتنے درجہ ہوتے ہیں۔ ڈر اہو آدمی سفر میں کر سکتا آدمی خود فوہ ہو جائے تو وہ حیران بھی نہیں ہو سکتا۔ برٹان آدمی اور حیران آدمی مختلف حقوق ہیں۔

اب اس مذهب پر پڑے گئے اور ترقی یافتہ دور میں اس ملک سے ملنے گئے ہیں اور اسی دکھائی نہ دینے والی دیواریں قہر کر رہی ہیں کہ بس۔ بس جہاں زبان بدلی نیا ملک شروع ہو گیا ہے ملک کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ جب لوگ نے ملک کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ اس میں رہ رہے ہوتے ہیں۔ اپنا دین و دھرم اپنا ملک اپنی زمین اپنی زبان مضبوط سرحدیں ہیں مگر یہ بہت بڑا رابطہ بھی ہیں۔ انسان دوستی کے ملک خلاف غروں کے سامنے کھڑے دھرتی کی آغوشوں میں تڑپتی دھوپ بچھائی چل رہی ہے اور اسے بھی کئی خانوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اب تو چاندنی اور اندھیرے بھی بانٹنے چاہ رہے ہیں۔ دنیا کا نقشہ سامنے رکھیں تو جتنے سمندر اور دریا ہوا نالے گندے نالے نہیں ہیں جتنے ملک ہیں حالانکہ زمین پر خشکی صرف ایک ترقی ہے۔ بڑے بڑے جنگجو بندوں نے اپنے اپنے پائوں پر اور فضاوں پر بھی میرے لگائے ہیں۔

اس روشنی میں قیام پاکستان کا ذکر کیا ہو گا۔ کیا کرتے کہ اس وقت ہندوؤں کو ہمارے آسمان پر بھی اعتراض تھا۔ مسلمانوں نے زندہ رہنا تھا اسی زمین جہاں پاؤں تک نہیں اور آسمان نظر آئے۔ پاکستان

سکھتے ہیں سے چرے چمن لئے گئے ہیں۔ وہاں اسی انہی نہیں گھمستکیں۔ کہتے ہیں اس طرح ان کے مجھے ہوئے واپس آ جاتے ہیں۔ اب کے جانے والے آئے کیلئے نہیں گئے۔ ویسے بھی چر خدہ کاتے کا رواج اور تحریک کا زمانہ چلیا۔ امر تر اڑے پر ایک طرح کی جی جیسے کچھ بونے والا ہے۔ اب جو کچھ میں ہو رہا تھا اس کی ہیبت بھی بہت تھی۔ کچھ دیر کے قیام میں ہم تینوں نے کھی سے بات نہیں کی۔ آپس میں بھی نہیں۔ چپ چاپ بیٹوں یہ چاہتے اور بس چلی پڑی۔ بس میں بھی ایک بے بسی تھی۔ ایک قوم پرانی مہر تھی غالباً بھارت میں بننے والی بسوں کا پسلا ڈال تھا۔ وہاں بننے والی مونڑوں کا روں کے تمام ماڈل ایک سے لگتے ہیں جو ذرا سے بٹے چلنے کے بعد ”ڈبل“ ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے کچھ ڈرائیور اسے باقاعدہ اڑانے کی کوشش میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ رفتار جتنی بھی تیز ہو، جب تک اس کے پر نہ لگے ہوں یہ پرواز نہیں کرے گی۔ جس طرح چائے کی پیالی میں جتنا مرضی آئے بچھا ہوا، جتنی نہ ہو تو بیٹھنا ہو گا۔ اس کے باوجود بچھا چلانے اور گاڑی تیز چلانے میں کیا ہرج ہے۔ کوشش جاری رکھی چاہئے۔ سکھوں نے ایسی بہت سی کوششیں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ نتیجے کا انتظار کرنے سے تو کوئی منع نہیں کر سکا خواہ امتحان کا پرچہ غلطی کیوں نہ کیا ہو۔

یہ سفر بھی عمومی اور بدست میں نہ گیا۔ جان ہر پہنچ کر حقیقت جانہ ہری یاد آئے۔ حقیقتے اس شہر کو اپنے نام کیساتھ پکا پکڑ کے رکھا۔ تان پاکستان کیلئے والا شخص جانہ ہری رہا اور جانہ ہری ہوتے ہوئے پاکستانی۔ یہ انوکھا ملک ہے۔ پاکستانی ہونے کیلئے اس کے ہی کسی شہر کا باشندہ ہونا اتنا ضروری نہیں۔ ہمارے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ ان سے غیر ملکی زیادہ اچھے پاکستانی نظر آئے۔ حقیقت جانہ ہری یاد آکر بھول گئے تو جانہ ہری یاد آئے۔

بنایا کیا تھا ہر مضمین کہ اور ملک نہ بن سکیں مگر وہ بنے اور نہیں گئے۔ کبھی کبھی اس کیلئے بھی جنگ کا گزیر ہوتی ہے۔ بڑی طاقتیں پوری دنیا کو جنگ سے تیار کرنے کا ارادہ کرتی رہتی ہیں اور بھارت اس عالم کا۔ اب تو ہر ملک انہی بنانے کی فکر میں ہے تاکہ وہ قائم رہے اور جس نے انہیں بنایا ہے وہ دوسروں کو بنانے نہیں دیتا۔ چھوٹوں کو سرگرم نہیں دیتے دیں گے کہ یہ صحت کو نقصان پہنچاتی ہے اور یہ کہتے ہوئے بھی سرگرم ان کے منہ میں ہو گا اور یہ الفاظ ان کے منہ سے دھواں باہر لے کر آئیں گے۔ وقت آنے کا شاید کہ ہر گھر اسلحہ خاند ہو گا اور دوسرے گھر میں دوسرے اور اسلحے کے بغیر جاننا ممکن نہ ہو گا۔ میں بتائیں برس کی عمر میں ہر ملک میں پختہ قوا کو اس سے زیادہ عرصہ گزرنے کا باوجود کبھی اپنے ہمسائے سے لٹے نہیں گئے۔ البتہ ایک بات ہے کہ اب یہ نہیں ہو تاکہ منہ افغانے چلے آئے اور کسی ملک بلکہ ملکوں پر قبضہ کرتے چلے گئے۔ اگرچہ مفتوح راجہ صاحب نے بھی اس طرح قبضہ قائم کر لیا تھا قلاب اور کچھ ہوتے ہو ایک شہر افغان ہے پوری دنیا میں اور بہت زیادہ دیر تک فوجی بیخار مشکل ہو جاتی ہے۔ تہذیبی اور معاشی اور سیاسی بیخار کی بات اور ہر دور نہ بہت نام میں کیا ہو ایک بڑی طاقت کے ساتھ اور افغانستان میں کیا ہو رہا ہے ایک بڑی طاقت کے ساتھ۔

ایک بڑی طاقت کے ہنوز میں جتنا ایڈروں کے ملک میں ہم جا رہے تھے۔ ان علاقوں میں لفظ اور راستے جلدی جلدی آتشیں بیٹے جلدی سے میں ”عطاء الحق قاسمی اور مسعود ایک جنگی میں بیٹھ گئے جیسے خندق میں بیٹھے ہیں۔ ہم نے چونکہ سیدھا حالہ پہنچنا تھا۔ رستے کے شہروں اور چیزوں اور لوگوں سے رابطہ ایک مشکل کام بن رہا تھا۔ فضا میں ہر طرف بگڑنے کو گھاسی تھی رستے میں ہر طرف ہر جگہ آبادی کا گھل تھا۔ کہیں بھی محل رستہ نہ بن سکا۔ رستہ تو یہ ان ہوتا ہے کچھ اکیلا سا اور اگر دو کشادگی کی چادور لئے ہوئے۔ وسعت کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ آس پاس کوئی گاؤں ایسا نہ تھا کہ ہمیں کوئی نہ کوئی کچھ نظرت آ یا ہو۔ عورتیں بھی جو تھیں سکھتیاں ہوں گی کھڑی فصلوں کے درمیان خود رو پودوں کی طرح۔ کبھی تیز ہوئی تو کوئی کوئی جھلک بجلی کی چمک کی طرح آنکھوں میں ابراجاتی۔ ترے لوگ دایا لشکارا اتے ہاں نے ہلی ڈک لے۔ ڈرائیور ریکس لگا لگا کر یہ فرض ادا کرنا چاہا تھا۔

ہمیں کبھی والے نے امر تر اڑے پہ چلا تا رہا ہے جانہ ہری جانے والی بس کے ٹکٹ لے لئے، عطا خان فٹ سرگرم نہ رہا تھا سے معلوم تھا کہ بس میں سرگرم سوئے بھی نہ سکے گا۔ اس اڑے پر کچھ مختلف تھا۔ ہوائے اس منظر کے جو سکھوں کی دایا بیوں اور پکڑیوں نے باندھ رکھا تھا۔ عجیب لوگ ہیں یہ۔ کسی کی طرح شراب پیئے والے سرگرم نہیں پیتے۔ کیونکہ انہیں اس سے منع کر دیا گیا ہے ورنہ اور کئی ممنوع کام ان کے خاص کام ہیں۔ یوں بھی برے نشے سے نشہ نہ کرنا چاہیے۔ کچھ جتنی جتنی سے کچھ باتوں کی پابندی کرتے ہیں اتنی ہی نری سے بہت سے قانون توڑتے بھی ہیں۔ آج کل ہندوان سے بہت ناراض ہیں۔ ایک زمانہ تھاجب ہندوان سے بہت ارضی تھے۔ مسلمان ان سے تنگ تھے۔ پڑا سکھ برابر رکھتے ہیں جبہ رکھتے ہیں اب ان سے ترازو دیکھیں کیا گیا ہے اور وہ سبے صاحب ہوئے چارے ہیں ان کی عورتیں بھی

پاکستان کی ہُمر

ہنس میں قہر ہرنے کی جگہ نہ تھی مگر لوگ دھرم و دھرم لے رہے تھے۔ ہم نے بھی لے لئے۔ بس میں کڑی ساریوں کی تعداد دیکھتے ہوئے لوگوں سے تقریباً دو گنی تھی۔ موزن گھنٹہ گیارہ کلو میٹر پر ہی ہم کی کڑے رہے کیونکہ اس وقت کڑے رہنے کیلئے اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہم گرنا چاہتے ہی نہ ہو سکتے تھے بے ہوش ہو سکتے تھے اور قش کمار بھی گر نہ سکتے تھے۔ بس چل پڑی۔ شہرے باہر آئی اور آپ سے باہر ہو گئی اس کے اندر اندھیرا تھا بار بھی ہو رہا تھا۔ ہماری آنکھیں کھلی تھیں اور نظر کچھ نہیں آ رہا تھا پس ثابت ہوا کہ صرف اندر کی روشنی سے کام نہیں چلنا پھر بھی روشنی چاہئے۔ ویسے روشنی کیلئے کہیں نہ کہیں اندھیرا ضروری ہے بھی دیکھنے کیلئے آنکھیں بند بھی کر لینی چاہئیں۔

ہماری یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی کہ ہم تینوں کے درمیان فاصلہ نہ رہے۔ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے جبکہ ہم نہ کھٹکنے کی خواہش بھی نہ کی تھی اب ہمارے درمیان گوشت کی دیواریں تھیں ان دیواروں میں جو درد و آواز تھے بند ہو رہے تھے ظاہر ہے جب ہم چپ تھے بس بھی چپ ہو گئی۔ بہت شور کرنے والی چیز اچانک چپ ہو جائے تو بول آئے لگتا ہے۔ سکون بھی محسوس ہوتا ہے۔ ہم دوسرے لوگوں کیساتھ بس سے نچے اترے تو ہم نے ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیا جس ہم تھے وہاں کوئی آبادی نہ تھی مگر غیر آباد جگہ بھی نہ تھی۔ بھارت میں قریب قریب رساتوں نے خالی جگہ پر کی ہوئی ہے۔ شرقی پنجاب کی زرمی معاشرت نے یوں بھی رونق لگا رکھی ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ کڑے لوگ ہم سے بھی جلدی میں تھے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے کوئی نورت نہ تھی پوری بس میں شاید اس لئے بھی جلدی تھی سکھوں بلکہ سکھوں کو۔ ہم خاصہ پرہیز کوئی نہ رہی سمونڈ تھانڈیام کے وقت کے ستر میں کچھ فرقہ آفرینی کچھ نفسا نفسی کچھ قہر مٹا کی ہوئی ہے۔ ہم سے۔ تک نہ پوچھا کسی نے کہ تم پاکستان سے ہو شاید انہیں یہ قہاریات شروع کرنے کیلئے اس سے بڑا سوال اور نہ کوئی تھا۔ سیاست میں یہ سوال اتنی بار ہوا ہم سے کہ ہم ایک عجیب کرشماری سے لبالب بھر گئے سوال بابر بار پوچھا جائے اپنے اندر جواب کی صفات اختیار کر لیتا ہے

مجھے سب لوگوں کی خبر تھی کہ ہم پاکستان سے ہیں۔ پاکستانی ہونے کی مہر ہمارے چہروں اور کپڑوں پر لگی تھی مگر دستکھوں کے بغیر۔ ہمارا کچھ در تارہ ان سے الگ تھا۔ ہمارا در عمل بھی الگ رنگ تھا کچھ بھی ہم سے اس لئے الگ رہتے پر امنی ہونے اور ہمدردی ہونے۔ وہ اب تک غامض ہیں ہم

راضی رضا دونوں مصیبت میں ہیں۔ دونوں ملکوں کے محسوس کرنے والوں کا مقصد راتا مختلف نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہماری امید قبول نہ ہونے والی دعا کی رشتہ دار لگتی ہے ان کی امید بھلا دے گئے وعدے کی دوست بنی جلدی ہے۔ قائد اعظم نے کہا تھا سیکھو اوقات آئے گا کہ تم ہماری طرف دیکھو گے مگر تب نہظر کسی کے قابو میں نہ ہوں گے۔ یہ قائد اعظم کے الفاظ نہیں مگر کہتا وہی چاہتے تھے کئی لوگ تھے جن کی آنکھوں میں ہم سفری کی مشعل جل رہی تھی ہم اندھیرے میں تھے ہم اندھیرے میں ہیں۔ اسے روشنی اسے غیام اندھیرے میں ہیں اندھیرا بدھتا جا رہا تھا۔ اندھیرا بدھتا جا رہا ہے۔ اندھیرے کی فحوت ہے روشنی میں اور مگر ابھوتا ہے اندھیرے سے گھبراہٹ ہو تو یہ اور بدھتا ہے۔ ہم تینوں قریب قریب ہو کر کڑے ہو گئے ایک خاصا نوجوان سکھ بھی آکڑا ہوا اس نے ہم سے کوئی بات نہ کی۔ میرا خیال ہے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا ہم نے اسے رد کا تو نہ تھا۔ بعض اوقات آدمی بہت پی بات کہہ سکتا ہوتا ہے مگر کہتا نہیں شاید اس وقت اس نرم رُخ سکھ کی ایسی ہی کیفیت تھی ہم نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی کیوں نہ کی اس کا جواب نہیں ہمارے پاس۔ سکھ کے پاس بھی نہ ہو گا کیا اس کے ساتھ بات ضروری تھی۔ شاید وہ ہمیں کوئی راز کی بات بتاتا اور ہم اس وقت اس کے ساتھ بہت سے بات کر گزرتے جب کوئی کام نہیں ہو سکتا تو کیا ہنس بڑے خیال دل میں آتے ہیں ہم اس سکھ سے دوبارہ طے تو بات کریں مگر اس کی کیا صافتا ہے کہ ہم وہی بات کر سکیں یہ بات کا پناہ وقت اپنا علاقہ ہوتا ہے ایک بات کسی اور کیسے میں دو تاتھ اور معنی نہیں دکتی۔

ہمیں انبالہ کھنچے کی جلدی لگی ہوئی تھی اور یہ جلاب گئے سے کم تکلیف دو نہ تھی۔ ویرانے میں غراہنے کے خشکی امید ہی ہوتی ہے جب یہ خیال آتا تو بس چلنے پر بند ہو گئی۔ لوگ ایک دوسرے سے پہلے بس میں چلنے کے کرب کرنے لگے۔ لوگوں کو گھروں میں ہونے کی جلدی تھی۔ ان کی جلدی ہماری جلدی سے دور تھی لیکن کتنے والے کہہ سکتے ہیں کہ ہم سب جلدی میں ہیں۔ ہیں ہم سب جلدی میں۔ اس شے کا خیال کسے ہے جو دلوں میں سوچوں میں لگ الگ الگ سکھ رہی ہے۔ ایک ہی اندیشے کے بارے میں ہمارے وہم اور اور رکھوں کے ہوتے ہیں۔

شاعروں کی ملکہ

بہت خوش منظر گیر ملک - عورتیں مرد قریب از برابر - پارے
کاہر انگراند سحر خانہ سے اٹھ کر سیدھا آگیا تھا - یہ پوری طرح انجوائے کرنے والے لوگ تھے -
ریاں رائے بھاری ہو تو دو چار زبان کھٹکے میں اردو لکھتے - مگر نئے کیلئے موجود تھے - وہ واقعی اردو کو کہیں نہیں
سکتے جن دوچار ”خوش نصیبوں“ نے ہم سے آلوگراف لیا یہ بھی فرمائش کی کہ ذرا پڑھ کر شاعر بننے کی ایک
خاتون نے تو باقاعدہ ترنم سے شائے کی فرمائش کی - ہمیں اپنی ملک پر ناز آئی یہ عورت بھی غرض سیدہ لکھی تھی
مگر رخسار میدہ (شعلہ و شمع) اور ہونٹ چشیدہ (گرم و سرد) رکھتی تھی - بھارتیوں کی ملک ترنم بھی
پاکستان والی ہے اس بات پر میں خوش ہو گیا ہمارا خوش تھی آسمان آسان ہوتی ہے - ہم میں سے کئی ہیں
جو کہتے ہیں ملک الگ ملک نہ ہو مگر ملک الگ الگ ہونی چاہئے - آخر غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے -

ترنم ریاض کے شاعروں کی خاص روایت ہے - مشاعرہ کو کھٹکے کی شکل اختیار کر گیا ہے - کئی
بھارتی شعراء نے قوالی کے انداز میں شعر شائے ملک گائے ملک گوائے - سامعین کا دل خوش و خوش اور ذوق و
شوق ہر ملک ہو گیا تھا جس شاعر کو ترنم کرنا آئے اسے کم از کم ادائیگی کو ادائیگی بنانے کا فن آنا چاہئے -
انور مسعود کی بھابی غلیظ برت خوشی سے سنی گئیں خاص طور سے ”جہلم کے پل“ والی نظم -
پیر شہنشاہ پٹیل نے انبالہ کے انور کو خاص داد دی - آپ نے چھوٹی چھوٹی چیز پر بہت اچھی طرح تجزیہ واہ
داد - اب انور کو کچھ اس کا رویہ کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے - جسے پیکل ترنم پر بھی تو اس کے پیچھے ڈاکس
پر بیٹھ کر غصہ اڑی بال سے ملنے والی داد کو اپنی طرف بار بار اٹھاس کی حرکات اشعاروں کی زبان میں جاری رہیں -
عطاء الحق قاسمی کے ساتھ پیچچ اور بال کی طرف سے خاص سلوک سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے
بھی آچکا ہے - امریکہ سے آئے ہوئے پاکستانی شاعر احمد فرازی مقبولیت کے شعور میں بھی تھے - محبت
کے سارے جوانوں نے فراز کے گرد گھیر رکھا تھا - اس دوران اخبار والوں نے بھی گھیرنے کی کوشش کی
اخبار نویس اپنے مطلب کے آدمی کو پہچان لیتے ہیں - مشاعرے کے آخری شاعر کبھی اٹھتی تھے - ان کی
شہرت کا یقین ہو گیا کہ کسی شاعر سے اتنی تعداد میں اتنی کھٹی غلیظ سن کر یار نہ ہو نا معمول بات نہ تھی -
ان کی بیٹی شہانہ اٹھتی آچکل بھارتی فلموں کی معروف اور معروف اداکارہ ہے - ثابت ہو گیا ہے کہ کم
صورت عورت بڑے کام کی چیز ہوتی ہے - وہ بڑے غضب کی آراستہ ہے - اٹھتی اس کے تمام کیا تھا
ایچھا لگتا ہے - اٹھتی کوڑت ہوگی اٹھتی - شہنشاہ کوڑت کے پیکر سے نکل جاتی ہے - بھارت میں
شاعر و کاہل اداکارہ سے مختلف نہیں - ہم نے تنہا صدیقی کا ترنم شائے ملک دیکھا مگر ملک نیم پڑھنے نہیں تو

ہندیوں سر ہند

سر ہند شریف چاکر بس رک گئی - وہ رگتی ہی تب تھی جب خراب ہوئی تھی وہ نہ سواریاں اتارنے
کیلئے دور کئے کا صرف ارادہ ہی کرتی تھی - ہم بھر بھر سے دور جا کر کھڑے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ مجھے مجھ
القب جانی کے حزار کے قریب ہوں - اب یہ فاصلہ قبول کا تھا - آج مجھ صاحب کی قبر جتنی دور محسوس
ہوئی پاکستان میں محسوس نہ ہوتی تھی - پاکستان میں تو دور لگتی ہی نہیں قربت محسوس کرنے کا نام ہے پاس
لینا ہوا آدمی بھی حد نظر سے پار ہو سکتا ہے - اس سے بڑی بد نصیبی اور کیا ہو گی کہ ہم شہر مجدد میں تھے اور
انبالہ جانے کی جلدی میں تھے - میں نے ایک آدمی سے پوچھ کر مجھ صاحب کے حجازی طرف منہ کیا
آکھیں ہند کیس اور اپنی عقیدت نذر کر دی جو میری عدم امت سے مختلف نہ تھی - کیا شخص قتلہ و مہمرون نہ
بھگی جس کی جھانگیر کے آگے - آج جھانگیر رہے شائیں کوئی بھر بھی گرد میں چکی ہوئی ہیں - ہمیں اپنے پسوں
سے صرف عقیدت کی عادت ملی اور عقیدہ کا علم ملا - کردار کی قوت اور عمل کی لذت کھو گئی تھی -
ہمارے پاس دنیا گلوں سے زیادہ ہے مگر ہم کہتے غریب ہو رہے ہیں اس وقت ہم غریب الوطن بھی تھے -
ہم نے یہاں سے جیسی ملی اور انبالہ کی طرف چلے بس والوں کی کوشش تھی کہ ہم اگلے سال والے
شام ہمارا کل پاک - ہند مشاعرہ میں شرکت کر کے جائیں - جیسی والا ہمیں انبالہ کینٹ کے مشاعرہ گاہ میں
لے آیا - ہمیں پتہ نہیں چلا کہ یہ سفر کیسے کیا - مشاعرہ اپنے آغاز کا شہر تھا - ہم نے کبھی کوئی لوگ
ہمارے مختلف ہیں اگرچہ وہاں ہمیں جانتے والے نہ ہونے کے برابر تھے بلکہ نہ ہونے سے بھی کم تھے ہندی
واحد پیمانہ یہ تھی کہ ہم پاکستانی شاعر ہیں -

اس کی شائستگی نے میرا دل کر دیا۔ جب میں معلوم ہوا کہ شعر و نثر دو لکھتی ہے۔ منظور ملک زادہ اور بشیر کی توفیق جھوٹک ان کی شاعری کی طرح لذیذ تھی۔ افتخار امام صدیقی اور پروفسر یکن ناتھ آزاد سے پاکستان میں بھی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں طرف کے لکھنے پڑھنے والوں کے رابطے اگر غیر ضروری مشابہت کی حراست سے ہی انھیں قاسم کے نتائج موسم بہار کے ثمرات سے بھی بڑھ جائیں۔

میں ٹولبند

مشاعرے میں کئی زیور و کریمت موجود تھے۔ افسرانہ فہمے میں یہ پاکستانی زیور و کریمتوں سے مختلف تھیں۔ کریمتوں سے میرا مطلب کچھ اور تھیں۔ اردو زبان میں واحد سے ہی اس طرح ہوتا ہے۔ زیور و کریمت، جیٹکوں کریمت، چپو کریمت۔ ان سب کریمتوں میں ایک جہاں مال بھرا ہوا ہے۔ زیور و کریمت کے اوصاف اور لہرات بھارت پاکستان میں ایک جیسے ہیں۔ صدیق سالک نے اپنی کتاب "تادم تحریر" میں لکھا ہے۔

"زیور و کریمت ایک بھرا ہوا پتیل ہے جسے حکومت وقت جب چاہے اور جس طرح چاہے فائر کر سکتی ہے اور اگر وہ خود پستول کی آواز سے ذرتی ہو تو بھرا ہوا پتیل اگلی حکومت کے حوالے کر سکتی ہے۔ پتیل کے استعارے پر غور کرتے ہوئے مزید غور کیجئے کہ ایک زیور و کریمت کی ضرورت کبھی بھی ہوتی ہے" سالک کو پتہ ہے کہ اچھا فائر بھی ایک فوجی ہی کر سکتا ہے اور کوئی شخص و ردی کے بغیر فوجی کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ہمارے گاؤں میں ایک ان پڑھ آدمی نے زیور و کریمت کو "براکرسمی" بولا تھا۔ وہ زیور و کریمت بول نہ سکتا تھا۔ بول تو ہم بھی نہیں سکتے۔ سالک کو بولنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اجازت کے بغیر مزاجی کچھ اور ہے۔ جب سالک "تادم آخر" لکھے گا تو دیکھیں گے۔ مجھے والوں کیلئے اب بھی بڑی نشانیاں ہیں۔ نئے پڑھنے والے اس کی کتابیں اس زمانی ترتیب سے پڑھیں۔ کیشن صدیق سالک۔ میجر صدیق سالک۔ کرنل صدیق سالک۔ پریگیشہ صدیق سالک۔ اس کی اصل کتاب ہوگی جب وہ جنرل صدیق سالک بن کر لکھے گا۔ علم و ادب کی اردو دنیا میں عبدالحیہ سالک اور علم الدین سالک کے بعد یہ تیسرا سالک ہے

یہ سالک مقامات میں کھو گیا (اقبال)

اچھا لکھنے والا ہے صدیق سالک۔ اس نے "وٹمنس فورسٹرز" لکھ چکی۔ پتہ نہیں چلا کہ سرخوردگیوں ہوا۔ ایک فوجی افسر کا بیٹا ہی انھار ج فوجی افسر کے خلاف لکھتا کچھ اچھا نہیں۔ یہ بات میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں بھی نیازی ہوں۔ کاش میں نیازی نہ ہوتا۔ یا وہ نیازی نہ ہوتا۔ اس کے بارے میں میرے تاثرات اس کتاب میں بھی موجود ہیں۔ سالک پشاور ورنہ موت اور دیانت سے شاید واقف تھیں۔

اس کی کتاب سے قوم کا مورال بڑھا ہے نہ اصل بات سے پردہ اٹھا ہے۔ آفرخورد سالک سرخوردے کتا دور تھا۔ جبکہ وہ جنرل نیازی کے قریب ترین افسروں میں سے تھا۔ جس طرح آجکل جنرل قیاس کے ہر وقت ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب سالک سے گھسوائی گئی ہے۔ ورنہ وہ ابتدائی طور پر

دلوں تک لیے ہو گئے ہیں۔

دن جب زوال کی طرف ہوتا ہے تو سائے لیے ہوتے ہی ہیں۔ دو قوں حکومتیں ڈار کے مارے ڈیلو می
کے سورج کو ڈوبنے ہی نہیں دیتیں۔ اس کا نیا دن آ ہی نہیں رہا چالیس سال سے۔ فاصلے تو آدمیوں
کے اندر ہوتے ہیں۔ زمین نے تو ہمارا دست نہیں روکنا۔ اتنی دیر میں تو ہم پاکستان کے کئی شہروں میں نہیں
پہنچ پاتے، بھارت کے کئی شہروں سے گزر کر ابھی گئے تھے۔

ادیب ہے۔ انڈیہ کے کچھ مدت بعد وہ "ڈمنٹری بلڈر" نے لکھ مارے۔ پھر بھی کیا یہ چلے گا کہ
بڈھڑ کیے ہوں۔ سالک ہو کہ وہ دیکھتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی من کر لکھتا ہے۔ ایسے میں اس کی حیثیت
دعوت مخالف گواہ کی بنی ہے۔

اس کے برعکس ایک سول افسر ڈاکٹر حفصہ محمود نے سیاسی سطح پر سوچ بچار کے بعد "پاکستان کیوں
ٹوٹا؟" اور طارق محمود نے تخلیقی سطح پر محسوس کر کے "اللہ تیکہ" لکھا۔

ذی سی انبالہ دوشی دال پاکستان کے کچھ ذی سی اوں کی طرح باذوق آدمی ہے۔ اس کے اندر ادب
دوست ہونے کی جھلک کم روشنی میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ادیب اردو نے 'اردو سے محبت رکھتے
ہے' جملہ والے ادا و ہدائی کی کما حقہ اس کی دوستی ہے۔ بے تکلفی ہے۔ دوبار بارہ دہائی سے ہجرات کے
استاد امام دین مرحوم کی شاعری کی فرمائش کرتا تھا۔

میر سے گئے میں درد جگر امام دین

یہ مصرعہ کسی سیاست دان کے بارے میں کہا تھا امام دین نے۔ کہتے ہیں یہ مصرعہ امام دین کا نہیں ہے
بھی اس کا کریڈٹ ہے کہ لوگ جس بات کو اداں کرنے کی ہمت نہیں رکھتے اس کے نام کر دیتے ہیں۔
استاد امام دین اردو کا سب سے بڑا اور اور جتنی مزاح نگار شاعر ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے طور پر خود
مزاحیہ شاعری نہیں کی مزاح ان کی شاعری میں پڑھنے سننے والوں کو محسوس ہوا۔ نصیب ہوا۔ مزاحیہ فن
پارے کی سب سے بڑی خصوصیت ہی کہ ہے۔ شعوری طور پر مزاح ہر حال مصنوعی ہے۔ ضمیر جعفری کی
بات مختلف ہے۔ امام دین اس میدان میں بہت بڑا شاعر ہے۔ اس کی شاعری خالص بیوقوفی کی پہلی ترین
مثال ہے۔ شاید وہ بیوقوفی کے معنی بھی نہیں جانتا تھا۔ اردو زبان میں پنجابی زبان کی بے تکلفانہ
ملاوٹ کے علاوہ اردو خیالات میں پنجابی خیالات کی بے ساختہ آمیزش میں امام دین کمال رکھتا تھا۔ اس
کے بعد بھی کچھ ابھی کو ششیں ہوئیں استاد اس لئے زیادہ کامیاب ہوا کہ اس نے اس ضمن میں کوئی کوشش
نہیں کی۔ استاد کی شخصیت اور شاعری سادہ لوحی اور بچہ گن کا استخراج نہ کی۔ اس کی شاعری میں عمرانی
اور خوج بھی ہے جو پڑھنے سننے والوں کے اندر تجلیہ جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی یاد میں ایک مزاحیہ
کانفرنس ہوئی چاہئے۔ حیدر آباد (بھارتی اور پاکستانی) میں۔

"راجنندر دھرترا کا ذکر ایک اچھے کام کی طرح کرنا چاہئے" یہ "کار خیر" کا ترجمہ ہے۔

موترا جی کی اردو ڈاکٹر دور ہے۔ اس کی کوششوں سے یہ بڑا مشاعرہ ہوتا ہے۔ تقریباً ہر سال اس نے
اس کا چکر بھی لگتے جاتے پاکستان میں ہر سال اس طرح قائم بھی ہو جاتا ہے کچھ اس کو ہر سال۔
پاکستانی شاعروں اور بھارتی سیاست دانوں کو بھی ہر سال۔ ہر فقرے بلکہ مصرعے میں ہر سال "ضرورت
شعری" بلکہ ضرورت آ پائے۔ یہ وہ کام ہے جو حکومتوں اور بھارتی حکومت سے اپنی آسانی سے نہ ہوتا۔
موترا جی کی حکومت ہوتی ہے ان دونوں میں۔ خیال ہے کہ اس طرح وہ فاصلے کم ہوں گے جو لوگوں سے

زادہ کم طرف سے مجھے کاڑھا

اور کافی سمجھتے ہیں مسلمان ہوں میں

آزاد صاحب کو جو عزت ملی ہے اپنے باپ اور علاقہ اقبال کے ساتھ محبت کی وجہ سے ملی ہے۔ یہ دونوں سمجھتے ہیں پاکستان سے جوڑی ہیں۔ پاکستان میں آزاد صاحب کی بہت دعوئیں ہوتیں۔ دوستوں نے ایک ہندو مسلمان کی خاطر واری کیلئے دلائل بنایاں پکائیں۔ گوشت سے اجڑا کیا آزاد صاحب پاکستان میں صرف بنیائیں اور دلائل کھانکھا کے شاید چڑھ گئے کہ "بارہم نے صرف یہی کچھ کھانا تھا تو پھر پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی۔" انہیں یہ اعزاز بھی ملا کہ پاکستان میں اقبال کے صد سالہ جشن ولادت پر عالمی شہرت کے دانشوروں کی قیادت انہی کے سپرد کی گئی۔ چینی بات ہے کہ اقبال اور اردو نے پاکستان کے علاوہ بھارت کے بہت لوگوں کو عقلیت اور شہرت سے سرفراز کیا ہے صاحب اقبال ہونا اب انہی معنوں میں استعمال ہوا کرے گا۔ البتہ باور اقبال ہونا ایک پیشہ ورانہ عمل بن گیا ہے جس طرح لوگ باہر معاشرت ہوتے ہیں یا باہر اعراض ختم ہوتے ہیں۔ اقبال بھی اس دور میں ہونا تو باور اقبال ہونے کو ترجیح دیتا۔

پروفیسر آزاد نے صدر پاکستان محمد ضیاء الحق کی تعریف کرتے ہوئے کہا میرے لئے ایک خوش رنگ ست کا باعث تھا جب ایک سربراہ مملکت پروفٹو کیل کے سارے ضابطے توڑ کر مجھے اپنے گھر سے باہر نکال پھرنے کیلئے آگیا۔ دلی میں غیر جانبدار سربراہ کا نفرین میں شرکت کے بعد بہت سے لوگ آزاد صاحب سے حلقہ ہو گئے۔ اتنا خاکہ قسم کاؤ کیلئے کر ہی ہوا ہے دنیا میں۔ سیاستدان اس جرنل بھی خوش اخلاقی کی نقل بھی نہیں کر سکتے۔ بس بھارت کے دو چار دولوں کی کراہ ہے۔ دو چار بار صدر ضیاء بھارت آئے تھے یا گئے آئے تو ہیں۔ اجمال میں ایک سال کے اندر کم از کم دو مشاعرے تو ہونے کیلئے شام خولیں ٹرسٹ کے زیر اہتمام مشاعرہ اور کڑا کے دار ہو گا۔ اللہ کے فضل و کرم سے اس کا بھی انچارج ملے گا۔ ملے گا صدر ضیاء سے بغض گیر ہونے کی سعادت مل جائیگی۔

مرحوم ہندو شاعر

راست دیر تک جاگے ہوئے ہم دن چڑھے تک سوئے رہے۔ شاید اس دن شہر میں پھٹی تھی۔ دور دور تک بیداری کے آواز نہ تھے۔ چھٹی گاؤں ہر کہیں ایک ساہوکار ہے۔ روٹھے ہوئے بچے کی طرح بے نیاز اور پیارا۔ ہمارے کمرے کے باہر تھی ہوئی دھوپ اور سستا ہوئے سطروں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ ایک گھری تھی جو ڈری ہوئی نہ تھی اور اکیلے درختوں کے درمیان گچی پھر رہی تھی۔ ہمیں بھی کوئی خاص کام نہ تھا مگر پردہ میں یہ کیفیت ایسی تھی جیسے بہت سے کام ہوں۔ ہمیں اس وقت آہانک پتہ چلا کہ ساتھ والے کمرے میں پروفیسر یجن ناتھ آزاد غم سے ہوتے ہیں۔ پروفیسر آزاد میرے تو "کرانیں" ہیں نبھانے یہ کرانیں "ارائیں" کام کا قافلہ کیں ہے۔ پروفیسر آزاد کو والد ملکوت چند محرم کی جو عزت میانوالی میں تھی بڑے بڑے خانوں کو کیا حاصل ہوگی۔ دریائے سندھ کے آس پاس ہواؤں کو ان کے اشعار اب تک یاد ہیں۔ میں نے میانوالی کے شعری انتخاب "جل قفل" کا آغاز محرم صاحب سے کیا ہے۔ انہیں پڑھتے ہوئے میرا پیشہ چاہا کہ انہیں "مرحوم" نکھوں۔ ان کے اشعار میں قرآنی آیات کے سائے اور صفات الہ کے انداز کثرت اور صداقت سے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں رحمت کی آرزوئیں بڑے خلوص کے ساتھ لفظوں کے درمخفکتن ہیں بی محرم صاحب کی بیٹی اور آزاد صاحب کی بہن کی قبر آن بھی ان کے گاؤں میں موجود ہے۔ حالانکہ ہندوؤں کے مُردوں کی راکھ دریائے سندھ میں برسوں سہی رہی۔ سندھ کو محرم صاحب نے جتنا سچی زیادہ عقیدت کے ساتھ یاد کیا ہے۔ یجن ناتھ آزاد جب میانوالی آئے تو میں ان کے ساتھ ان کے آبائی شہر میں ٹیڈ کیل گیا۔ وہاں ان کا استقبال سربراہ مملکت سے کم نہیں ہوا۔ یعنی ٹیڈ کے خاٹن اس ہندو زادے کو سپانٹہ پیش کر رہے تھے۔ وہاں کچھ لوگوں کو اس دن پتہ چلا کہ یجن صاحب ایک استاد ملکوت چند کے بیٹے ہیں اور وہ ٹیڈ بڑا آدمی تھا۔ استاد اور ہندو بھی بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کو چھوٹے آدمی کیا سمجھتے ہیں۔

اہل دین تھے کاڑھتے ہیں اے محرم

بہت سے کہتے ہیں یہ کئی مسلمان ہے

بیٹے کا شعر بھی کم نہیں۔

دیو کی یاد دہنی میرے لئے کافی نہ تھی

میں محرم کا دور بھی دل میں جھلا رہا بہت

علاوہ اقبال کا سند بھی کچھ ایسی تھا شاید۔

بے چارہ آئینی بادشاہ

کیونان چھکان تھا کہ قسم کی سبزیاں کئی انداز کی والیں کئی بار ایک چھوٹی سی پلیٹ میں ڈال کر ہمارے آگے رکھی گئیں۔ ہم نے بیٹھ میں ڈال لیں۔ اس ”پریسٹ“ کے بعد ہم طموت تراچی کے کھرو کو آئے تو ایک شیر نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم جنگل کے شاد بلکہ شاد صاحب کو گھر کی پوچھکاری کر رہے تھے کہ خوش ہوئے عمر اس شاد میں دو ہونک پڑا اور ہم چونک پڑے کہ یہ تو کتا ہے۔ شیر کے بھیس میں گلدے کے بارے میں شاد قاب شیر کے بھیس میں کتے کو بھی دیکھ لیا۔ بے چارہ آجی بادشاہ۔ اب بادشاہ صرف دیکھنے کی چیز ہو گئے ہیں۔ بادشاہ نظر آتے ہیں ہوتے نہیں۔ شیر گھٹتے ہیں ہوتے نہیں۔

ذرا تنگ دہلے سے غلّی کر کے میں پڑوین سیدنا عظیم اکرام الحق (جو بھی عظیم سہل حق بھی کہو
اب بھی ہے) اور ملک دہلی دہلی نہیں رہی جسے اب دہلی نہیں ہے۔ عظیم ہوتا تو ان علاقہ میں باقاعدہ خود کو ہوتا
کے گھر کا لفظ مالک تائے جاری تھی۔ یہ مالک کا لفظ تو ہم نے امتیاز استعمال کیا ہے۔ ورنہ جو لفظ اس
نے نامہ میں بھی کہہ دوں تو دووں کہ گروں ملک دونوں ملکوں کے تعلقات بہت ہی اچھے یا بہت ہی خراب ہو
سکتے ہیں۔ ابھی ہم یہ دونوں دسک افروز نہیں کر سکتے۔ امیر خاں کوچہ نہ کچھ رسک لینے کے موڈ میں لگا تھا۔
بھارتی شاعر ملک نسیم اور انور مسعود کشنکو کرے ہوئے گھر سے اور شفاف پانیوں کے کنارے بیٹھے
ہوئے لگ رہے تھے جن کی تہ میں پڑی سنگتراہیں بھی نظر آتی تھیں تو مٹی کیجئے نہ نظر آتیں گے۔ سنگتراہیں
معصوم آرزو میں ڈوبی ہوئی ہوتی لفظوں کا مونی بن جاتی ہے۔ چھوٹی آنکھوں والوں کا مونی بھی سنگتراہیں نظر
پڑتے ہیں سنگتراہیں بھی تو خلی اور غلیظ۔ عجائے نہیں کہ اپنے نام کیساتھ ملک کیوں لگا کر لکھا ہے۔ قصہ وہ عظیم
ہی کرتی ہے کہیں یہ قوم جاتیں ملک کا خوف تائید تو نہیں پھر جیجی یا جیجی کیوں نہیں۔ جیجی چلی اے
مریباں دی سیر یوں۔ پھر میرے نیاز کے بہتوں شاعر بادشاہ سے بڑھ کر کچھ ہوتا ہے تو اصل نیاز کے بغیر
شاعر بھی ملک ہو سکتی ہے بلکہ ہوتی ہے۔ یار لوگوں کو بے خبر خوش خوش لڑکی شہزادی دیکھتی ہے۔ ساقی
اور چپ۔ چپتی۔ اپنے جیسے شہر میں ملک کی عظیم کے عظیم ہم نے انور مسعود کے دل میں ایک
بادشاہ رافت کر لیا تھا۔ عجائے اس بادشاہ سے جیسے میں کوٹنا جانو چھپا ہوا ہے۔

پیکر جمہور

کسب بھی علماء اہل حق و اچھ اسلام اچھ آئندے ہوں تو مکمل تقصیروں کی پہلوازی بن جاتی ہے۔
 عازر و حدیث میں ایسے لوگ قیمت ہیں بلکہ مال قیمت ہیں جسے حاصل کرنے کیلئے جنگ کی ضرورت
 نہیں۔ پر اس چروں کی محفل چاہئے۔ بھارت میں اپنے قیام کے دوران عطائے امجد کو بہت مس کیا ہم
 بنے اسے مسکرایا (مسز اس مس کی جمع ہے) احمد فراز نے اس کی کو کم کرنے کی کوشش کی اس نے
 اسی حیرت جڑیلے اور حیرت دہانہ لطفے میں طرف چھپتے ایک جاب و خود تھا مگر انور مسعود نے پاروں شانوں
 چٹ کر دیے۔ وہ اس کے سینے پر چڑھ کر پھانسی پھانسی فرزا کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔ وہ نہیں نہیں کر نہ حال ہو ہوا
 تو اسے آسانی سے الٹا بھی جاسکتا تھا اس نے اپنی اعتراض نہ ہوتا اس وقت وہ تو فرار آج بارش
 نظر آیا۔ فراز کیا نہ تھا جن میں بھی ہوئے۔ اس نے بھارت میں کولف ہی نہیں کرائی کسی کی خواہش ضرور
 تھی کہ اس کے ساتھ کچھ پروگرام ملیدہ بھی ہو اسی اور وہ ہونے بھی وہاں اس نے کیا کیا کیا نہیں کیا اس کے
 ساتھ کیا ہوا کیا نہیں ہوا۔ ہمیں اس بارے میں فکر مند ہی ضرور ہے۔ علم بھی تو نہیں میں یہ حال فراز نے
 مارے ساتھ بڑی کر جوش کا مظاہرہ کیا۔ مشاعرہ کرنے اور مظاہرہ کرنے کی اس کی اپنی اداسی۔ اس ادا
 نے اسے بہت فائدہ دے دینے ہیں اور نقصان بھی۔ نقصان بہت کم۔ ایسے نقصان ایک خاص شیخ ہے جاکر
 فائدہ سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ آخر اس کا ہم عمر شرم پیمہ ہے اور ہم جی اسی کیوں کیجئے ہو گیا۔
 بھارت کے کفر بیخنی ترقی پسند اور جمہوریت پسند تھے والوں میں سے کسی نے صوبہ جاب کو بھی
 دیا نہیں کیا حالانکہ بات اگر سچائی اور مبادی سے انکار کی ہے تو جاب سے بڑھ کر کون ہو گا پاکستان میں
 بھی تھا۔ فی انہوں جیسے اس گروپ کا گروہ یہ مختلف نہیں اس کے باوجود ہر کہیں ایسے ہی لکھنے والوں کی
 گردنک کا کام ہے۔ اقتدار والوں سے ان کے مراسم بہت آگے کے ہوتے ہیں اور یہ انقلابی کھلانے
 میں بھی کیجئے نہیں رہتے۔ بھارت میں بھی تقریباً سارے انقلابی ادیب و شاعر حکومت کے وفادار ہیں جو
 پاکستان کے خلاف ہیں ان کی وفاداری کسی شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ مثال کے طور پر علی سرور یا جعفری
 بھارت میں پاکستان کے مستقل ممان شاعروں سے یہ پہنچا جاتا ہوں کہ جس قوم کو ہمارے سچے کہیں
 ہو۔ مجھے فراز جیسے کی یادگ کر کے والے شخص سے یہ توقع ہے کہ وہ بھارت دہر تک نہیں رہے گا بڑا وہ
 دہر رہا نہیں وہ کہیں۔

اگر ہم جمہوری اقدار پر ایمان رکھتے ہیں تو چہ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ ایک آدمی کو کسی کی مخالفت کرنے کا حق ہے تو دوسرے کو اس کی حمایت کرنے کا حق نہیں۔ ہر صغیر یا بڑا ہندو اور عیسوی دنیا کے

میں اور پھر مشعر عربہ والی اعلیٰ نسل کی محفلوں میں کھانے کے بعد مشاعرے سے ہاتھ کی گولیاں جیسا کام لیا جاتا ہے یہاں کوئی غریب آدمی نہ تھا کبھی کوئی بھارتی مسلمان نہ تھا کوئی نیکو بھی نہ تھا مادانک ان علاقوں میں بڑا بڑا امیر سکھ پڑا ہے۔ تقریب کے دوران دوسرا داران آئے جو غائبانہ دیکھنے آئے تھے کہ ان کی تلوار کا استعمال کچھ زمینیں ہو رہی تھیں ان کے مطابق غلاموں میں ہو رہا۔ یہ دینی فوجی امداد کی شرائط بھی ہوتی ہیں۔ سنا ہے پہلے پاک امریکہ فوجی امداد کے معاہدے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ بھارت سے جنگ نہ کی جائے جس کی طرف سے مصر کو امداد ملی اس میں بھی وہ مصر کو امداد کے اسرائیل کے خلاف استعمال نہ ہو پھر بھی پاک بھارت اور مصر اسرائیل جتنیں جو ہیں تو جنگ کس کی ہے پھر جو بھارتو جانتا ہیں۔

اس وقت فراز میان سے باہر قذافی سی دوشی وال نے بنگلی تلوار اپنے ہاتھ میں رکھی اور اختتامیہ والے انظر و نسق قائم کر رہے تھے۔ فراز نے قرآن بھی سنائی۔ داد عطا کو سب سے زیادہ ملی۔ پرتو روہینہ نے ان کی محبت والے دو بے سار کھٹل کو لٹکا دیا وہاں ان شہروں کا بڑا دھڑا آیا۔ سامعین بھی بہت ہوش میں آئے۔ مگر پھر پھر ہضم نہ ہو سکا صاحب نے ان کو باقاعدہ چورن کھا دیا تھا۔ سامعین میں سے کچھ ملہ رہندہ زیادہ سی ذوق لگے۔ حیران حیران بیٹھے رہے۔ کوئی "اچھا" شعر یاد آیا تو کھٹکلا کر نہیں دیا۔ تقریب سے پہلے اور بعد میں گپ شپ دوشی وال صاحب سے رہی۔ اپنے شعلی کے حدود سے باہر کے لوگوں سے گپ شپ یہ لوگ کر رہے تھے ہیں سرحد پار والوں سے خوش گیمیاں بھی تھیک ہیں۔ اس کا ایک کام اچھا لگا اس نے شہر میں غریب بچوں کی تفریح کیلئے ایک پارک سازنا دیا ہے۔ بال بھون نام رکھا ہے۔ بچوں کا کھل۔ غریب بچوں کو تو عام پارکوں میں بھی کوئی تھینے نہیں دیتا حسرت و غربت کا غبار اپنی آنکھوں میں مگر کر دوسرے بچوں کو تھینے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔

باز بچے اطفال ہے دیا میرے آگے

ہوئے شب دور و قشا میرے آگے

اس شعر کو ان بچوں سے بڑھ کر کون سمجھتا ہے بھارت میں غریب لوگ بہت ہیں ان کے بچے بھی ہیں اور ان سے بھی غریب ہیں۔ پچہ غریب اور امیری کے چکر سے بے نیاز ہو جاتا ہے جب وہ بھی غریبی کے احساس سے "مالا مال" ہو جائے تو یہ انتہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھ گندنی ٹالی میں سے چاول کے دانے بکارتی کو شش کر رہا تھا مگر ایک ایک دان کھاتے ہوئے اسے کوئی وقت نہیں ہو رہی تھی میں سوئے لگا کہ انکلی اس سب سے بڑی مصروفیت میں یہ پچہ بڑا بڑو کر کرانچہ کا گندھی کے بیٹے کے مقابلے میں انتخاب لڑنے لگا۔

ممالک میں جس آدمی کے لیڈر بننا ہو حکومت وقت کے خلاف غم و گدگد ہے۔ یہ مشہور اور مقبول ہونے کا سب سے آسان نسخہ ہے۔ ہمارے ملکوں میں اس لحاظ سے دو طبقے ہیں ایک حکومت کی حمایت کرتا ہے۔ کرتا چلا آتا ہے۔ حکومت کوئی بھی ہو اس کی حمایت جاری رہتی ہے۔ دوسرا طبقہ صرف مخالفت کرتا ہے۔ یہ مخالفت ہر صورت میں قائم رہتی ہے۔ فائدہ یہ طبقہ زیادہ ہی اٹھاتا ہے۔ ایک آدمی نے اپنی دکان (سیاہ دکان) کے ساتھ میرے پورے دکاندار کھاتا۔ موجودہ حکومت نے دھوکا دیا کہ اس آدمی کی حمایت سے پوچھا گیا کہ یہ تم ہمارے پارٹی کیوں بدل لیتے ہو میں نے کہا میں کب پارٹی بدلتا ہوں۔ حکومت کی پارٹی بدل جاتی ہے۔ دوسری طرف وہ آدمی ہے کہ حکومت اپنی پارٹی باز اور سی کی ہو (ہمارے ہاں سب سے بڑی پارٹی باز اور سی ہے) تو بھی حزب اختلاف کے پیروں پر بیٹھیں گے بلکہ کمرے رہیں گے تاکہ تقریر کر سکیں اور نعرے بازی کر سکیں۔ اسٹیبل میں پتیکرے چارے کو سطحاً اصطلاحاً پتیکرے کہتے ہیں۔ قائد حزب اختلاف تو لاؤ پتیکرے ہوتا ہے۔ البتہ کسی حکومت کی حمایت کرنا نسبتاً دشوار کام ہے جس طرح ہر آدمی بلا واسطہ سمجھے اس کو خوشامدنی مفاد پرست "کاسہ" لیس اور چٹو کر دے گا۔ اگر کوئی اپنے مطلب کیلئے یہ کر رہا ہے تو وہ واقعی قابلِ مذمت ہے یہ تمہاری طرف سے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے ورنہ جمہوری حکومت میں مخالفت کرنے والوں کے وارے تیار ہیں۔ سچ آدمیوں کیلئے دونوں طرح مصیبت ہے۔ حمایت میں بھی اور مخالفت میں بھی پیش ور مخالفت میں آدمی خواہ خواہ ہیرو بن جاتا ہے۔ احمد فراز تو خیر پاکستان سے ہی ہیرو بن کر گیا ہے۔ فہمیدہ ریاض بھارت جا کر ہیرو بن گئی ہے۔ میر وین ایک بہت بڑے نئے کام نام بھی ہے مگر آج کل فہمیدہ کی حالت ایچسٹر، ایچسٹر سوس سے بھی گلی گزری ہے۔ اس پر مستحضر لکھنے کا حال طاری ہے۔

تم مشورتی کے گھر قلم دیکھنے بیٹھے تھے۔ ان کا بیٹا سیدیش ہوا دوشی پوتاں پر دیکھا اور نمر تباری باری اپنے ونی سی آر کو سمجھتا سمجھتا تھک گئے اور کو بھی تھک گئے تو گے ایک دوسرے سے باتیں کر کے "نمر تبار" پر دیکھا وہ اپنے ناموں کی طرح باری ہیں یہ سب باتیں کر کے کی شش کر کے لگیں وہ ابھی بھلی اردو بولی تھیں مگر ماتی نہ تھیں کہ ہمیں اردو آتی ہے بھارت میں بچوں کے علاوہ بڑوں کا بھی اردو دیکھنا سہلہ ہو گیا ہے۔

اتنے میں کچھ بالدار محبت مند سکھ صاحبان آگئے اور فراز کو کھیلے گئے وہاں سے وہ سیدہ حاضرات والے مکان میں پہنچا اس کے ہاتھ میں تلوار تھی جو ایک سکھ نے ایک پھان کو تختہ میں دی تھی یوں بھی فراز کیلئے تلوار کو تختہ ایسا ہے جیسے کسی غریب کیلئے ہاتھی کا ٹانگہ اگر اس نے تلوار سے بھی دی کام لینا ہے وہ قلم سے لے رہا ہے تو یہ سکھوں نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ تلوار یا قلم جو بھی انہماک دھند چلایا جائے نتیجہ ایک سا رہتا ہے "آخر خوشحال خان کے دیس کا کچھ لاؤ لاؤ مشاعرے مصلحتوں کے شہر میں کیوں پناہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اس سے پہلے کہ پردیس میں کوئی افسوسناک یا قابلِ اعتراض بات ہو جاتی کھانا شروع ہو

شہلار اور شراب

ہندو پاک میں اب اہل ذوق اور اہل درد کے ساتھ تعلق (جائز) ایک فیشن بن رہا ہے زور فیشن پر نہیں جائز ہے۔ ناجائز کام فیشن بن جائے تو ناجائز کب رہتا ہے اب عورتیں کثرت سے کرکٹ دیکھتی ہیں اور مشاعرے سنتی ہیں وہ حسین بننے کی سرگز کو ششوں کیساتھ ساتھ ذہن بننے کی ترکیبیں بھی آزماتی رہتی ہیں یعنی حسن اور حسن بننا بھی۔ آؤ گراف لیتا دو گراف و گراف دیاب کوئی خاص فیشن نہیں رہا۔

ابھی میں نے جس فیاض کا ذکر کیا یہ مشاعرے کا دنیا پر بھی کئی بڑی کتابیں صرف دیباچے کی وجہ سے مشہور ہوئیں ایک خوش رنگ گیت نوید میں زیادہ نظر آنے والی عورتیں موجود تھیں۔ ان عورتوں نے لڑکیاں بننے کی ناکام کوششیں کی ہوئی تھیں۔ البتہ لڑکیاں کامیاب نظر آ رہی تھیں۔ یہاں کچھ لڑکیاں شہلار میں بھی تھیں اور یہاں مردوں عورتوں میں شہلار کا رواج ختم ہو گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ پاکستانیوں کا لباس ہے ہم جہاں بھی ہوتے ایک پاکستان وجود میں آ جاتا ہے یہ نظر آنے والی ہماری واحد انفرادیت تھی۔ کچھ گھروں میں لڑکیوں کو شہلاروں میں دیکھا شاید شادی سے پہلے پچیاں ہی لباس بنتی ہیں۔

سازشی میں ہلبوس عورتیں بھی اچھی لگیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں تعجب بھی نہیں (بھارت کیلئے کوئی بات کہتے ہوئے ہم خود کو بریٹش میں محسوس کرتے ہیں) کہ بھارت میں کم عورتیں نظری انگریز عورتیں جنہیں خوبصورت کہا جاسکتا ہے۔ چروں پر سادگی اور آسانی کی بھولی برسی بہر بھی نہ تھی اجڑی ہوئی خشکیں سازشی کی گرفت سے نکلے ہوئے بے ڈھنگے ہائے جیسے ہر عورت بری طرح حاملہ ہو۔ بھارت میں پردہ سسٹم نہ تھا کہ ہم سوچتے۔

دوا لنگ باندھ کے رکھا ہے جمال اچھا ہے

وہاں ہر طرح کا مال کھلا پھرتا ہے۔ مشرقی پنجاب میں پھر بھی خیر ہے۔ کشمیر میں اور راجپوتوں والی ریاستوں میں اور غائب ہے پور میں بھی۔ ممبئی میں ماڈرن اداؤں نے کچھ دل کشی بنائی ہوئی ہے۔ سب سے سٹول اہل کا ایک چارم ہے مگر ساس تو عورتیں تھیں انہیں بھی ہوری ہیں۔

آج کی محفل میں محفلوں کے سارے رنگ تھے۔ شراب کی بوتلیں کھل رہی تھیں اور مجھے پنجابی زبان کی یاد آ رہی تھی

تینوں چین گے نصیبیاں والے

نی نشے دی بندو سے

نئے ہی ایک بندو بول کے سامنے ایک "عالمی شہرت کے شاعر" نے کئی بول شراب کی کرکھلے کی کوشش کی مگر تباہے زرد میں ہلبوس اس لڑکی نے بہت ہوشمندی اور ہشیاری سے پورے ماحول کو آؤٹ ہونے سے بچایا۔

"بندو"

"بندو"

"بات نہیں"

"مئی کئے"

"اس کمرے میں"

"آپ میں کئے میں مصروف ہوں"

"اچھا زور ادا کر آئے"

"شاعر صاحب! آپ نے کھانا کھایا" لڑکی نے اپنے لیے میز پر غصے کو بڑپ کر لیا تھا۔ لڑکی کو شاید معلوم تھا کہ شاعر اور شاعر صاحب میں فرق ہوتا ہے۔ شاعر صاحب کے بولنے سے پہلے پھر اس نے کہا "آپ نے سوت و ش میں کھائی ہوئی"

"جیرا اور آؤ افسانے بیٹھا کھلاؤ" اس کی آواز میں گڑواہٹ سی تھی۔

دو چہرے کے ساتھ نہ گیا اور اس نے کڑی بیڑی مناسب سمجھی۔ علان بالشل شراب اگر حرام ہوئی تو اس کی ذمہ داری ایسے ہی لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو پینے کے بعد جیسے کا سلیقہ بھلا جیتے ہیں بلکہ بھلا جیتے ہیں۔ وہ اس سے قسطوں میں کیوں صحیح کیا جاتا۔ اگر پہلی تہیہ پر لوگ صاحب طرف ہونے کا ثبوت دیتے تو شاید کئی بے سواد لوگ نہ چٹا چھوڑتے ہیں نہ مینا اختیار کرتے ہیں۔ دونوں عادتوں کو بٹا بٹا کر خرامیگے رہتے ہیں۔ انجیل بھارت چاکر تھیں باقی تمام لوگ شاعر ادیب گلوکار فنکار شراب پیتے ہیں اور بدست بھی ہوتے ہیں بدست پینے کا کھانا۔ ہمارے ایک گلوکار دوست کی ایک نشانی ان کے ایک مداح ہندو کے گھر میں ڈیکوریشن میں سے طور پر پڑی ہے۔ ایک بوسے آدھنی یاد گار ہے۔ کسی دن لاٹھوں کی کئی۔ فیض احمد فیض پینے نہ تھکتے تھے وہ تو پاکستان میں بھی نہیں تھکتے تھے۔ فیض صاحب کبھی آؤٹ نہ ہوئے۔ مجھے عرف کے آدمی تھے۔ لوگ ہیں کہ جب تک آؤٹ نہ ہوں افسانے پینے کا سزا میں آتا۔ مزاحیہ ٹھیک ہے مگر افسانے پینے میں چھتہ پانے سنا انداز میں آؤٹ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی آؤٹ کبھی دن آؤٹ (رن سے مراد عورت بھی ہے) انٹرویو نہیں اڑا دیتے ہیں۔ بھارت میں انجیل شراب اور شرابوں پر کوئی پابندی نہیں۔ شرابوں کو لوگوں کے گھروں میں جانے پانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ چلنے قریب لوگوں کا کاش ہے۔ ذہنیاتی کی وزارت کے دور ان ایک مزید بات یہ بھی ہوئی تھی کہ شراب پینے میں وہ دن کیلئے منوں تھی جس طرح پاکستان میں گوشت کا دو دن کیلئے بنا ہوتا ہے۔ یا لوگ گوشت سے وہی کام لینے کی کوشش کرتے ہیں

جو شراب سے لیا جاتا ہے۔

ایک اچھے بھلے لیڈر قسم کے مسلمان صاحب نے "گنگو کے دوران گمناپ کے حکیم الامت شام مشرق علامہ اقبال پیتے رہے ہیں آپ کے کچھ دانشور ان کو ملی گئے ہیں فقرے کے خاتمے پر زور سے "کیوں" کہا آخر کریں اس کا انداز لیا تھا جیسے میں اور علامہ مل کر پیتے رہے ہوں بلکہ میں انہیں پلاتا رہا ہوں وہ خاصی بے تکلفی کے موڈ میں تھا۔

"اگر گمناپ میں پانی کی مقدار شراب سے زیادہ ہو تو وہ حرام نہیں ہوتی میرے ایک نقیہ کا قول ہے کہ شراب نہ حرام ہے نہ حلال"

وہ بازار موجود کسی نے اس سے کہا

"جناب میرے خیال میں شراب حرام میں کیلئے حرام ہے حلالیوں کیلئے حلال ہے آپ احتیاطاً بنا کر میں اور مزہ احتیاط، کبھی کبھی کسی اچھے آدمی کو بلا بھی دیا کرتا ہوں اپنے خرقہ پر"

بھارتی خاص طور پر پاکستانیوں کیلئے خرقہ کرتے ہیں۔ یہ خرقہ انہیں سرکار کی طرف سے بھی دتا ہے۔ نبھانے اس طرح وہ کس احساس کی تسکینی کرتے ہیں شراب کوئی ایسا مسئلہ نہیں اور نہیں تو ہم انہیں چڑانے کیلئے چنا شروع کر دیں گے اور اس کیلئے کسی مولوی سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں ہمیں۔ اب پاکستان میں بھی بھارتی شراب اتنی مقدار میں ہوتی ہے کہ ہم اسے بھارت سمگل بھی کر سکتے ہیں۔

نہ پینے والوں کیلئے بچت سی بچت ہے نبھانے کیوں بچت کے لفظ سے خیال صرف چیروں کی طرف چلا جاتا ہے کئی کام ہیں جنہیں نیکی یا گناہ بنا دیا گیا ہے اور وہ صرف کام ہیں نہیں یہ کون بتائے گا کہ شراب اور شراب طہرہ میں کیا فرق ہے شراب اور انھوں کی شراب میں کیا فرق ہے۔ آدمی جب نشے کی بندوبست نہیں کر رہا ہوتا ہے تو کیا کر رہا ہوتا ہے نیکی یا گناہ۔ اب وہ لڑکی سویت ڈش لگ رہی تھی کھکھلائی ہوئی یہ شے کچھ دیر پہلے دھماکہ مینے بننے رہی تھی۔ ایسی لڑکیاں قائم ہوئی ہیں انہیں چھیڑتے ہوئے شاعرانہ یا عاشقانہ یا بدبوشتانہ رعایت کے باوجود بھرمندی بھی ضروری ہوتی ہے۔ شاعر صاحب کے غزلیے سیاستدان عورتیں کو برداشت کر سکتی ہیں بھارت میں عمر خالص عورتیں تو اپنے سامنے والی آنکھوں میں اپنا ملک تلاش کرتی ہیں۔ کچھ آدمی کئی کئی لڑکیوں کے ٹپوں کی اجازت کا مشغلہ اختیار کرے ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی ریاست ہوتے ہیں اور ایک ریاست میں دودھ کو کھوٹیں کیسے رو سکتی ہیں۔ کبھی کبھی ایک دوجہ میں کئی کئی ریاستیں اور کھوٹیں قائم ہوتی دیکھی گئی ہیں۔ مگر اس کیلئے اپنے اندر بڑی وسعت اور ویرانی چاہئے۔ بے وفادار بے روج لوگوں کو کیسے بتایا جائے کہ وسعت اور ویرانی میں قدر مشرق ک کیا ہے۔

اس لڑکی کی گنگو میں ایک انجانی خوشبو کی چاندنی تھی۔ اس کی آواز میں کوئی افسانہ ہونے والا رہا تھا اور یہ کہ اس نے شہلار پستی ہوئی تھی وہ اس شب کی سب سے زیادہ محبوب چیز تھی۔ نیریز مرغوب

کھاؤں سے بھری پڑی صلیب والیں "میزبان کھا کھا کے ہم لوگوں کا برا حال تھا۔ اس نے ہمارے ہاتھ میں پلٹ جھانکی اور کہنے لگی

"بے فکر ہو کر کھائے حلال گوشت ہے"

اس نے اس یقین سے کہا تھا جیسے مرغوں کو اس نے اپنی نظروں سے ذبح کیا ہو۔ وہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کے جو کچھ بھی دے دیتی وہ حرام کب رہتا۔ وہ بندہ لڑکی تھی کافرانہ انداز میں بھی ایمان ز حسن کی مالک تھی جس نے اسے دیکھا تو میری بھوک چبک اٹھی اس نے مجھے دیکھا تو میری ہر ہو گیا۔ آوارہ شہر پہنچے کی طرح ایک یا دیر سے لوہ میں کھیلنے کو نہ لگی۔

میں اس لڑکی سے پاکستان میں بھی ایک بار مل چکا ہوں۔

یہ بات میں نے اسے نہیں بتائی ورنہ وہ مجھے ضرور کشتی میں جنس بھارت میں کئی مرتبہ مل چکی ہوں۔ وہ آواز میں پر ایمان رکھنے والی تھی اب تو اس قلم سے کا قائل ہونا پڑے گا۔

مزار پرست و عقیدہ مند

بھارت میں ہماری ہمت سی قبریں زندہ ہیں اب تو صرف قبریں ہی زندہ ہیں جو زندہ ہیں قبریں ہی ہوتے
 و ظفر کیا تھی وہ قبریں زندہ لاشیں ہیں۔ مسلمانوں اور انسانوں کے شاعر علامہ اقبال نے کہا تھا خدا کی بات
 سے پہلے ایک بات مجھ سے سنئے کہ پاکستانی سی سچا انسان ہوتا ہے میں تو برا مجھے انسان کو مسلمان جاننا
 ہوں۔ واضح رہے کہ میں اور ہم مسلمان ہیں مگر مجھے کے مسلمان میں اس منطق کو نہیں ماننا کہ ہندو بتنا بھی
 اچھا آدمی ہو رہے ہر مسلمان سے کم تر ہے میں اس موازنے کا ہی قائل نہیں ہوں یا کبوتر طوطا گدھ
 اور عقاب سب کو پرندہ ہی کہیں گے مگر کبوتر کا موازنہ کبوتر سے ہو گا تو عقاب کا مقابلہ عقاب سے۔ دنیا
 کے سب لوگ انسان ہیں مگر سب سے حوالوں سے ان کا موازنہ مشکل ہے۔ ہر آدمی ایک مختلف اکائی
 ہے۔ کوئی کسی جیسا نہیں۔ ہر آدمی کا اپنا جہان ہے اپنی تہذیب ہے ایک ہی مذہب کے لوگوں میں سے ہر
 ایک کا اپنا پختہ مذہب ہے۔ یہ ایک بشریت بات ہے۔ اگر مشرک کا اپنا حسن ہے حقیقت کے نقطن طبع کے
 طور پر یہ دیکھیں کہ کوئی چند رنگ والے والے اور رشور کا پتیلہ لاہور والی کا موازنہ کیسے ہو سکتا ہے اگرچہ
 دونوں میں قدر مشترک ہوتے ہیں اور اس میں عورت مرد کی تفصیل سے معنی ہے۔ بہت بڑی بڑی عورتیں
 ہیں اور بڑے چھوٹے چھوٹے مرد ہیں۔ کئی میدانوں میں بڑھ گئیں عورتیں مردوں سے۔ کئی میدانوں
 میں وہ انہیں ہی نہیں ابھی۔ وہ مردوں کے مقابلے میں باقی فن ابال نہیں کھیل سکتیں۔
 کبھی کبھار کئی کئی میں کشتی تو کشتی ہی ہیں اور تو راضی بھی۔ اب بے شک آپ قلم انسانوں حتیٰ کہ ہندو
 مسلم کو بھی ایک آئینے میں ایک میدان میں لائے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ آئینہ یہ میدان پاکستان بھارت اور ہر
 ملک میں ہوتا ہے اور ملک صرف نقش اور زمینوں پر نہیں ہوتے زمینوں دونوں خطاوں میں بھی ہوتے ہیں
 اور جو ملک یہاں نہیں وہ ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔

تو مسلمانوں اور انسانوں کے شاعر مغل پاکستان علامہ اقبال نے کہا کہ ”ہندوستان میں سب سے
 زندہ قہر قہر سلطان کی ہے“ ملت کے دشمن کے آخری تہہ نیچے نہ کہا کہ ”شیر کی آئینہ ان کی زندگی کی ڈی
 سو سالہ زندگی سے افضل ہے“ اب گیدوں کی اکثریت ہے انہوں نے شہر میں بیڑ کر لیا ہے اور اپنی
 حکومت بنالی ہے کہ جمہوریت میں سے بھی ہوتا ہے لہذا اور اختیار کے بعد کئی گیدوں کو شیر بننے دیکھا گیا
 ہے۔ زندگی کی آخری حد تک سرحد پر خون کی ہولی پھینٹے ہوئے گیدوں کے ساتھ لڑو لڑو کو بھی ٹھیک
 ٹھیک سنا لیا ہے کہ لڑو جی کے دور ان اور اپنی جمہوری پار شاست پٹی کرنے کے پھر میں جتنے قتل اندازنے
 کرائے ہیں دنیا کی تمام جمہوریتوں میں اب تک نہ کرائے گئے ہوں گے۔ تجھے گاندھی کا حساب اس سے
 لگے۔

تشریح اور مذاہدات آخری والی بات علامہ اقبال نے اور رنگ زہیب عالمکے کہنے کی تھی بیانیہ کیوں
 ہندوستان کی تاریخ میں بیچ کے طور کے بعد علامہ کو اپنی اس بات پر نظر پائی کا شایع نظر آ یا بیٹھنا سخی اور
 تنہائی کا رتا سے پہلے نگاہ کو ہوتے ہیں اقبال کا دل اس کی نگاہ میں لگا ہوا تھا یا اس کی نگاہ اس کے دل میں

کھانے کے بعد جیسے کوئی اندر

خدا کرات تھے بلکہ ”خدا فرات“۔ رات ہونے والی تھی اور مذاق اپنے جون پر قہر آدمی کے بدن میں
 برساتے مگر وہ مردوں کو اس پریشانی مسرت کا پتہ نہیں چلا۔ ہم کینٹ سے شری طرف پہلے شریں کوئی
 قابل دید مقام نہیں۔ ناصر کاظمی اور دو قارا بالائی تھانے کیوں اس شہر میں پیدا ہوئے تھے حسن رضوی کو بھی
 امر اے کہ وہ بھی اس شہر میں پیدا ہوا ہو گا۔ اپنی پسند کے شہر میں پیدا ہونے کا پاس ابھی آدمی کو نہیں ملا
 اسے تو پیدا ہونے کا پاس بھی نہیں ملا بہت کچھ پاس پر ہے پھر بھی آدمی پاس کا دامن چھوڑتا نہیں غم
 بھر۔ ہمارا ایک انقلابی دوست نیوا کہ میں پیدا ہوا جانتا تھا تو اس کے دل کو بھی تھی لاہور میں تھانے یا رنگ میں
 پیدا ہوئی تھی اور وہ خاتون قلم ایبیب میں پیدا ہونا چاہتی تھی۔ انبالا ایسا شہر نہیں کہ جہاں آکر خلطی کا احساس
 ہو۔ یہ شہر بھارت میں ہمارے آنے کا دروازہ بنا۔ یہاں گزرے نھوں کی دستک دل میں گونجا کر گئی۔

دو تین مزارات ہیں یہاں۔ یہ وہی لوگ ہر دور میں ہر شہر میں ہوتے بیٹھ۔ آج کل بھی ہوں مگر ہم
 انہیں نہیں جانتے یا وہ ظاہر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کو بعد کے لوگ دریافت کرتے ہیں بھی لپٹا نہات بھی
 انہیں اور یہ اپنے زمانے کو افکار دیتے ہیں۔ ہندو پاک میں بیستوں کی ہستیاں ان سے منسوب ہیں۔ ہر
 کہیں یہ لوگ اپنا جھنڈا پر ٹھکانا کرتے رہے۔ دلی لاہور ملتان کے اچھے بڑے شہروں میں وہ یہاں تھے تو یہ
 آسمانوں جتنے کیسے تھے مونیوں کی ہستیاں بیش ختمی کی وسعتوں میں قائم ہوئیں۔ خواجہ سلیمان ڈوسری
 توتس میں کس اگلا ہے۔ بمقام ہونے تھے وہ جگہ کی توتس کلائی جہاں انہوں نے آرام کیا ہوا تھا میں
 میں سلطان ڈگر یا کبھی جرت کی کیفیت میں آباد ہوئے تھے۔ لگتا ہے جیسے ہر ہستی کسی نہ کسی بڑے
 آدمی کی ایک لکیروں کا شہر ہے۔ بڑے آدمی سے مراد سچا آدمی ہے۔ سچا آدمی ہی انقلابی ہو سکتا ہے۔ دنیا
 کے سب سے بڑے انقلابی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سچا انقلابی وہ ہے جس کے قول و فعل میں
 تضاد نہ ہو اور تاریخ انسانی نے اس لحاظ سے اس جیسا آدمی پیدا نہیں کیا۔ اس کے بعد مختلف زمانوں میں
 مسلم صوفی عشق رسول کے اس میدان میں انقلاب کیا کردار کی یاد کرتے رہے۔ ایسے آدمی کی قبر بھی کتنا
 نہیں ہوتی۔ ٹھنڈے والوں کی ہر ہستی میں کوئی نہ کوئی قبر ہوتی ہے جو زندوں سے زیادہ زندہ ہوتی ہے اور اقبال
 حضرت سلطان بابو

بابو ایسے آدمی جو میرے قبر جہاں دی جیوے ہو

بھارتی صد کی پاکستانی بھتیجی

ہمارے میں صدر کو راشن دیتی کہتے ہیں اور پتی شوہر کو کہتے ہیں۔ اس ضمن میں وہاں ایک واقعہ بالطیف

چلا ہوا تھا۔ ایک لڑکی اپنے تاجی یعنی والد محترم سے مجھڑی تھی کہ میں تو اس آدمی سے شادی کروں گی جو میری نوکری کرے اور ہر گھڑ بلاچوں چاٹے۔ میری ہوتاں صاف کرے اور مجھ سے وہی جوتیاں کھا کر اٹ نہ کرے۔ باپ نے یہ سن کر کہا "بہن! اچھے بیٹے چاہتے یا رشتہ بنی چاہتے؟"

یہ حال پارلیمانی نظام کے تحت صدر دین وقار کا صرف بھارت میں ہی نہیں اور بھی کہیں کہیں ہے۔ یادش بخیر جب پاکستان میں یہ نظام حکومت تھا اور چودھری فضل الہی صدر تھے تو ایوان صدر پر یہ نعرے لکھے ہوئے تھے "چودھری فضل الہی کو برا کرو" ایک بار جب چودھری صاحب کے کچھ عزیزان کے پاس ایوان صدر پہنچے اور کہا کہ ہمارے شہر میں بجلی نہیں ہے آپ ملک کے صدر ہیں یہ کام کروا دیں تو صدر محترم سوچ میں پڑ گئے کچھ دیر کے بعد لوگوں نے کہا کہ صدر صاحب آپ کس سوچ میں پڑ گئے تو انہوں نے غصے ہو کر کہا کہ اگر دھمرو دھمے یاد تو کر لینے دو کہ بجلی کے جھگے میں میرا دھنچ کون ہے۔ یہ ایک اسلامی ملک کے مسلمان صدر کا حال ہے۔ البتہ "رہنمائی" چودھری صاحب کی بھی نسبتاً بہتر تھی۔ سچائی کا عزت اور باقی صوبہ صدروں جیسی اس سلسلے میں ابھی تک وہ ہمارے پہلے صدر تھے جو سابق صدر بوکر شرسار نہ تھے۔ سرکاری شان و شوکت کے ساتھ ایوان صدر سے احوال کے لئے اور پھر ایوان دنیا سے بھی انہیں سرکاری اعزاز کیساتھ "آئی سی" کیا گیا۔ باقی تو اس "آف" کر دیئے گئے۔ یہ سب صدر بہت صدر تھے۔ اصل میں مارشل لا لاء ایڈمنسٹریٹر تھے ہمارے ہاں ایک سولیس مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی ہو گا اور ہے تب وہ صدر تھا۔ جب وزیر اعظم ہاں وہی کچھ تھا۔ ہمارے ہاں نظام صدارتی ہو یا پارلیمانی ہو تو ان میں شان ہے بھارت میں وہ ملے جیسے وہاں شوق ہے ہمارے ہاں صرف شوق ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کوئی فعالیت کر کرنا مناسب نہیں یوں دورست عالم داخل آدمی ہیں۔ ان کے ایک بھائی ڈاکٹر محمود حسین کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ان کی بیٹی ڈاکٹر تارا نے ادبی اتھارٹی پر ایک اچھے منظر کی طرح موجود ہیں۔ ان کا یہ تعارف بھی ایک خوبصورت حقیقت رکھتا ہے کہ وہ جنرل رحیم الدین خان کی اہلیہ ہیں۔ بلوچستان میں حزب اختلاف کے مستقل لیڈر بھی گورنر کے طور پر جنرل صاحب کی تعریف کرتے ہیں۔ انہوں نے صوبے میں اقتدار و انتظام کو تخلیقی اور ترقی دہی حوالوں سے ایک مقام دیا۔ بیکر جائزہ رحیم الدین ادبی حلقوں میں شرافت و شخصیت کو یکساں دینے والی خاتون کے طور پر معروف ہوئیں۔ انہوں نے کوئٹہ میں "قلم قبیلہ" کے نام سے ایک ادارہ منظم کیا۔ قبائلی نظام والے علاقے میں اہل قلم کو ایک قبیلے کا درجہ دولا تا کسی معرکے سے کم نہیں۔ کوئٹہ جیسے دور آوارہ سرزمین تخلیقی گما جمعی کی قضا میں گئی۔ ہماری کئی خود ساختہ ادیب خواتین بیکر صاحب کی طرف اس لئے مخالف ہیں کہ وہ ایک جنرل کی بیوی ہو کر ادبی کاموں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ ایسی ہی کمات تو کھوں سے باہر نہیں نکلتیں۔ یہ ادبی حلقوں میں آج بھی ہیں تو ہمارا کیا بچے گا۔ بیکر صاحب کی گفتگو کرے یہ ایک مکمل ترقی آرزو کی خوشبو شامل ہوتی

حق کیا ہوتا ہے اور حقوق کیا ہوتے ہیں کیا مقام ہے جہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک ہو جاتے ہیں اور اس بات کا حقوق سواں اور حقوق زوجیت کیساتھ کیا تعلق ہے۔

ہے۔ ان کیلئے دل میں عزت مند ان آدمی کو بیدار ہوتی ہے ایک کشش کشادگی میں مگلی ہوئی۔ مسلم کچھ کا اختران کے جمال وار سراپے میں زندہ ہے۔ ڈاکٹر طاہر القاسمی نے انہیں اردو ادب کی سونیا لیا کہا۔ منصور قیصران کے بہت معترف ہیں جبکہ وہ جوئے بڑوں کے معترف ہیں۔ اسلام آباد میں کل پاکستان رائٹرز گلڈنر میں ان کو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔ فیضی، والیال، نخرے، والیال ان کے سامنے سچ تھیں (ہمارے سامنے سچ تھیں) جب تک کہ صدر کھان ایوان پاکستان کے دورے پر آئے تو ان کی صاحبزادی بھی ساتھ تھی۔ جس کا استقبال صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی بیوے کیا ہو ہمارے مشرقی ادیب کے مین مطابق تھا اور جنرل صاحب کی بیوی ہیں ان کی بیٹی اچھی ماں پر گئی ہیں صدر ضیاء الحق کی حیثیت میں جو قتل اور پروا دی ہے یہ ان کی ماں کی عطا کردہ ہے۔ کسی شخص کی ذات کی تکمیل میں اس کی بیوی کا کردار نمایاں ہوتا ہے پھر اس شخص کی بیوی اس خون کو مکمل کرتی ہے جو ایک اچھے گھر کا نقشہ بناتی ہے۔ گھر کو ذات جو عین بناتی ہیں۔ صدر ضیاء ایک ایسی گھر میں رہتے ہیں ایسے گھر ہمارے ملک میں اور بھی ہیں مگر کم ہیں۔ ہمارا ملک ایک اچھا گھر کب بنے گا۔ کیا اس ضمن میں کچھ کو کشش صدر ضیاء کے گھر کے اندر سے نہیں ہو سکتیں۔ کو کشش کوئی ہو رہی ہیں بغیر ان کے کامیاب کو کشش بھی کو کشش کامیاب کب ہوں گی؟ تحریک خلیج کی ہم شکل بیٹی نے پورے دورے کے دوران شریفانہ طرز عمل سے جانت کیا کہ وہ واقعی اسلامی جمہوریہ پاکستان کی بیٹی ہے۔ جنرل ضیاء کے دور میں ملک کے نظر آنے والے منظر نامے میں ایسے بہت سے افسار تھے ہیں مگر نگاروں کے باطن میں بڑا زانی خلیں موجود ہیں۔ جو ظاہر کو بھی سب اعتبار کر رہی ہیں۔ یہ بد چلی کس دور میں ہم سے الگ ہوں گی۔

عزت کو نہایت سیاست کا ذکر دو معنی بھی ہے اور بعض بھی۔ جس معاشرے کی عورتیں اعلیٰ ہوں تو کیا پڑھتی ہوں گی بھلا۔ مجبور و محکوم عورتوں کی بات الگ ہے۔ میرے دل میں ان کیلئے وہ تپ ہے جو مجبور و محکوم قوموں کیلئے ہوتی ہے۔ مگر اس کو سیاسی مفادات کیلئے استعمال کرنا میرے نزدیک اچھا نہیں۔ عورتوں کے سیاسی مفادات کا ایک سراپا بھی مفادات سے جا کر ملتا ہے۔ ہماری کچھ لیڈر اور کچھ نگار خواتین ایسی ہیں جو احترام کے نقطہ سے ہی جیتی ہیں۔ ویسے یہ باتوں کے سارے مرد اور ساری عورتیں عزت کے لائق نہیں ہوتیں۔ ان کی عزت کی جائے تو ان کی حق تلفی ہو جاتی ہے اور میں عزت کی کسی قسم کی حق تلفی کے حق میں نہیں۔

حق کیا ہوتا ہے اور حقوق کیا ہوتے ہیں کیا مقام ہے جہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک ہو جاتے ہیں اور اس بات کا حقوق سواں اور حقوق زوجیت کیساتھ کیا تعلق ہے۔

جو گزرا کرتا تھا۔ ایسے لگتا ہے کہ وہ سناٹا زمانہ جو دھیرے دھیرے گزرنا چاہیے تھا کھڑے کھڑے گزر گیا۔

وہ بڑیاں کبھی ہوں گی جو "میںٹول" میں مضمتی ہوں گی۔ اعزاز اور انعام تو اور بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات انوکھی ہے۔ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا ہوں اب پڑھا رہا ہوں مگر ایسی جگہ کہیں نہیں پائی۔ اس عرصے میں الیٹ اپنے اجڑے ہونے والے میں ایک جمونیوی سی بنائی ہے۔ پڑھا کرتا ہے وہاں بیٹھ کر۔ لوگ تو اپنے اندر تاج محل اور ایوان صدر تعمیر کھڑے کرتے ہیں۔ تاج محل اور ایوان صدر میں بہت فرق ہے جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا ان کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔ لیکن اب صرف ایسی باتیں بڑھانا ممکن نہیں رہا۔ سرمایہ داروں اور اتحادیوں کو تمام لوگوں کے بملاوے کے لیے مشکل حربے تلاش کرنے پڑیں گے۔

ہمارے پاس وقت نہ تھا قسمت نے لکھ دیا ہے کہ ایسے موقعوں پر آدمی وقت سے پیچھے رہ جاتا ہے یا آگے نکل جاتا ہے۔ ان دونوں عملوں کی سزا میں نیازی کے بقل تھی ہے۔ آج میں بار بار اپنے کو تھاپا یا اور میرے پاس وقت نہ تھا تو میں اس لاہوری کے لطف لے لے کر پڑھتی ہوئی لکھی ہوئی کوئی کتاب اٹھ کر پڑھا تو اور کچھ دیر کسی کہیں میں بیٹھ کر پڑھتا جائے کیوں بھی تھے لیکن تھا کہ وہاں بیٹھ کر پڑھنے سے "سچ" جلدی یاد ہوتا جو گاور کچھ چیزیں بھلائے میں بھی آسانی ہوئی ہوگی۔ یاد کرنے کیلئے کچھ بھلانا ضروری ہوتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ مجھے کچھ دیر کیلئے کتابوں نے کی اجازت دی جائے مگر نہیں دیا۔ ایسے حالات پیدا کرنے کی اجازت ہوتی ہے کہ آدمی بھری دنیا میں تھما ہو جائے۔

کھیلاری نے جو لٹریچر لکھی، میں پکڑائی اس میں ایک سچہ ملکہ گزرا کالج کے حوالے سے "میں پچی" کا نام "عبرت ناک کمانی" ہے جسے ہم ایسے کمانیاں تحقیق کرتے ہیں۔ یہ کمانیاں ہمارے اندر بھی تخلیق ہوتی رہتی ہیں مگر ہم عبرت نہیں پکڑتے عبرت نہ ہوتی گاڑی ہو گی جو شیش سے نکل چکی ہو۔

اس کتاب کی میں لکھا ہے "ایک تازان بالک کے ہاتھ میں دیاسلانی ہو وہ اسے جلا کر خوش ہونا چاہتا ہو پھر سارے گھر کے محل جانے کا اندیشہ ہے" میں نے سوچا کہ بارے بھارت میں کئی "وانا" ہے "جس جو بارے بندہ پاک کو اپنے ذرا سے احسان پر رتی کیلئے جلا کر خاک کر دینا چاہتے ہیں ان کے اندر بگڑے ہوئے بچے کو کون سمجھا گے۔ اس جمونیوی سی کتاب میں بالک کے من میں جھتی ہوئی دیاسلانی کی بات بھی لکھی ہوئی ہے۔

بچے کے اندر فطری روشنی ہوتی ہے اسے آجکل پیدا ہوتے ہی بجھانے کے جتن کئے جاتے ہیں تاکہ مصروفیت اور بھلائی میں کوئی لہر نہ پائیں باقی نہ رہے۔ بچپن اور بدشت دونوں ایک جگہ واقع ہیں۔ پھر ہم نے ان دونوں جگہوں میں فاصلے کیوں بڑھا دیے ہیں فاصلے سرحدوں سے نہیں بڑھے۔ اپنے اندر سوچوں، جملوں اور رویوں کی وجہ سے بڑھے ہیں بھارت میں کوئی لکھی ہیں جن سے رابطے کیلئے کبھی سرحد آئے

بچے کا سیکولرزم

ہم کہیں نکلے والے تھے کہ دلی حاج

گورنر سکول والے آن پئے اور ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔ کوئی بھی ہوتا آج ہم اس کے ساتھ چلے گئے بلکہ انخوا ہو جائے وہاں جا کر پتہ چلا کہ سکول میں کالج بھی ہے۔ سکول میں کالج والوں نے ہمارے ساتھ وہی کیا ہو تعلیم اداروں میں وزیر تعلیم کسرا تھ کیا جاتا ہے شاہیہ زیر تعلیم کے ساتھ "وزارت والی لکھنے سے وزیر تعلیم بناتے۔ وزیر تعلیم بننے کے بعد وزیر تعلیم کب رہتا ہے۔ صرف وزیر ہو جاتا ہے۔ اگر تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہو تو وزیر کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ بھارت نو روئی کے دوران ہم نے سارے قلم اور تمام قلم دان برادر کہاں عطا الحق قاجی کے سپرد کئے ہوئے تھے اس لئے ڈائریکٹر دلی سانج کالج میں ہم وال کھڑے ہوئے عطا اور ان کے وفد کے ارکان یعنی انور مسعود اور میرا استقبال کیا وہ تیس گارڈ آف آرمز بھی پیش کر کے والے تھے مگر میں نے انھیں منع کر دیا الیٹ میں اس فوکر افر کو تو روک۔ کاجس نے بلا مبالغہ ہماری دو تین سو تصویریں بندھائیں بنا کر کہاں والی ہوں گی۔ مثلاً ہم ڈائریکٹر صاحب سے کچھ پوچھ رہے ہیں پوچھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ کاجس رہے ہیں جبکہ کھانے کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ کہیں ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے پڑے ہیں ہمارے بیٹے کافوکر افر کو تھینا فرانس ہوا ہو گا۔ ایک تصویر ماری گئی اس کی ذمہ کوئی بات یا کوئی کام کر رہے ہیں یا نہیں کر رہے ان سارے "لموں" کو "فوا" لیا گیا۔

سب سے پہلے ہم لاہوری میں بیٹھے۔ پڑھنے والوں کیلئے وہاں انجلی کتابیں بھی ہوں گی۔ پڑھنے والوں کے بیٹھے کی جگہ بہت انجلی ہے ریفرنس روم کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کہیں بنے ہوئے ہیں۔ ایسے کہیں تو بوطوں یا سٹینڈوں میں ہوتے ہیں اور "خاص" کاموں کیلئے ہوتے ہیں۔ وہاں کھانا پینا یا قلم دیکھنا تو ایک بھانہ ہوتا ہے۔ لاہوری میں یہ کہیں دیکھ کر طرح طرح کے خیال ذہن میں خلط ملط ہوتے گئے۔ شاید ایسے نہیں فوراً بتا دیا گیا کہ یہاں صرف ان بچوں کو بیٹھ کر مطالعہ کرنے کا حق ملتا ہے جو پڑھائی لکھائی میں اعلیٰ ذوق و شوق کا بیعت و میں سے وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر دیکھا اور سوچا کہ طالب علمی کے زمانے میں ایسا میرے جیسوں کے نصیب میں کب تھا۔ میں تو بقل پر دھیر صید احمد خان "ان طالب علموں میں سے تھا جو کسی امتحان میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر پاتے۔ کبھی کسی استاد سے شاباش کا قطف تک نہیں سن پاتے۔ بیٹھ کلاس کے آخری صف پر اپنی نشست جماتے ہیں" میں تو اس صف پر بھی کوئی سوال پوچھنے کی سزا کے طور پر اور بھی جواب نہ دے سکتے کی پادش میں بیٹھ کر کاڑیاد وقت کھڑے

اندر جنجال کر رکھو اور جوئی میں آئے کرو کرتے رہو کیونکہ اس طرح گناہ کا احساس آدمی کی بنیادی
معصیت کو بچھ نہیں کرتا۔ زندگی ایک بے ساختہ پن اور برجستگی ہے۔ اپنے من اپنی یاد کے کسی علاقے
میں بچھن کر جنجال رکھنے میں زندگی کا راز ہے۔ وہ سناج والے وہ سارے رویے لپٹانے کی خواہش رکھتے
ہیں جو کسی خوبصورت سناج کا دواجن ہوئے ہیں اور کسی بے گندہب کا حصہ ہیں۔ مذہب نسل رنگ زبان اور
کسی بھی حوالے سے بچے ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے۔ رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
"مجھے بچے جن باتوں کیلئے اچھے لگتے ہیں۔ وہ منی سے کھیلے ہیں۔ وہ روئے ہیں۔ وہ لڑبڑیں تو دل میں کچھ
نہیں رکھتے اور فرما من جاتے ہیں" اس حدیث کی تفسیر یہ کیا کریں جو منی سے بدگتے ہیں روئے سے
شرعاً ہیں بغض اور نفرت کو اپنے اندر پالتو درندہ بنا کر رکھتے ہیں۔ میں جب کسی سکول میں جاتا ہوں تو
بچوں میں لوٹنے کی ترکیبیں کر کر دیکھتا ہوں۔ مگر یہ کام ترکیبوں سے نہیں آتا۔ اپنے خود اور روح کے اندر
خود بخود ہوتا ہے۔ وہ سناج سکول کی دوسری منزل پر جانے کیلئے بیڑیاں میں بیٹائی گئیں ایک ہموار
"ڈھولان" کی بنی ہوئی ہے۔ آہستہ آہستہ بچے اترتے ہوئے میں نے سواکھ کوئی پچھ ہوتا تو بغیر کسی
چٹکچٹ کے پھسلتا ہوا چلا جاتا۔ بڑے قویک ماطولم وقار کی رسی سے لگتے رہتے ہیں۔ ایسے میں رسی کو
چھوڑنا اور نہ چھوڑنا تقریباً ایک جیسی معصیت ہے۔ میں اس سکول کے دور و پار کے سامنے ایک پرانی آرزو
میں کھٹکا ہوا پھر رہا تھا۔ بچے سے زیادہ چھادو گراؤن ہے کہ اسے اپنی چٹائی اور گمرائی کا اندازہ ہی نہیں
ہوتا۔ چٹائی اور گمرائی کا احساس اور زخم آدمی کو میلا اور چھوٹا کر دیتا ہے فاصلے طے ہو جائیں تو نہیں
دور یاں نہیں کیا جاتا خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہوں۔ تم نے بڑے ہوش پر رکھنے اور دلہنے کے طریقے اور
آگے لپیٹا کر لئے ہیں۔ اس طرح چیزوں کی حقیقت اور حیرت چاہو جو جاتی ہے اشیاء کے بارے میں سب
کچھ معلوم ہوتا ہی دانائی نہیں کچھ نہ کچھ لاعلمی بھی ضروری ہے۔ جنس کا فہم یقین و عرفان میں چٹکی اور
تازگی پیدا کرتا ہے۔ بچے کی عورتی اور بے نازی اصل جو بہر حیات ہے۔ میں سکول سے چلے آئے پر خود
کو آکھو میں کر پارا تھا یہ ایک چھاسکول ہے سکول کوئی بھی کہیں بھی رہا نہیں۔ صرف ایک پرانی بات ہے
کہ آدمی بڑا ہو جائے تو وہاں داخل نہیں ملتا لاکھ سکولوں میں داخلہ پڑھ کر عمر کے لوگوں کیلئے زیادہ ضروری
ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ انداز کا گندھ می سکول سے آگے نہیں گئی۔ وہ میٹرک لیٹ تھی جسے حرید
انگریزی میں کرتا ہوتا سینئر کیمرج کہ لیں۔ میٹرک پاس ہونا کوئی کی بات نہیں کی ان بڑھ لوگ سارے
بندہ متمان سے مکرران رہے اور وہ بڑے لکھوں سے بہتر مکرران تھے۔ داخل کاتھام وہ ہے جہاں ان بڑھ
اور بڑھا کھٹا ہونا برا ہو جاتے ہیں۔ میٹرک مل یا پاس ہونا کوئی معیار نہیں وہ نہ بھارت میں ساری
میٹرک پاس عورتیں اندر این سکتیں۔ اندر انداز کو اپنے میسرا کا چاہتی تھی وہ کیا بھی خود بھی نہیں چاہتی
تھی۔ کتنی خوبصورت، کتنی فاطمہ، کتنی متعجب اور کتنی بندو۔ راجیو سمیت بھارت کے سارے لیڈروں کو
جاننے کہ وہ کسی سکول میں پھر سے داخل ہوں تو شاید کچھ اچھا ہو۔ شاید انہیں اس سکرانی کا پھر احساس ہو

نہیں آئی وہ نہ میرے گاؤں میں کی عزیز برہمنوں سے ایک دوسرے کیساتھ رابطہ توڑ کے بیٹھے ہیں ہم کئی
بندوں سے مل کر بھی نہیں ملے اور جن سے کبھی نہیں ملے ان سے روز ملتے ہیں۔ نظر آنے والی سرحدیں
نہ بھی ہوں بھی ہم ملحدہ ملحدہ ممکنات میں بے ہوش ہوئے لوگ بن جاتے ہیں کچھ لوگ تو اپنے اندر قریہ
ریہ ہو کر کئی ملکوں میں تقیم ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال مجھے اکھڑ بھارت کا خواب دیکھنے والوں کے درمیان
زیادہ دور شور سے چھوڑنا پڑتی حدیں رہنمائی سرحدیں پہنچنے سے کم ضروری نہیں۔

لابریری سے لگے قویک بڑے ہال میں داخل ہوئے۔ سامنے ایک "چودے دار" تصویر تھی۔ وہ
لوگ اس مقدس تصویر کے سامنے جوتوں سمیت نہیں جاتے۔ میں نے وہ تصویر پردوں کے پیچھے بھی دیکھ
لی اس نے مجھے بھی دیکھا لایا ہو گا۔ میرے نزدیک مجھے پائس ہونے کیلئے جوتیاں اندر ضروری نہیں پائس گتے
میں جوتوں کا بار نہیں ہوتا چاہئے۔ اکثر اوقات یہ بار صرف اسی کو نظر آتا ہے جس نے پناہو ہوا میں نے
سواکھ کا تصور اور تصویر میں زیادہ فرق تو نہیں ہوا کچھ اور بات وہ سناج کے بزرگوں کے بارے میں معلوم
ہو گیا وہ تقریباً بزرگوں میں مشترک ہیں ان کے بڑوں کی ایک بات یہ تھی کہ ان دنوں میں جب جاٹ
لوگ اپنی بیٹیوں کو پیدہ ہوا تو سبھی ملدا ڈالتے تھے۔ ان کے ہاں لڑکوں لڑکیوں کی یکساں پرورش کا ہتھام ہوتا
تھا یہ تو میرے چارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور حکم ہے۔ عورت کی عزت اور
حیثیت کی حفاظت کرنے والا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کون ہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے
لیڈر راج نائن کا کہنا ہے کہ بھارت میں یکساں سول کو کیلئے اسلامی شریعت سے بہتر کوئی قانون نہیں اور
جیسے حقوق عورت کو اسلام نے دیے ہیں دنیا کا اور کوئی قانون نہیں دیتا۔ راج نائن کو یہ ہو گا کہ اپنی بیٹی
فاطمہ کے آنے پر حضور احرا کفر سے ہو جاتے تھے اور ان کے بیٹے کے لئے اپنی چادر بچھا دیتے تھے اپنی
محبوب بیوی عائشہ کا بھوٹا پانی پی لیتے تھے اور اسی جگہ اپنے ہونٹ گلاس پر رکھتے جہاں حضرت عائشہ نے
منزل لگا کر پانی پیا ہوتا تھا۔ ہمارے مولوی ایسی باتیں نہیں مانتے تھوڑے ہیں کہ کہیں ہم گمراہ نہ ہو جائیں
کیا گمراہ ہو جادو ہمارا ہوتا کیسی ممل ہے۔ وہ سناج والے مذہب کو نہیں مانتے اور انہوں نے مذہب
والوں سے بھی کڑی پابندی اپنے لو پر لگا رکھی ہیں یہ میٹرک بھارت سے صرف پابندیوں سے ہیں اگرچہ زندگی میں
بے ارادہ کسی ہم کچھ نہ پابندی کسی نہ کسی طرح بھارت رہتے ہیں جہاں کا احساس دلا یا جاتا ہے تو
مشکل پڑ جاتی ہے کچھ ایسی کیفیت ہو کہ پابندی ہوں مکران کا پچھو محسوس نہ ہو جس طرح آدمی ساری
عمر اپنے وجود کو پچھو اٹھائے پھر تارے اور محسوس نہیں کر تا اور اپنے جسم کے وزن سے کم بھی چند لمحوں
کیلئے اٹھانے کو تیار نہیں ہو جاتا۔ اچھے کام اس طرح ہوں جس طرح آدمی سانس لیتا ہے جس طرح اس کا
دل و دھڑکتا ہے اور اسے اس نہایت ہم سر مری کی تکلیف تو کاغذ پر نہیں ہوتی۔ نیکی کا ہمیدہ ہو جاتے
تو اس کی تاہم کہ ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں بے دھیلے میں گناہ بھی اندر گناہ نہیں ہوتا بچے کا کوئی گناہ مام
نہیں ہوتا۔ اسے خدا بھی کچھ نہیں کہتا اس پر تعزیرات اور حدود لاگو نہیں ہوتیں جیسے کہ سی معصومیت اپنے

دَما دمِ مستِ قلندر

عزیزی چند رچی بھی ہمارے ساتھ تھا وہ کسی پاکستانی سے تھے میں ملی ہوئی شلوار قمیص
میں تھا لوگ اسے بھی پاکستانی سمجھ رہے تھے۔ چدرتے ایک سردار بنی ہو چکا
”آپ پاکستان کے کس شہر سے ہیں؟“
وہ اس اچانک سوال سے گھبرا گیا
”کلیا ایالہ پاکستان میں شامل ہو گیا ہے۔“

ہوا میں مگر ہونا چاہتے تھا سالوں نے تقسیم ہی غلط کرائی ماری۔ شر اس طرح ہائے جس طرح
ریوڑیاں بانٹی جاتی ہیں۔ ریوڑیاں ہائے والا دھا ہوتا ہے یا ان چاہا ہے ”مزملڑیاں توں“ جہاں قبریں
جہاں اجتماعی روحانی ورثہ ہے۔ وہ شہر ہمارے بھی ہیں۔ کوئی شہر ہندوستان میں ایسا ہے جہاں ہماری کوئی نہ
کوئی قبر نہ ہو۔ یہ سارا ہندوستان ہمارا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہماری بھائیو! اس شعر کو شعر کی طرح پڑھو اور گاؤ۔ شہر کی گائے بہت بناؤ لیس گھیت میں جو
تمہارے مطلب کے شعر میں وہ بھی گایا کرو
اسے آب رود گنگا وہاں ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی غنی نہیں ہماری
صدیوں پہلو دشمن دور زماں ہمارا

یہ سارا جہاں ہمارا ہے یہ جہاں اگلے جہاں کی نسبت سے قائم ہے۔ یہ ان کی گزر گاہ ہے جو زندہ
رہنے والے جہانوں کی طرف جا رہے ہیں۔ مسافر اور سیاح جہاں سے گزرتے ہیں وہ ان کا رستہ ہوتا ہے۔
جہاں تک ان کی نگاہ جاتی ہے ان کا وطن ہوتا ہے، جہاں رات بسر کرتے ہیں ان کا گھر ہوتا ہے۔ البتہ
جہاں حکومت کرنے یا سیاست کرنے والے رہتے ہیں وہ ہو سکتا ہے جسے سرائے بھی کہا جاتا ہے۔
جس جگہ لوگ آتے جاتے ہیں وہ سرائے خاند ہو، طوائف کا کھانا یا ان حکومت ایک ہی بات ہے۔
تجربہ جیسے تو آتے رہتے ہیں آتے رہتے ہیں جاتے رہتے ہیں۔ دلی کی سلطنت میں خاندان نمرو سے پہلے
بھی کئی خاندان تھرا ان رہے۔ خاندان مغل، خاندان لودھی، خاندان تغلق اور خاندان غلاماں۔ آقا خان
میں بہت بڑا خاندان چھپا ہوا ہے۔

جو بچپن کی سیکولر سٹیٹ میں ہر بچے کو قسطنطینی طور پر ہوتا ہے۔ ہندوں کی دنیا میں بچے ہی سیکولر ہیں کوئی بڑا
سیکولر ہونی نہیں سکتا۔ جب میں بھارت میں تھا۔ ان دنوں اندرا جی زخوہ تھی بلکہ بہت زخوہ تھی۔ میں نے
چاہا تھا کہ وہ زخوہ رہے۔ بھران رہے۔ جوان رہے۔ عمر توں کی جوانی میں بچپن زیادہ ہوتا ہے اس عمر
میں اندرا مسلمان نوجوانوں سے عشق آزماری تھی۔ عشق آدمی کو کشادہ اور سیکولر کرتا ہے۔ اسی عمر کی
مرا جعت ہے بچوں کی محبت اپنے ساتھ پھیلنے والوں سے شجرہ اور عقیدہ نہیں پوچھتی۔ اب اندرا آج بھائی ہو
چکی ہے ہم نے بھی وہیں جانا ہے شاہد وہاں لوگ جوان ہوں گے۔ اور شاہد کہ وہاں مور۔ دی کی اس
طرح تقسیم نہ ہوگی۔ بجز بڑے نہیں ہوں گے کہ بچہ جوں میں خود مور ہوتے ہیں۔ وہاں اب کچھ ہو گا
مگر قسطنطین ہو گا جہاں دیگر کے پائے اور معیار یہ نہیں ہو سکتے۔

انبالہ کے مشین پر میں نے سرداری سے کہا جب تک ہم یہاں کھڑے ہیں آپ اسے پاکستان ہی سمجھتے۔ ہر شخص بیرون ملک اپنا وطن ساتھ اٹھا لے پھرتا ہے۔ سردار صاحب نے زوردار فقیر لگا ڈیو بیٹ فارم پر داخل ہو چکی گاڑی کی گزرگاہ سے بغل گھبرو گیا۔ گاڑی میں سے لے کے چل دی۔ ڈبے کے باہر کے سارے منظر جانے پہچانے تھے۔ سبز رنگے بوئے آدمی کوست میں نہ دیکھی ہوئی چیزیں دیکھی ہوئی لگتی ہیں۔ مجھ میں سے کوئی مجھ سے پہلے ادھر آیا ہے۔ میں خود کو صحتاً آ رہا ہوں۔ لوگوں کے رشتہ دار یہاں ہوں گے۔ میں خود یہاں ہوں اور کئی قبیلوں میں بکھرا ہوا ہوں۔ کنڈو قبیلہ میں سویا ہوا ہوں۔

گاڑی کرناں مشین پر رکی ہوئی تھی۔ گاڑی ہر آدمی کے اندر ایک نہ ایک چل رہی ہوتی ہے اس گاڑی میں اپنے پرانے بازار طرح کے مسافر بیٹھے ہوتے ہیں کتنے ہی مشین آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ میں گاڑی میں بیٹھا جانتے کتنی گاڑیوں میں سبز کر رہا ہوں۔

گدی کوک مرید ہی اسے

میں ڈبے سے باہر نکلتا ہوں۔ ایک فقیر میری طرف بڑھتا ہے

"تین دن سے بھوکا ہوں اوپر والے کی قسم"

میں اسے آگے جانے کا اشارہ کرتا ہوں بھارت میں پڑھے لکھے اور بھیک مانگنے والوں کی تعداد براہِ رعبہ ہے ایک اور مانگنے والا آتا ہے کہتا ہے

"قلندر رہی کی قسم میرے بیٹے روٹی کیلئے ترس رہے ہیں"

میں اسے کچھ پیسے دے دیتا ہوں کوئی مجھے کہتا ہے تم نے مسلمان اور ہندو فقیر میں فرق کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ضلع کرناں میں کوئی بوہل قلندر کی قسم کھا کر بات کرتا تھا تو وہ جھوٹ نہ بولتا تھا۔ اس عمل میں مسلمان اور ہندو کی تمیز نہ تھی میں نے فقیر کو باکے پچھتاؤ اس نے بتایا کہ میں مسلمان نہیں ہوں مگر قلندر رہی کا عقیدت مند ہوں قلندر رہی کے حزار پر بھی جانا ہوں جو کرناں کی تحصیل پانی پت میں ہے۔ جیسے کوئی لاہور میں موجود شخص داتا صاحب کا نام نہ والا نہ ہو تو وہ لاہوری کیسے ہوا۔ مسلمان اب کرناں میں کم ہوں گے بلکہ کم سے کم بھی کم ہوں گے۔ پاکستان میں کرناں کے دو آدمیوں کو ہم جانتے ہیں۔ غافل کرناںی اور عاصی کرناںی۔ ہمارے حصے میں غافل اور عاصی ہی آئے ہیں۔ قلندر رہی کے حزار پر قلندر رہی کے نام پر مسلمان زیادہ تر بھیک ہی مانگتے ہوں گے۔ ان میں کئی ہندو بھی ہوں گے مگر بھیک مسلمان ہی کرناں میں لیتے ہیں۔ اب تو قلندر رہی کا نام لیکر بھی جھوٹ بولا جا رہا ہو گا۔ عجیب بات ہے کہ قسم کھا کر پانت کرنے والے پر عداوت کئی نہیں ہوتا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بھی بت چھپیں کھائی ہیں لوگوں کا اب اللہ پر بھی اتنا اعتماد جا رہا ہے حالانکہ اللہ کی ہر قسم بذاتِ خود ایک دلیل ہے اس بات کی جو اس کے بعد بھی لگتی ہے۔ قسم اپنی جگہ پر ایک دلیل ہے مگر ہم اپنی جگہ پر نہیں ہوتے۔

ابھی ابھی وہ ہندو جو قلندر رہی کی قسم کھا کے مجھ سے پیسے لے گیا ہے۔ جھوٹا بھی ہے تو میں اسے جھوٹا

ان انھوں میں کیا تھا کہ شاید وقت پر گزرنا طاری ہو گیا۔ اس نے عامل کو فوراً برطرب کر دیا اور معافی طلب کی اور منظر کشی کیلئے امیر خسرو کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ خسرو نے قلندر رہی کے سامنے اپنی شاعری اور موسیقی کو گھمراہ کیا اور بچے کیسے کہنا چاہا۔ اب یہ جو قلندر رہی کے حزار پر لوگوں کے دل زار زار روتے ہیں۔ اس مرید سے ان کے زیادہ عقیدت مند ہیں۔ ان کے ساتھ حکومت والوں کی زیادتیوں اور زبردستیوں کا بدلہ کون لے گا۔ مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ مگر میرے آنسو شاید قلندر رہی سے روٹنے ہوئے تھے۔ میرے اندر کون تھا جو قلندر رہی کو اس کے باوجود ماننا چاہتا تھا۔ میری بے بسی اور بے چینی نے میرے دل میں امیر خسرو کا کلام یاد کر کے رقص آغاز کیا یہی تھا کہ رسیٹی جی اور میں دوڑ کر گاڑی میں سوار ہوا۔ اپنی اپنی پٹیاں کیلئے پٹیاں کو حزار پر پانچنے کیلئے چھوڑ آ گیا ہوں۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ تاپنے اور ترپنے میں کیا فرق ہے۔ کچھ ہے بھی یا نہیں۔ کوئی کسی کی طرح نہ ترپ سکتا ہے نہ تاج سکتا ہے۔ دیکھنے والوں کو ترپ نہیں چاہی۔ وہ کیلئے نہیں چاہیں۔

باز گیسراں عامل بدگوہرے

دور بچشم ملک تواد گیسرے (اقبال)

عالم کی سعادت ہے تو یہ نظام ہی کا بھی افتخار ہو گا۔ خسرو کی کو تہیقہ ہو گا۔ حالی اگر چاہتا تو بدشاہ عالمین
سکاقتا ہر مدت میں مارا گیا وہ تھوڑا سا دوا عطا تھوڑا سا شاعر تھوڑا سا ادیب تھوڑا سا مولوی تھا۔ یہ تھوڑا تھوڑا مل
پڑا میں رہتا۔ کوئی گفتگو زیادہ دیر اس کے وجود میں نہ ٹھہر سکی۔ زندگی میں ایک بڑا فیصلہ اس نے کیا مگر پھر
اس فیصلے میں کئی دوسرے فیصلوں کو نہ جان کا۔ اپنی شادی والی رات گھر سے بھاگ کر غالب کے پاس
وہی پہنچا وہاں بھی گزارہ نہ کر سکا اور ایسی ہی کسی رات سرسید احمد خان کے پاس چلی گزرتا چاہتا وہاں سے
بھی بھاگ نکلتا تو شاید۔ شاید اس لئے کہ سرسید کی داؤدھی رست گھٹی اور لمبی تھی حالی کا یہ نکال ہے کہ وہ
قوم کیلئے قربان ہوا۔

گازی رک کر چل پڑی تھی رک رک کر چل رہی تھی اور میں حالی کی نظم ”اے خاصہ
نہمان رسل وقت دعا ہے“ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس وقت حالی کو یاد کرنے کا اصلی قریب یہی تھا
مگر وہ نظم مجھے بھول گئی تھی ہم سب کو بھول گئی ہے شاید یہیں تو یہ بھی احساس نہیں کہ یہ کونسی دعا کا وقت
ہے۔

امت پر قری آئے عجب وقت بڑا ہے

لگتا ہے جیسے پانی پت کی ساری لڑائیاں جیت کر ہم بار گئے ہیں مگر آخری جیت ہماری ہوگی۔ وہ جیت
ہم سب کی ہوگی۔ بارے والوں کی بھی۔ دنیا میں وہ لڑائی کب ہوگی جس میں لڑنے والے سارے جیت
جائیں گے اور کوئی نہیں ہارے گا۔

پانی پت کی چوتھی لڑائی

کسی وقت سال پانی پت کی پہلی دوسری
اور تیسری جنگ لڑی جا رہی تھی۔ یہاں چوتھی جنگ بھی لڑی جا رہی تھی اس کیلئے میدان جنگ کی ضرورت
نہ ہو۔ وہ جنگ گاڑی میں جیسے ہونے لگی تھی اور لڑی جا رہی ہے البتہ سرو جنگیں روکنے کیلئے
باقاعدہ جنگ ضروری ہے یہ نقصان اس نقصان سے کم تو نہیں۔ پہلے جنگ کو لڑائی کہا جاتا تھا۔ تب دل
والے لڑتے تھے۔ اب دماغ والے لڑ رہے ہیں۔ لوگ ہمارے تھے طاقتور اور دانا اب صرف چالاک ہیں
سیاستدان اور خوفزدہ۔ دل ٹھک ہو گئے ہیں اور مجلسوں کیلئے بھی میدان باقی نہیں رہے۔ شہروں میں
دیواروں اور سڑکوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آئیٹوریم اور بال کتیا بڑا ہو سکتا ہے آخر۔ یعنی یہ حال ہو گیا ہے
ہمارا۔

پانی پت کے رہنے والے ایک ادیب شیخ محمد اسماعیل نے لکھا ہے کہ ایک عظیم الشان معرکہ قدیم و
جدید شاعری کے درمیان اسی میدان میں ہوا تھا۔ پانی پت کی ۱۶۷۱ء کی لڑائی میں ۵ لاکھ مرہٹوں کے
مقابلے میں جیتنے والے احمد شاہ ابدالی کیساتھ صرف ۷۶ ہزار سپاہی تھے مگر حالی اس میدان جنگ میں اکیلا تھا
اس کے مقابلے میں ہندوستان بھر کے شہر اڑنے ہوئے تھے۔ حالی ایک زندہ رہ جانے والی فتح سے ہمتدار
ہوا اور مجددِ علم کا خطاب پایا۔ حالی کی بلند شان کا اعتراف اس سے زیادہ ہو سکتا ہے کہ جب ایک مرتبہ
انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں دو ہجرت سال کی وجہ سے اپنی نظم خود نہ سنا سکے تو علامہ اقبال ان
کا کام اہتمام قوم تک پہنچانے کیلئے کڑے ہوئے اور حالی کی نظم سے پہلے خودی البدر میر یہ رباعی کہہ کر
سنائی

مشہور زمانہ میں ہے جامِ حالی معہور سے حق ہے جامِ حالی
میں عشو شہر کا مین ہوں گویا نازل ہے سرے لب پہ کلامِ حالی

اقبال نے خود ادب کے نقادوں کی اس بات کی تصدیق کر دی کہ اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ
ہوتے۔ اقبال شاعر پاکستان ہیں تو چرچا ہے کہ ان کی باتوں کا فیصلہ حالی نے پانی پت کے میدان میں کر
دیا تھا۔ ہمارے ”نالائق“ غالباً علمِ احمقانی پرچوں میں یہ جیتے ہیں تو کبھی ہی لکھتے ہیں کہ حقیقی پانی پت کے
میدان میں میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ درد مند اور دیانتدار شاعر قلند رہی کے مزار کے احاطے میں سو پناہ واپس۔
یہ یقیناً قلند رہی کا بھی اعزاز ہے۔ جس طرح وہی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے احاطے میں دفن ہونا

سکھ کا ڈ

دوسرے کو نہ جانتے ہوں مگر ہم سفر تو ہوتے ہیں اور ہم سفر لوگ کچھ کچھ ہموطن بھی ہوتے ہیں۔ شریا پاکستان کے حالات سننے کا جلیقہ ہے خواہیں منہ تھا۔ اس وقت بھی اس کی خواہش تھی کہ ہم اس کے ساتھ باتیں کریں اس نے ہمیں کہا کہ سردار صاحب نے بہت سے لطیفہ خواہ خواہ کالم لکھائے کیلئے بنا دیئے ہیں۔ ان کا بہت مناسب اس سے پہلے کہ ہم کہنے کے ہم نے بالکل برا نہیں مانا سردار صاحب نے کہا "اوسے ہندو قوم لوگ مسلمانوں کے پاکستانیوں کے کب سے خیر خواہ رہے ہو یہاری لڑائی اور دوستی کھلی دلی ہوگی تم تو ہمارے دوست نہیں ہوئے ہموطن ہوتے ہوئے بھی تمہارے ہموطن صرف ہندو ہیں۔ تمہارے پنجاب میں ہر ہندواری ماں بولی بھی پنجابی ہے جبہ اے شہری ہوتی ہے تو زبان کے خانے میں ہندی لکھتے ہو۔"

سردار صاحب سنجیدہ تھا کہ ایک اور ہندو جو اچھا خاصا سکھ لنگ رہا تھا بحث میں دھرم سے گرا لب سردار اس سے مخاطب تھا "تم نے تمہارے ہندوؤں نے ہمیں مسلمانوں سے لڑوا یا تھا۔ قیام پاکستان کے وقت اب بھی ایسا موقع آیا تو ہم تمہارے کہنے میں نہ آئیں گے یہ تو ہماری خاصیت تھی کہ ہماری ہندو پیدا کر رہے ہیں" "یعنی ہماری وہ ہندو بولا

"تمہارے لہندوؤں کی انہوں نے پہلے ہمارے پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا تین پنجاب ہوائے اب کہتے ہیں یہ نچھاسا پنجاب لے کر کیا کر دے گا اور پنجاب بھی تمہیں لے کے دیں گے۔ مسلمانوں کا کلب تو عربوں کے پاس ہے تمہارے یہ پاکستانیوں نے فتح کر رکھا ہے تم تحریک چلائے رکھو" "مختلگہ تقریریں بن گئی تھیں ایسے میں سداے ہندو خاموش ہو گئے تھے۔ صرف شرمائی بولا "تو کمبھوں کی تحریک ہندو چلا رہے ہیں"

"تحریک ہم سے چلائی جا رہی ہے ہر طرح مسلمانوں کو ہم سے قتل کروا دیا گیا تھا" "تم نہ کرو قتل تمہارے نزدیک قتل نہ ہو اور لطیفہ سنانیک جیسا مل جبر اب ہم ہندوؤں میں تو یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو خود قتل کر سکتے ہیں۔ مگر ہم نہیں کر سکتے کیا" "تم ایسا کرتے رہے ہو مگر نسلی بڑی ہندو سے کہو میں ہے تم اقلیتوں کو آپس میں لڑا بھڑا کر جنگ کا شوق اور مقصد دو زبان پر اکرنا چاہتے ہو نہ پاکستان رہے نہ خالفتان سے لازم کر مگر جیسا سب ایک ایک بزرگ ہندو سر دے لیے میں بولا

"سردارو۔ اب سردار امرا درجنل ضیا الحق ہے۔ یہ صدر پاکستان ہے تو ہمیں معصیت میں ڈالے رکھے گا۔ اب سکھ کا روایک ہتھیار ہے۔ افغانستان میں اسلامی حکومت کے ہمانے کے روس کو اور پنجاب میں آزاد خالفتان کے نعرے سے بھارت کو ذلیل و خوار کر رہا ہے۔ وہ انہی رستوں سے کشمیر بھی پیچھے گا۔ اس کے خیال میں پاکستان مسلمانوں کے عالمی کردار کی علامت ہے وہ پاکستان کوڑے کا بدلہ ضرور لے گا"

"تو پھر ہمارا جاپنے ایجنٹ اور فوجی بھیج کر کیوں توڑا تم نے پاکستان"

چلتی کلام گاڑی ہے اور ایک سردار صاحب گاڑی کے لیٹ ہو جانے کی شکایت کر رہا تھا۔ اب ہمیشہ لیٹ ہو جانے والی سواری کلام گاڑی ہے۔ ہمارے میاں والی سے آنے والی اکلوتی گاڑی مڈی انداز ایک روز میں وقت پر لاہور شیش پر پہنچی تو اترافتنی جی جی لوگ مارے حیرت کے پریشان تھے۔ ان کی پریشانی جلد ہی رفع ہو گئی جب سے چلا کہ موصوفہ چارے چو میں تھکے لیٹ ہے شاید اس لئے سردار صاحب اپنی سیٹ پر تقریباً کیا ہوا تھا میں نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ لیٹ کئی دن سے اگر اسے غلامی آتی ہو تو وہ ضرور کہتا "ہندو دلی دور است" کیونکہ اب سردار صاحب نے سیٹ سے ہٹ کر مارے کا کام لینا شروع کر دیا تھا "ابھی نہیں۔ دلی سے پہلے گند انالہ آئے گا"

سردار صاحب نے اس انداز میں کہا کہ مجھے وہ اس گندے ٹالے میں فاسے لطیفہ دی نہیں جائے گا۔ ایک سردار صاحب دفتر جانے گئے تو یہی سے کہہ کہ پانچواں گندالہ (انزار بند) گندالہ ہے۔ یہی نے کہا کہ آج اس کے ساتھ چلے جاؤ کل پانچواں بدل لینا تو لہ بھی بدل دیں گی۔ سردار صاحب بے گئے اور اس دن دفتر سے گھر لوٹنے میں دیر کر دی۔ جب پانچوے کا پینے پہنچے تو یہی نے پوچھا "کیا لیا ہے تمہارے گندے گندے گندے"

سردار صاحب نے کہا یہی دور سے پیدل چل کر آ رہا ہوں۔ ابھی بس آدھے رستے پر تھی کہ ایک شاپ پر گندے گندے کا چلو بھی گندے ٹالے والے انہی میں آئے "دور چلا ہوا آ رہا ہوں مگر لوگ اور بھی اترے۔ انہیں بھی دیوایاں پانچواں میں صاف ٹالہ نہ ڈال کر دیتی ہوں کی لیکن مجھے گندے گندے کو کیسے یہ چلا کر میرے پانچواں میں بھی گندالہ ہے۔

تو سردار صاحب آپ ابھی گندے ٹالے پر اترتے جائیں کہیں سردار صاحب کا قہقہہ گاڑی سے باہر تک پھیل گیا۔ پھر اس کے بعد اس نے وہ سارے لطیفے اور ہم سکھوں کے ذمے لگا کر بٹھرتے رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے مسلمانوں کے نام سے سناٹے۔ پاکستانی مسلمان۔ بھارتی مسلمان تو اب یہ لطیفہ ہیں جس کے بعد فوجی نہیں آتی۔ ایک اور آوی جس کے قہقہے ہمارے ہم سفر بن گئے۔ وہ شریا تھا انہیں پوچھیں۔ مذہب انداز میں بات کرنے والا۔ دوست فطرت آدمی بھارت اور پاکستان کی پولیس میں تو خاص فرق نہیں۔ اچھے لوگ اس جگہ میں دونوں طرف کم کم ہیں۔ اس نے پاکستان کے بارے میں بہت سی لطیفہ بھری اپنا نیت سے پانچواں میں وہ چاہتا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے تعلقات اس طرح ہو جائیں جس طرح ہم تینوں کا وہ دوستانہ اور امیر ہوا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک

سرور بدستور جذباتی تھا۔

"پاکستان خود نہیں رہنا چاہتا تھا ایک"

ایک ہندو نے ہماری طرف دیکھے بغیر کما شرماتی شرما گیا کہنے لگا

”اب تو پاکستان ہماری ضرورت ہے“ افغانستان روس کی ریاست بن گیا ہے تو عربیہ اب پاکستان ایک بفر شیت ہو گا“

”پاکستان ہمیں بفرٹیٹ خالصتان ہو گا“ سردار نے پھر تقریر آغاز کی۔

"خالستان بفریٹ نہیں بفریٹ ہو گا" ہندو نے جملہ مارا۔

مرد اور خاتون میں بھی اپنی ہی مضبوط کر سکا اور پورے ڈبے میں تھمتھے کودنے لگے۔ میں نے ان کی ہنسی دیکھنے سے پہلے کہا

”بلکہ دیش بھی ڈی ٹیٹ ہی ہے بلکہ دیشیوں سے پوچھ کر دیکھو پاکستانی نہیں رہے مگر بل
نہیں بن سکے۔ معاف کیجئے اندران کی ہمدردی تو اپنا بل بھی ان کو دے دیجی۔ مگر یہ پنجاب سے پہلے
مگر یہ بل، جنہ“

"آپ یہ بتائیں" ایک ہندو نے مجھ سے پوچھا

”پاکستان اور اسرائیل کے قیام میں کیا فرق ہے؟“

”وہی جو پاکستان اور بنگلہ دیش کے قیام میں ہے لیکن خالصتان اور پاکستان کے قیام میں کوئی فرق نہ ہو گا“

مردار کی اس بات پر سارے ہندو جیسے جاگ پڑے اور میں سو گیا ایک فوری فکر میں کہ آخر اسرائیل اور پاکستان کے قیام سے وجہ اشتراک تلاش کرنے کی ہندوؤں کو تادم کے اس مضمون کی ضرورت آن پڑی ہے یا نہیں سوچے گئے ہندوؤں کے خلاف ہوں نہ ہندوؤں کے۔ یہودی اہل کتاب ہیں ہندو بھی اہل کتاب سمجھے گئے ہیں خود کہ وہ مقدس اس کی مذہبی کتاب ہے۔ یوں بھی کہی جاتی اور ان کتابیں ہوں گی مگر ہم نہیں جانتے یہ وہاں اور ہندو دونوں ہم قافیہ ہیں ان میں کئی ایسے "ہم" مشترک ہیں دونوں بھاردی کے قابل بھی ہیں۔

پوری دنیا میں یہودیوں کا کل عالم ہولود کہہ کر ارض پر کہاں کہاں دھکڑے نہیں گئے۔ وہ مسافر ہوئے، عمارت ہوئے، ہندوؤں پر بھی یہودیوں کے دواج سانج کا کذاب قاتم۔ ہاں، اپنے شرلوں اپنے گھروں میں ان کی حیثیت مسافر صاحبزے کے کہتی تھی۔ اس استحصال نے ان دونوں قوموں میں نفرت ظلم اور انتقام کا جذبہ ٹھوک ٹھوک کر بھر دیا۔ وہ ظالم ہو گئے مگر کیا اس کیلئے بے جواز کافی ہے کہ وہ بھی مظلوم تھے۔ مسلمان اس وقت دنیا کی مظلوم ترین قوم ہیں یہودی ہیں پیدا ہوا ہے کہ پاکستان نے بھارت کو تسلیم کر رکھا ہے تو اسرائیل کو تسلیم کرنے میں کیا الجھی ہے۔ ہندوؤں اور بھارتیوں میں جو فرق ہے وہی یہودیوں اور مسلمانوں میں ہوگا۔ اب مسلمانوں اور پاکستانوں میں بھی یہی فرق ہے۔

شملہ معاہدے کا راز

ہندو سکھ فسادات کا نظریہ پیدا ہوا چلا گاری میں اگر شرمیلی نہ ہوتا تو اسے ایسا نہیں ہوا ہوتا نہ کہا جاتا کہ وہ پاکستانیوں نے پہلی گاری میں ہندوؤں اور سکھوں کو فساد کرادیا۔ ہمیں تخریب کار بنا کر بچا لیا جاتا دیکھئے بھالے میں ہم ”تخریب کاروں“ کے دشتہ وار لکھتے تھے۔ میں دیکھنے میں ”عاطفانے میں۔ ہندو لیڈروں کو افغانستان تحریک میں پاکستان کی مداخلت کا ٹیکہ اور ثبوت مل جاتا ہے لیڈر ہندو مسلم فسادات کو فسادات سمجھتے ہیں نہیں۔ اب ہندو سکھ فسادات ہوئے ہیں اور ہوئے پہلے جابر ہے تو وہ پوچھنا ہوتا ہے۔ پاکستان کو پریشان کرنے کا ٹیکہ نہ ایک ممتاز انداز کے بائیں ہاتھ میں بائیں کارایاں ہاتھ روس کے بائیں ہاتھ میں ہوتا تھا ہمیشہ ”بڑی کافر سیاستدان“ جسکی ہم سیاستدان بھی نہ تھے۔ کیا ہاتھ دکھا دیوے کو اور ایک سے بھی ہاتھ کر سکتی۔ سردار گاندھی افسوس ہو گئے اس کے سیاسی ترقی میں۔

پاکستان میں انکھٹوں اسے گاندھی جی کی پوری سمجھ رہے اور کسی گاندھی کو کون جانتا ہے۔ بھارت میں
مگر یہ جانتے ہوں گے اندرا گاندھی کسی کچھ ماننے کو تیار نہیں ہوئی۔ کافر کا مطلب انکار کرنے والا ہے
لیکن یہ ذرا مفہوم نہیں ہے اس سے بہت کچھ منسوب کیا تھا۔ شاہ شہل معاہدہ میں کچھ طے نہیں
ہو رہا تھا اور اندرا بھٹو سبلی ملاقات ہوئی اور معاہدہ ہو گیا۔ بھٹو پاکستان آکر اسے اپنی جیت کتابا۔ اندرا
گاندھی بھارت والوں کو تالی دی کہ اس نے پاکستان کے جرنیلوں کو سیدھا میں اور پاکستانی سیاست دانوں کو
بازرگشت دی ہے۔ جرنیلوں کو شکست دینے کیلئے بھی اس نے میدان کو میز پر کرا اپنے سامنے رکھا یا
تھا۔ بھٹو بھی بلا کہ سیاست دان تھا اس نے اپنی کھلی تقریروں میں میز کو ہنسنے کے دکھا دی اور کچھ یوں نقشہ کھینچا
کہ سب کی اور ہم بھرتی ہوئی کوئی فرق نہ رہا۔

مسلمان تو ان بھی روپ چاکر انگریزوں سے صد سال غلامی کا دل لیتے رہتے ہیں۔ وہ ہنسنی اس
تہ سے اسے خوش ہوئے کہ تصویر حاصل کر کے بھی کیا ہوں گے۔ مشرقی پاکستان کا حساب بھی پورا ہو
گیا۔ یہ لوگوں نے اس واقعے کے ایسے طو پر نہت باؤں باؤں میں چلائے کہ اندر کا اندھ نہ خود
کئے کوئی چاہا۔ کیا ہو انور احمد اجیت مکی۔ یہ بہ طور مکی کی ناکامی سے بڑی کامیابی ہے۔ اس صدمہ وہ
ہمارے مکتی قیدیوں کو بھی واپس نہ بھیجی تو ہم مانڈو نہ کرتے۔ بات چیت کو بھی آخر ہینو نہ بدلتے سے
یہ سزاوار سال لڑتے رہنے کا ملانہ کیا تھا اور اندر کا گوش میں ملتی اندر آ گیا۔ یہ تو جیسے کھلا کہ یہ ملتی پنجابی
الکس انگریزی والہ تھا۔ محض صاحب کے خیال میں یہ یعنی او میری اندر کا گمنام۔ یہ سیاست دان بھی عجیب
کے ہیں۔ نہتے ہیں تو اور سیاست دان ہو جاتے ہیں اندر سے دوستی تھی اندر اور ہنسنی ہیں عورت اور مرد

دل سے دلی، ہول سے ہولی

ایک غیب جہنم تھا کہ مجھے ہر شخص شام سانسوں ہوا اور ہر آدمی اپنی نگاہ شرمیلی شیش پر اس طرح ملا مجھے ہمارے استقبال کیلئے آیا ہو۔ ہم نے اس سے کہا "یار تم تو پس مراد میں مارے گئے۔ اب بھی تمہارا انتظار کر رہی ہو اور تم؟"

"لیکن آپ کا تو یہاں کوئی بھی انتظار نہ کر رہا ہوگا۔"

"انتظار تو جانے والوں کو ہوتا ہے شرمیلی جہنم تو ابھی آئے ہی نہیں"

میں اسے کیسے بتاؤں کہ دلی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ باہر سے جو بھی جس طرف سے ہندوستان میں داخل ہوا سیدہ حادی پہنچا۔ دلی کے بہت سے انداز دل کے تھے ہیں۔ شرم تو اور بھی اجڑے۔ اجڑے رہتے ہیں۔ دلی کے لئے کی کیفیت تیسری ہے۔ زمانے کو بھی اسے اجازت کے مزا آیا۔ اس کا جڑ کر پھر ہر سانس ہی یاد رو جانے والی واردات ہے۔ دلی جب بھی اجڑتی پہلے سے بڑھ کر آباد ہوتی۔ دلی اب پھر اجڑنے کی تمنا میں جھٹا نظر آتی ہے۔ دلی میں پسلا سانس پیتے ہی میرے دل میں تاریں غما میں غما میں گزرتے گئی۔ شیش پر بنگلے سے ٹٹک ہوا کہ یہ لوگ دلی پر حملہ تو نہیں کرنے والے۔ یا یہ کوئی بھانٹے دانوں کی فراغت ہی ہے۔ اس شر کے لئے بڑی بڑی دوسری کی وصولی میں اڑتے تھے۔

"دلی میں دو تین ہفتے تو رہیں گے آپ لوگ"

شرمیلی نے گرد آلود سوال کو جھڑا

جناپ نام تو یہاں دو تین صدیاں رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہاں جو آیا اس کا ہلنے کو کب تک چاہا۔ جو بھی گیا نکالا گیا۔ اس ضمن میں ہاڑ شاہوں، شاعروں اور عام آدمیوں کا ایک جیسا حال رہا۔ دلی سے جان بچا کر بھاگنے میں بھی حوا آتا ہے اور یہاں جان کی بازی لگانے میں بھی۔ شرمیلی راکش والے سے مناظرہ کر رہا تھا۔ تو میں کس سے مخاطب تھا۔ یہ دلی میں لمحہ لمحہ گہری ہوتی زوری کسی رات سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ہم ایک گمشدہ فضا میں ہوش کی حاشی میں کسی جانب لٹھے۔ ایک سنان دلی ہماری میدان بن رہی تھی۔ دو تین ہفتوں میں دو دو تین گھنٹوں کے قیام کے بعد رکشائیت لپی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ مگر کوئی دوسرا دوڑنے والا دور دور تک نہ تھا۔ لوگ کس بات سے گھروں میں دیکھ پڑے تھے۔ مونہ میں گھر دیکھتے بھارت میں کم ہیں۔ یہ آدمیوں کو کیا ہوا۔ روشنیوں کو کیا ہوا۔

ہم کو ال باغ میں راج دیپ ہوئے چاہیے۔ سدان ایک ٹھیک خاک کمرے میں رکھا گیا۔ عطا ایسے خد ہوش میں ٹھہرا چاہتا تھا۔ جہاں سکون ہو اور فن بھی ہو۔ یعنی دونوں یک وقت۔ عطا کے گھر میں یہ

نوا سہ سہ ان "ہوں ان کی دوستی سیکھتے ہیں ان کمرے یا سٹیشنل پیدائش کمرے تو لوگوں کو حرا ہی نہیں آتا۔ مجھ کو صاحب کے کمرے کے بعد اندر لگی ہے قاریاں قابل غور تھیں۔ جرنیل ضیائے اندر ان کو اپنی بڑی مہین کر۔ تو ان کی بچی بچی دشمن ہو گئی۔ جرنیل صاحب شریف آدمی ہیں انہوں نے میدان میں میز رکھنے کی ہمت نہ کی۔ نماز چھانی میدان کو مسجد بنایا۔ مسجد کو میدان کب بنایا جائیگا۔ نماز پڑھنے والے بھارت میں بھی ہیں۔ نماز قائم کرنے والے کہاں ہیں۔ کیا یہ خیال آتے ہیں نماز میں۔ نماز میں خیال آیا کہ یہ بھوت اور بھوت میں کیا فرق ہے۔ کوئی بھی وہی جس میں بھوت جانا ہے کچھ تو کھن بن کر نکلتے ہیں باقی سب راکھ ہو جا رہے۔ بھوت کے قیام حملہ کے ضمن میں استراہت میں نے ایک یاد رو جانے والی نظم کسی بھی ہو واقعی نظم کو تھا۔ اس نے خود کبھی کاغذ پر لکھا ہی نہیں تھا۔ شاید اسی نظم کے اجر میں وہ مگر قمار ہوا۔ پوری نظم وہ امن اور بھوت دونوں کے مرنے کے بعد کو نہ مانے۔ مصرعے تھے۔

کدے شعلے جاند میں تے کدے مری جاند میں

اوہ کی کری جاند میں اوہ کی کری جاند میں

سنگ نے مجھ سے پچھا کہ زینے سے شرب ہوئے والے ان دو حکمرانوں کا مختصر ترین موازنہ کیا ہو تو کہنے میں کسی نے میری طرف سے کہا کہ وہ دو ہیں تھا یہ سنا ہے۔ یہ تو آڑے ایسے لوگوں کے ہاں میں بات نہیں ہو سکتی۔ لیلیٰ ہوتے ہیں۔ قصیدے ہوتے ہیں اور مرثیہ مگر یہ خیال بڑا صافی خیر ہے کہ انہوں نے انگریزی حروف چھٹی کا آخری حرف ہے۔

ایک بکھرے گئے ہیں۔ کل جو رنگ بکھرے والے تھے وہ باتیں کریں گے۔ اور میں زیادہ دیر آگیا کس سے باتیں کرتا۔

خیر مجھے اٹھا کر چاہے تمہاں لے گئی۔ نیند ایک ملک ہے۔ جہاں ہم آجھی سے زیادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں کسی کی عمرانی نہیں۔ ایک دو تھی جس کی لذت ہمیں اپنے آپ سے بھی بگاڑ کر دیتی ہے۔ یہ جب تخت سے جو بیرونی میں کسی کو میر نہیں ہو پاتی۔ آدمی بھول جاتا ہے کہ وہ کس ملک میں ہے۔ کم لوگ ہیں جن کیلئے خیر اور بیرونی ایک عالم بن جاتا ہے۔ کتے ہیں خیر اور موت دو باتیں ہیں۔ موت تو دور ملک ہو پھر۔ آدمی نہیں کاٹے والا ہو کر مارتا ہے تو ہمیں جو جاتا ہے۔ کتے ہیں سننے والے کہ سر وہاں بھی ہے دوزخ اور رحمت کی۔ جہاں آدمی پہنچے گا حدیں تو ہیں کی ہنست اور جہنم تو یہاں بھی ہے۔ ہر ملک میں ہر شے میں ہر گھر میں ہر شخص میں۔ اس جہاں میں وہ سب جوت اس جہاں میں ہو گا۔ پھر اس جہاں کے بارے میں شک و شبہ نہیں ہے۔ جہنم سے انکار کرنے والوں نے لوں کیلئے زندگی جہنم سے بدتر کر رکھی ہے۔ ہر جہاں میں موت کے سب سے بڑے امیدوار مسلمان ہیں اور مسلمانوں کی کیلئے جہاں جہنم کی مثال بن گیا ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کے علاوہ بھی بہت لوگ دوزخ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس رات میں سے ایک ڈاکہ خواب دیکھا۔ افسوس کی بات ہے۔ یہ ہے۔ یہ زیادہ خواب۔ یہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بولی مبارک ہیں۔ شاید انہیں رنگ نہیں مل رہا۔ وہ خون کی انوسیل رہے ہیں۔ خون کے رنگ کا بدل کوئی رنگ نہیں۔ فلوں میں بھی لڑائی جھڑپ بہت اٹھتی جاتی ہے۔ وہاں جو خون بہتا نظر آتا ہے اصلی خون ہوتا ہے۔ خون برہ کر مٹی میں ملتا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت یہ یونی بہت مٹی کی تھی۔ یہ قلاب بھی مٹی کی جاری ہے۔ گلابا ہے پاکستان اب تک بہن رہا ہے۔ زمین پر نہ مٹی زمین میں سخی۔ یہ روایت بھی شاید یہی ہو کہ انسان کا خون بہتا ہے تو کسی نے کسی ملک کا خون نہ جاتا ہے۔ خون کے ایک قطرے کو مایکرو سکوپ سے دیکھیں تو اس میں کی جان نظر آتے ہیں۔ ہر جان میں کی گل و گلہرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ بھی عجیب ہے کہ حق کے رستے میں محبت کے رستے میں گرنے والے خون کا قطرہ اٹھتا ہوتا ہے۔ اس میں دیکھنے کیلئے اور طریق کی مایکرو سکوپ کی ضرورت ہے۔

میں بھی تھی اور ہم سوئے ہوئے تھے۔ بھارت میں ہم نے کم کم سنا دیکھی۔ کسی چرسے پر بھی کم خور دیکھی۔ ایک لڑکی کی آنکھوں میں اندھروں سے چھلکتی رات دیکھی پھر صبح دیکھی تھی۔ اور جب اس نے ایک دیکھا تو وہ ہر ہو چکی تھی۔ یہاں ان آنکھوں میں وقت قدی پر بندے کی طرح تھا۔ میں نے ان آنکھوں سے کوئی منظر دیکھنے کی خواہش بھی اپنے اندر دیکھی۔ کاش میں بھارت کی فضاؤں میں بکھرے والے منظر کو کسی ان آنکھوں میں ڈیکر بکیر سکتا۔ میں اس صحنہ کو اس لڑکی کی طرح اندر اور پرتو دیکھنا چاہتا ہوں اور مجھے دیکھ لینی ہی نظر نہیں آتی۔ میں یہاں بولی دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولی انگریزی میں پاک کہتے

دونوں چیزیں ہیں۔ بولنے والے شرمائی کے واقف تھے۔ ہم اوپر کی منزل میں اس سے ملنے چلے گئے۔ وہاں فکشن کا بیان تھا۔ بولنے کے مالک اور کس کا ش سوتلی کی پوتی کی سالگرہ تھی۔ اس کے پاس ایک سردار صاحب بیٹھے تھے۔ اتنے محنت مند اور دینہ تھے کہ پورا انکمران کی موجودگی سے فخر ہوا تھا۔ ایک ہندو بزرگ دو یا ساگر بھی موجود تھے جن کی بزرگی چاروں طرف بائیں بائیں کرناج رہی تھی۔ وہ یا ساگر فارسی اور اردو کے شہرانی ہیں۔ ہر دو جن تقریب کے بعد شعر پڑھتے ہیں۔ اپنے ذوق و شوق کی وارفتگی پر قابو نہیں پا رہے تھے۔ ان کا مذہبی نقطہ نظر بھی دوسرے ہندوؤں سے مختلف ہے۔ انہاں کے والے دین و تاج کی طرح یہ بھی مندر وہ سب کی ایک اور شکل ہے۔

جس کی سالگرہ تھی۔ وہ آئی ہاتھ جوڑ کر ہمیں تسکین دیا۔ اس بچی کے ہاں ایک بابر بھری واکش کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کی مصروفیت کو محسوس کیا۔ اس نے بڑھ کر اپنے راہ کے چرن چھوئے۔ دو تھکے اور اچھی لگی۔ سوتلی کی سے اپنی ساری ممانت نوازی ہم پر چھوڑ کر دی۔ وہ بڑے چھوٹی آدمی لگے۔ اس نے ہم سے کام سنا دیا۔ سردار صاحب اور وہ یا ساگر کو اور اپنے آپ کو۔ اور اسے دین کیست میں بھر لیا کہ ہم ان دو سٹوں کو پکڑ لیا کریں گے۔ ہمارے کام سے اس کی داد کا وقت زیادہ تھا۔ سوچنا ہوں کہ اب تک وہاں کس کس نے نہیں سنا ہو گا۔ انجان لوگوں کے سامنے یہ بھی موجود رہی ہوگی۔

وہی میں یہ چلی۔ ات تھی۔ اور ہمیں خیر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے فی جگہ پر ویسے بھی نیند نہیں آتی۔ نئے آدمیوں کی جھلس سے کالی شامائی مجھے بہ خود کر دیتی ہے۔ بے سادہ نہیں کرتی۔ عطائے دینمیر کی لکے اپنے اندر آتی اور ایک میری طرف پھینکی۔ پھر بھی میں اچھی طرح نہیں سو سکا۔ اگلے دن ہندوؤں کا بدوا تھا تھا۔ ہوئی۔ دھواں کے رقص کا دن۔ بڑو لوگ میں بھی لطف افسانہ کی جی عادت نہ خود ہے تو یہ بھی رقص ہوتا ہے۔ سمرتی اور بے مستی میں فرق ہے تو بھگتوں اور احوال الدنیا اور دور ٹوسٹ وائس اپنی انتظار کی ایک ہی حالت کا نام ہے۔ ٹوسٹ وائس البتہ جہے کی اس میں پھنس کر اجتماعی سرخوشی کی موج سے کٹ جاتا ہے۔ اس طرح ایک ہال میں دو دو آدمیوں کے کئی دائرے بنتے ہیں۔ اور خواہمیں سامنے والے آدمی کیلئے بھی غیر ہوتی ہیں۔ جبکہ اجتماعی رقص صرف ایک بڑے دائرے میں ہوتا ہے۔ ایک کیفیت میں جڑا ہوا ہے۔ یہ صرف افسانہ میں ہو سکتا ہے۔ اپنے میں خطوط رقص بھی ہوتے ہیں اور دور رقص ہی ہوتے ہیں۔ میں اس وقت ہوش کے ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا اور میرے ذہن میں ہونی کے متعلق میری باتیں سنا رہی تھیں۔ ایک اور اساتذہم طرف پھرا ہوا تھا۔ میں شیدو کے پودے مانند ایدہ کا قاتل نہیں ہوں۔ آفس میں ہونی بات دیکھی ہوئی تھی سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ ایمان کا فیلیپ والے مشاہدے سے زیادہ محسوس کرنے کی تپ کو قوت دیتے ہیں۔ آدمی جس کو محسوس نہ کرے۔ اس کی شکل اچھی لگتی ہے۔ منتھلو۔ آدمی اپنی آرزو کا ہم شکل ہوتا ہے۔ جب اس کی باتوں میں منظر ہوں کے

کھڑے نہیں۔ وہ تو صرف ہمسایہ ملکوں کو لاتے ہیں۔ بھارت اپنے تمام ہمسایہ ملکوں سے ہاتھ پائی کر چکا ہے۔ بھارت روس کا دوست رہنا چاہتا ہے تو اس کا ہمسایہ بننے کو کیوں بے تاب ہے۔

رکٹے والا پولیس ہیڈ کوارٹر جارہا تھا اور اسی رکٹے پر پاکستان جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تمہارے جرنیل فوجی گاڑیوں میں پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ اس نے ایک کالی سی گاڑی اپنے سکرانوں کو نکالی۔ اور راندرے لے گئے۔

”یہ اصل میں پاکستان کے نہیں بھارت کے دشمن ہیں“

اقتدار کا انکشاف ہم ایران رہ گئے۔ نہ ہم نے اس کی وضاحت چاہی اور نہ اس نے ضرورت سمجھی۔ انگریزی اخبار ہماری طرف بڑھایا۔ وہ لازماً بڑھا لکھا ہو گا۔ جو انگریزی نہ جانتا ہو ہم اسے بڑھا لکھا کتب تصور کرتے ہیں۔ اس نے خود بتایا کہ اس میں ایک بیان کے ذریعے لوگوں کو بھولی کے دن ہتھ بھولنے کی اپیلی کی گئی ہے۔ آج کے دن کسی طرح کی پیچھے پیچھا کر جو ہم قرار دیا گیا ہے۔ بعض اوقات تو بات خون خراب تک پہنچتی ہے اور فائدہ تو صرف پولیس کو ہوتا ہے۔ پولیس نقصان کے موقعوں پر زیادہ فائدہ اٹھاتی ہے۔

کچھ آگے جا کر لوگ بے جو سرا ہنگ بنے ہوئے تھے۔ جیسے انہوں نے رنگ بنے ہوئے ہوں۔ رنجیں کمانک پڑھایا ہوا ہو۔ لوگوں نے خامے مہلے سے ایک دوسرے کو رنگا ہوا تھا۔ کہتے ہیں اس طرح آدمی ایک دوسرے کو دیکھ کر محفوظ ہوتا ہے۔ ہنستا ہے۔ میں نے کہا آدمی اس طرح ڈر بھی سکتا ہے۔ ڈر کے مارے چہنچاہے تو اس کا بھی امکان ہے۔ عورتوں کیلئے تو یہ موقع ہے۔ یہ ہنسنے ہنسانے کے معنوی طریقوں سے کیا خوشی ملتی ہوگی۔ ہنسنے ہوئے لوگوں کے چہروں پر خوشی کا نام نشان نہ تھا۔ کچھ آدمیوں اور بھینٹوں میں فرق کا نام شکل تھا۔ یہ جیسے حملہ آور ہونے کی تیاری تھی۔ نعرے اور جھینیں ایک دوسرے سے متعمد گنتا تھیں۔ ہم پولیس ہیڈ کوارٹر میں جس کمرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ دفعتاً اٹھ کر اس نے نعرے لگانا شروع کر دیئے وہ اپنے کسی خدا کا لکلا لکلا کر نام لے رہا تھا۔ میں اس خدا سے متعارف نہ تھا۔ مگر اتنا محسوس ہوا تھا کہ یہ ضرور بھندوں کا کوئی خاص خدا ہے۔ اس دفتر میں بہت پاکستانی مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ یہاں صرف پاکستانی بھارتیوں سے نمٹنا پاتا ہے۔ اسرائیل سمیت تمام ملکوں کے باشندوں کیلئے وہ ہماری آسائیاں بھارت میں میسر ہیں جو بھارتیوں کیلئے نہیں۔ بھارتیوں کے لئے تو مشکلات عظیم مشکلات ہیں۔ دلی میں اسے غیر ملکی پر دقت ہوتے ہیں کہ لگتا ہے کہ دلی والے تو اس مہمان ہیں۔

اس وقت وہ کھرک ہمیں مشکل میں ڈال رہا تھا۔ وہ ڈر ڈر سے پاؤں فرش پر مار رہا تھا۔ لگ گیا۔ فزق و حکم اٹھا۔ اس اچھل کود میں فکر بچت کی پڑ گئی دو چار آدمی دفتر کے اس سے لپٹ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ دورہ کبھی کبھی اسے پڑتا ہے۔ شاید زیادہ پاکستانیوں کو دیکھ کر اس کی یہ حالت ہو جاتی ہو۔ اس آدمی کو خاص طور پر اس دفتر میں رکھنے کے اسباب تجلے کیا ہیں۔ بچوں نے وہ شروع کر دیا تھا۔ انہیں

خون سے غسل مسرت کرنے والے کبھی پاک نہیں ہو سکتے۔ گنگا جمل میں بھی ذوب نہیں تب بھی نہیں

دس بج چکے تھے اور دلی ابھی تک سولی ہوئی تھی۔ غالباً چھٹی کا دن تھا۔ تو یہ بولی ڈسٹ نہ بولہائی ڈسٹ ہو گیا۔ اب ساری دنیا میں تھوڑا سا کابھی حال ہے۔ پاکستان میں بھی اب لوگ یوم عید اور یوم قائد اعظم سو کر گزارتے ہیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تو اس رات خوشی سے نیند نہ آتی تھی جس دن عید کا موقع ہوا کرتی۔ ہم تو عید کو جلدی لانے کیلئے ایک آدھ روز بھی رکھ لیتے تھے۔ آج بھی میرے عید اسی طرح مہلتے ہوں گے۔ عید کا دن عام چھٹی کے دنوں سے بھی زیادہ پور گزارنا ہے۔ نماز عید کا پیکر نہ ہوتا تو بھی کام خراب ہوتا۔ سال بھر نماز نہ پڑھنے والے یہ نماز ضرور پڑھتے ہیں۔ بولی بھندوں کی عید ہے۔ بولی والے دن لوگ ایک دوسرے سے ٹک ملتے ہیں اور سارے گنگے پائے رہتے ہیں۔ آنکھوں میں ایک دوسرے کے رنگ مل کر چمک اٹھیں تو بس پھر بھرتی ہائیں کریں ہاتھ سے خوشبو آئے۔ برسوں پرانی خاندانیاں جاتی رہتی ہیں۔ نمازی عید پر بھی کچھ ہوتا ہے۔ روزوں والی عید۔ بکروں والی عید پر خون خوں ہوتا ہے۔ ہر طرف شرمیں۔ یہ بھندوں کی بولی کی یاد دلاتا ہے۔ جو تھوڑی بہت خوشی دیتی رہی ہے۔ روزوں والی عید کی رہی ہے۔ گنگے یا بے لوگ عید سے پہلے پہلے روٹی بولی بیویوں کو مٹا لیتے ہیں۔ جب عید کا دن چڑھ آئے تو چھ ماہی عمر مضبو ہونے کے مکانات پر تھم جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست کی بیوی بڑی دیر سے روٹی بھیجی ہے اس کی ایک عید کیلئے میں گزر گئی تھی۔ میں اس سے کئی وقفہ ملا ہوں۔ اس کی طبیعت میں روٹنے والی کوئی کیفیت نہیں۔ عیدیں آتی ہیں گزر جاتی ہیں۔ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ ہم سب روٹنے ہوئے ہیں۔ یہ نہی کسی کسی سے۔ ہمارے تمام دن اور عید کے دن میں کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ لوگ کیسے ہوں گے جن کیلئے ہر روز روز عید ہے۔

ہم پولیس ہیڈ کوارٹر نہ جانے کیلئے کمرے میں بیٹھے اور رستے میں بولی کی تلاش بھی شروع کی۔ سڑکیں دیر ان تھیں اور دلی چپ تھی۔ دو ایک بھنگوں پر بے فکرے فوجیوں کی فلیاں نظر آئیں۔ یہ معمول کی کارروائی تھی۔ آوازیں کیلئے کسی دن کی شراب تو نہیں۔ اسے میں کچھ بچوں میں سے ایک نے رنگ کا دائرہ ہاتھ میں اس طرح پھینکا کہ وہ رستے کے دروازے سے پسمانی گزر کر میری گردن پر بہت ہو گیا۔ رستے والے نے اسی رفتار سے لاکے کی طرف کان بھیجی جو ہاتھ اس کے گالوں پر لگی۔ ہنستا پیچہ پکی بولی روٹی کی طرح سرخ ہو گیا۔ گرد و کشا اڑاؤ۔ کے بے رنگ جواب سے واپس ہوا تھا۔ ایک اور گولہ دوسری طرف پھینکا اور ہانک گیا۔ رستے والے نے ہم سے معذرت کی جیسے یہ کوئی پاک بھارت کی جنگ کا آغاز ہو۔ کچھ لوگ آکر پاک بھارت کی جنگوں کی وجہ سے شرمندہ تھے۔ معاف مانگتے تھے۔ اور بھارتی حکومت کو برا بھلا کہتے تھے۔ چند ایک پاک بھارت دونوں حکومتوں کو شہر لگے۔ شاید بھارت کا عام آدمی پاکستان سے لڑائی میں جانتا۔ کچھ خاص لوگ حکومت کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ بلکہ اس کی نہیں میں نہیں ملاتے ہیں۔ لڑائی جب ہوئی عربوں اور ہمسایوں کے درمیان ہوئی۔ روس اور امریکہ آپس میں کہتے دشمن ہیں

میں اور۔ قہم لاپہ جون۔ اس نے کانڈات المٹ پلٹ کر دیکھے پھر ہمیں اذہر اذہر سے دیکھا اور بہت آسانی کے سے انداز میں کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا پانچ سال ہے“ اور تم سے تم کہتی ہے۔

میں نے اسی انداز میں پوچھا۔

شاید اسے اپنی ہنسی پر قابو پانے میں مشکل پیش کی۔ وہ ذرا آسان ہوا۔ ہم اسے تھانے کی کوشش کرنے لگے کہ ہم بھارت میں کس غرض سے آئے ہیں۔ اور یہ ہماری لفظی نہیں۔ ہمیں کیا معلوم کہ آپ لوگ ہمارے کانڈوں پر کیا کیا مہرین لگا رہے ہو اور کیا کیا مہرین نہیں لگا رہے۔ خاتون کلرک نے آکر ہماری طرف ناقابل قسم اداس دیکھتے ہوئے بیٹھ کر کہ سے پوچھ کر کہا۔ کچھ تو کہا ہو گا۔ اس نے ہماری لئے عام معافی کا اعلان کیا۔

”آپ کو اس وجہ سے چھوڑا جا رہا ہے کہ آج ہوئی کا دن ہے اور آپ ہمارے مہمان ہیں۔“ آج ہوئی کی عادت کا علم ہوا۔ ہمیں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم شکر یہ کس کا اور کریں۔ خاتون کلرک کا بیٹھ کر کہ کا۔ دیوی گاڈیو کا۔ موٹ خدا کا بیٹھ کر خدا کا۔ زیادہ کس کا۔

چپ کراتے کراتے عورتیں بھی روئے نکلیں۔ یہ بندو بید واقعی پاگل تھا۔ اسے قبضہ کرنے والے نے زیادہ بچا اور گاڑی کر رہے تھے۔

ایک آدمی پاگل خانے کے سامنے اپنی کار کا ہیسبہ تبدیل کر رہا تھا کہ اس سے فٹ میں سے ہمارے تھے۔ بہت پریشان تھا۔ ایک پاگل نے سلاخوں کے پیچھے سے آواز دی۔ ہتی میں ہیسبہ کا بیٹھ گیا۔ آواز نہ کرتے تھے۔ میں فٹ کر لو۔ کام چلاؤ۔ پھر چار فٹ لے کر چارواں ہیسبہ میں پورے کر لیا۔ اور والارٹ میں آکر ہوا۔ بولا۔ تم اچھے پاگل ہو۔ یہاں کس خوش میں آئے ہو۔ پاگل نے کامیاب پاگل ہیں۔ یہ وقت نہیں۔ یہ واقعہ مجھے کیوں یاد آیا۔ شاید پاگل اور بے وقوف میں بہت فرق ہے مگر کلرک کلرک ہی ہوتا ہے۔ پاگل ہو بے وقوف ہو یا جو اور ہو۔ ہندو ہو، مسلمان ہو، عورت بھی کلرک ہو تو وہ بھی صرف کلرک ہوتی ہے۔ بھارت میں کلرک عورتوں کی انجمن بھی تھا وہ ہے۔ انگریز عورتوں پر کلرکوں کا گماں ہوا۔ ورکنگ لیڈی سے زیادہ بے کار چیز میں نے وہاں نہیں دیکھی۔ کار میں چھپی ہوئی بھی بے کار۔ ہفتہ بار ورکنگ لیڈی کی شان اور ہے۔ کار میں ہو تو اور کار آمد۔ ہمارے کانڈات کھریچہ مری کھرا کر کے ساتھ ایک کلرک سے دوسرے کلرک کی طرف جانے لگے۔ ایک خاتون کلرک کے بہت زیادہ غور و فکر کے دوران ہم نے پوچھا جی پتہ کیا ہے۔

”پتہ یہ ہے کہ آپ غیر قانونی طور پر یہاں موجود ہیں۔ آپ انہالے سے تو چلے نہیں دی کیسے بچ گئے۔“

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک ساتھ باہل خواست خاتون کی طرف دیکھا۔ شاید وہ ہمارے ساتھ بے تکلفی کے سوا میں تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ تھا جس کے ساتھ ”بے“ لگایا جاسکے اس کے ساتھ مخاطب ہونے کیلئے بھالی والی ”تی“ بھی نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اس وقت تو بالکل نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ ”بے“ دو دفعہ لگایا جاسکتا تھا اس کیلئے اس عمر میں بھی۔ ”بے بے“۔ وہ بولی یا سے بولنا پڑا۔

”آپ کے کانڈات میں انہالے سے روانگی کی مر میں ہے“

”یہ مہرٹ لگائے والوں کا قصہ ہے۔ اس کی سزا ہمیں کیوں ملے۔ ہم نے انہالے سے آتے ہوئے کانڈات دفتر والوں کو دیئے تھے۔ انہوں نے مر میں لگائی تو کیا ہم اس سے لڑتے۔ یا آپ سے ہم لڑ سکتے ہیں“

اس خاتون نے ہمارے طلبہ لکھنوں سے ہمیں دیکھا اور بیٹھ کر کہ کی طرف ہمارے کانڈات بھجا دیئے۔ ہمیں کانڈوں کے پیچھے بھیج دیا۔ تب ہمیں بھارتی خاتون اور بھارتی قانون ایک جیسے خوفناک لگے۔ بیٹھ کر کہ نے ہمیں دیوں دیکھا جیسے ہم مسافرت ہوں۔ حملہ آور ہوں۔ حملہ آور بھی مسافر ہی ہوتے ہیں۔ یہ جو کلرک ہیں اس کے ذہنوں پر اللہ نے ایک ہی مہر لگا رکھی ہے۔ پاکستان میں جو بھارت میں یا

کعبے میں گاڑھو برہمن کو

وہاں پولیس کی وردی میں سکھ اور ہندو کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ ہم نے سوچا شاید یہ ہمارے لئے وارنٹ گرفتاری لائے ہیں۔ مگر یہ وارنٹ ہمارے سوٹ کیسوں میں کیسے پہنچ گیا تھا۔ کسی بارودی سے ہم نے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پاکستانی کی حیثیت سے بھارت آنا کوئی جرم تھا شاید۔ پاکستان میں کسی بھارتی کا آگیا جرم نہیں۔ ہم جو بھارت کے مسلمان بلکہ مسلمان خصوصاً بنے ہوئے تھے۔ چچا کے بڑے الف کے بد معاشر بن گئے۔ پلیسوں کو معلوم نہ تھا کہ ہمارے کانڈزات میں نیکی نیکل لٹھی ہے۔ ورنہ وہ ہمیں لے جا کر حالات میں بند کر دیتے۔ میں نے سمجھا تھا کہ پاکستان اور بھارت کی پولیس ایک شے ہے۔ میں نے غلط سمجھا تھا۔

جدید ذرائع کے بہت فائدے ہیں اس لئے فائدہ کہ ہمیں نقصانات کا خیال ہی نہیں رہا۔ جس چیز سے بہت فائدہ ہوتا ہے کچھ نقصان بھی ہوتا ہے۔ جنھیں ٹون کیا جا رہا تھا ممکن ہے وہ پرانی دلی سے نئی دلی سے چلے گئے ہوں۔ یقیناً ایسا ہوا ہو گا۔ کوئی نئی دلی سے پرانی دلی تو چاہے نہیں رہے گا۔ اس طرح کسی ہوا نہیں کسی دلی میں ہوا ہو تو وہ کیا شخص ہو گا۔ اس سے ملنا چاہیے۔ میرے چہرے پر اطمینان کا غبار دیکھ کر عطار پڑاں ہو گیا۔ اس نے فون چھوڑ دیا اور مجھ سے اطمینان کا راز معلوم کرنے لگا۔ جب میں نے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ اور پڑاں ہو گیا۔ وہ اس عالم میں پڑاں تنگی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی خوشحال تنگ کی طرح بھی نظر آتا ہے۔ دونوں تنگ پشتو شاعری 'خوبصورتی اور بھادری میں کیساں کمال رکھتے ہیں۔'

کچھ صورتوں میں اکیلا آدمی زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ ورنہ دو آدمی مل کر کسی بھی مشکل میں گزارا کر سکتے ہیں۔ ہندو یا زائد سنی شیل یا زائوسی۔ صدیق سالک نے بھی "ہم یاراں دوزخ" میں بھارتی قیدی کیس کی داستان لکھی ہے۔ ہم یاراں دوزخ کے اصول کو آدمی دل سے مانتا ہو تو بہرہ یاراں بہشت کا لطف بہرگیں لیا جاسکتا ہے۔ اب سالک "ہم یاراں بہشت" لکھنے کا بھی لمبا تجربہ حاصل کر چکا ہے۔ آتے ہوئے عطا کے والد کو جب یہ چلا کہ میں بھی عطا کے ساتھ بھارت جا رہا ہوں تو وہ مطمئن ہو گئے۔ اطمینان کا احساس کانام ہے۔ مشکل تو بہر حال اپنی جگہ رہتی ہے۔ ہولی گادون گزر رہا تھا اور ہم بڑے تھے۔ کانڈزات کو چپکے نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ میں نے تو ٹھنڈا کاہل بھی چپک میں کیا۔ اب مرزے لگے کانڈزات چپک کرنے شروع کر دیے تھے۔ انسانی زندگی میں فائدہ سے اور نقصان کی چیزیں سامنے والے دروازے سے کم آتی ہیں۔ جن راستوں پر آنا جاننا نہ ہو یا کم ہو۔ بس اسی طرف سے پیچھے والا بھگوان

یہ تو بھی واردات تھی کہ ہم انبالہ سے چل کر دلی آ گئے ہیں مگر ابھی تک انبالہ میں ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے زندگی میں کہ آدمی سمجھتا ہے کہ وہاں پہنچ گیا ہے مگر وہ تو ابھی چلا ہی نہیں ہوا۔ تو ہم انبالہ سے چلے آئے۔ اب تو یہ بھی مشکوک ہو رہا تھا کہ ہم پاکستان سے بھی چلے ہوئے ہیں۔ شرمائی نے آکر لہکار کیا۔ یعنی ہم بھارت میں ہیں۔ وہ انڈیا پولیس کی اس پلیسڈ حرکت پر بہت شرمسار ہوا۔ پولیس والوں کی لالچ اور اندیشہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کتنے میں لالچ اور اندیشہ کمال کا غم نہیں ہے۔ یاس خیال کا دشمن ہے جو آپ کو کمال کی طرف لے جا رہا ہو۔ شریا ایک چالو پس میں ہے۔ اور ایک ہندو ہے۔ خاصہ تیزی خود۔ جو پولیس والا ہو کر گوشت نہیں کھاتا۔ حرام کھانا ہو گا۔ ایسا آدمی حرام بھی کھاتے تو وہ حلال ہو جاتے۔ کچھ لوگ انھیں جعلی حلال کی دکان کو حرام کر دیتے ہیں۔ عقیدے اور فرض میں وہی نہ ہو، شخصیت کی کاپی کمال ہوتی ہے۔ ہم سے شرمائی نے یاد رہ جانے والا ردی اختیار کیا۔ وہ باتیں بھی انھیں کر رہا تھا۔ رب امن کے اندر ہے۔ پوڑنا کا نام رب ہے۔ بے غرضی سے مدد کرنا رب کی عادتوں میں سے ہے۔ شرماکا رب جو بھی تھا۔ اچھا لگا۔ میں نے دل میں یہ تفریق مانی ہوئی دیکھی۔ اے اللہ اس شخص کو مسلمان کر دے۔ تمہارے نہیں گئے تھے نہیں ساتھ کہ وہ بھی دعا کر رہا ہو گا۔ رب اسے بند کر دے۔ جب دونوں طرف قناسیں ایک جیسے ہوں تو نظر آ جاتی ہیں۔ تمنا لک ہو ویتھہ مختلف بھی تو کیجیگی کا احساس ہوتا ہے۔ شرماکو دیکھ کر مجھے بار بار غالب کا یہ شعر یاد آیا

وفا داری بشرط استواری اصل ایمان ہے

مرے بہت خانے میں تو کعبے میں گاڑ رہا برہمن کو

اور ابھی کچھ ہندو ایسے تھے جنھیں مل کر غالب کا یہ شعر یاد آتا رہا۔ میرے ایک بزرگ ایسے لوگوں کے آگے سے بچنے کی دعا میں کرتے رہتے ہیں۔ آگ تو ہندوؤں کا دیوتا ہے خدا ہے تو ہم ان کیلئے کڑے دالے کون ہیں۔ شرمائی تھوڑی دیر کی ہم غریبی میں ہمارا اندیشہ ہوا تھا۔ اس کی کوئی غرض ہمارے ساتھ بندہ بھی ملے نہیں تھی۔ کوئی کام پھینسا ہوا نہ تھا مگر وہ مسلسل جاری مدد کر رہا تھا۔ ہماری دلوہنی کر رہا تھا۔ کسی لکھنے والے کی طرح دوست نہیں بنتا تھا۔ وہ ان چند لوگوں میں سے ہے جو بہر معاشرے میں فیکر کی علامت کا لہر بن جاتے ہیں۔ شرمائی نے اپنے پیچھے ایک دوست جو گندہ ریل کو فون کیا۔ ایک بھولا بھالا آدمی۔ اسے شرمہ کا دوست ہونے کا حق تھا۔ وہ فرما دینی کار میں ہمارے پاس نہ بچا۔ جیسے وہ یہاں آئے کا حکم تو۔ بس صاحب سے مل کر محسوس ہوا کہ وہ واقعی شکر شخصیت کا آدمی ہے۔ بہت سادہ انسان کچھ اور سادہ۔ وہ تو کوئی لوگ ایسے ہی بد وقت سمجھتے۔ آدمی کو زندگی انھیں طرح طرح کرنے کیلئے تھوڑا سا پسند قبول ہونا چاہیے۔ یہ محض منہ ہونے کیلئے ہی ضرور ہے۔ بلکہ ہی ہمارے خیالہ جاندہ حری کام فیل ہے۔ صرف شکر کا فیکر ہے۔ خیالہ صاحب کا تنگ کھانا تھا اور بل کی کار مارا۔

گھر لو عورت کی برباری

ہم سب بمل جی کی گھر میں بھر گئے اور آمنت ابو الحسن کا گھر تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ہم اس علاقے میں اور ادھر سے ہو کر کئی بار پہنچے تھے۔ احتیاطاً ایک گھر میں جا گئے کہ یہ آمنت کا مکان ہونا چاہئے۔ ہمارا اندازہ ایسا تھا کہ میں ہے تو میں نہیں۔ ایک خاتون جو بٹکے پھینکے اندر جرت میں چرے مرے سے نہ بدو گفتی تھی نہ مسلمان۔ اس کی شلوار جاتی تھی کہ مسلمان ہو گی۔ ہم سے مخاطب ہوئی اور اپنے چھوٹے سے بچے کو ہمارے ساتھ کیا۔ بچہ بالکل بچہ تھا۔ سفید کرتے پاتھارے میں وہ بچہ ہمارے آگے آگے لٹکے گا۔ یعنی ہمیں لید کر لگے گا۔ اس کی او اینڈروں والی تھی۔ بچوں جیسی ادا والے ہمارے لیدر ہو جائیں تو ہم اپنا گھر تلاش کر لیں۔ اپنا ملک بھی۔

ولی میں یہ پہلی جگہ تھی جہاں ہم نے راحت بھری کشادگی کا سانس لیا۔ ابو الحسن آمنت کے والد ہیں۔ اس کے شوہر مصطفیٰ علی اکبر ہیں۔ وہ اتنا انیسائے خبریں پڑھتے ہیں۔ آمنت ایک گھر لو عورت ہے۔ وہ بہت اچھی اویہ بھی ہے۔ یہ حیثیت اس کے عورت ہونے میں دل مل گئی ہے۔ کچھ عورتیں عورت نہ ہوتیں تو تیسرے درجے کی اویہ شاعرہ بھی نہ ہوتیں۔ اس کے باوجود عورت ہونے پر فرائض ہیں۔ اس دیوی کی طرح جو منہ بسور بسور کے خاندان سے فرمائشیں پور کرتی رہتی ہے اور اپنے اندر ہی اندر ہنسی رہتی ہے۔ پھر وہ اپنی فرمائشیں ہر کسی سے پور کرتی ہے۔ اور اپنے باہر بھی بہت سختی ہے۔ اندر کی رہتی ہے نہ باہر کی۔ وہ ایک ایسی فرمائش بن جاتی ہے جو پوری ہو کر بھی پوری نہیں ہوتی۔

آمنت کی ایک بیٹی معذور ہے۔ اس کو نہ بھالنے اور ہماری خاطر داری کرنے میں اس نے کوئی فرق نہ آنے دیا۔ بچی کی عجیب و غریب اور بے جاہ اختلنے نے اس کو مغرب نہ کیا۔ وہ کسی بھی وقت پریشان یا تنگ نہ ہوتی۔ کس حوصلے کا خزانہ اس کے من میں پوشیدہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ صدر پاکستان جنرل ضیاء کی ایک بیٹی کچھ معذور ہے۔ وہ بھی اس معاملے میں لاکا ضبط و تحمل رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ اقتدار انیسائے بیگی کی عداوت سے ملا ہے۔ معذور بچے کھڑے ہوتے ہیں۔ معذور کے پاس بہت طاقت ہوتی ہے۔ معذور بچوں کے مال باپ پر کوئی نہ کوئی انعام ہوتا ہے پھر وہ ہم کئی پشتوں سے انعام کے مستحق ہوئے۔ اجتماعی طور پر ہم سے بڑھ کر معذور کون ہو گا۔ آمنت کو بھی بھارت کا صدر ہونا چاہئے تھا۔ جن اصولوں کے ساتھ بڑے بڑے انعام وابستہ ہوں وہ ہر کسی کے لئے نہیں ہوتے۔ لیکن آمنت اندر کا گاندھی سے زیادہ بڑے عہدے پر فائز ہے۔ عورت ہو ثابت بڑا مستحب ہے۔ اس سے بڑا منصب کوئی نہیں۔

کشمی دیوی سے معاشقہ

رات شہر کا مکمل گھیراؤ کر چکی تھی۔ ہم برلا مندر کی طرف جا رہے تھے۔ بہت شوق تھا۔ مندر میں جانے کا۔ ہم ایک مکلی فضا میں ایک بڑی سڑک کے کنارے رگے۔ اس مندر کی توسیع و تعمیر کا کام برلا فیملی نے اپنے ذمے لیا ہوا ہے۔ برلا اور ٹاٹا میرٹیر جن خاندان ہیں بھارت کے۔ مسلمان امیر ہوں فوج کرتے ہیں۔ مسجد بنواتے ہیں۔ برلائی مندر پر خرچ کے بارے ہیں۔ میاں وہاں امیر لوگ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس طرح حرامی کمانی پاک ہو جاتی ہے۔ میرے گاؤں کا ایک بزرگ سار ڈنٹ بہت پیسے بڑا تھا۔ بسوں اور کشادوں والوں سے۔ رشوت لینداری بات ہے مگر کچھ لوگوں سے تو واقعی چھین لینے کوئی چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا سار ڈنٹ صاحب سے۔ کیا کرو گے اسے چیلوں کا۔ انہوں نے کہا "ج کروں گا۔"

بچی بات ہے برلا مندر بہت خوبصورت ہے۔ اس کا نام ڈرا کشکا۔ جیسے ہمارے ہاں اصفہانی چاہئے ہوا کرتا تھی۔ ہم نے جو تیاں آتاریں اور کچھ دیر رک گئے کہ شرباتی اور میس کی کیا کرتے ہیں۔ برلا مندر کے سامنے کوئی بھکاری نہ تھا۔ اس وقت تو نہ تھا۔ سب بھکاری تھے دیوتاؤں کے آگے۔ خاص طور پر کشمی دیوی کے آگے۔ جو دولت کی دیوی ہے۔ سنا ہے برلا فیملی کشمی دیوی پر عاشق ہے۔ ان کی دولت سے اندازہ ہوتا ہے جیسے کشمی دیوی ان کی عاشق ہے۔ آپس کی گٹ منٹ ہے کوئی دونوں کی۔ لوگ اس کے قدموں میں پیسے پھینک رہے تھے۔ دولت کی دیوی کو کیا ضرورت ہے۔ غریبوں کے پیسوں کی۔ شرباتی بمل جی اور کوئی دوسرے اس کے سامنے ٹنگے ہوئے تھے۔ اسے پیام کر رہے تھے۔ میں نے بھی اسے تسکنا کر کیا۔ ظالم بہت خوبصورت عورت تھی کوئی۔ اتنی خوبصورت تو وہ بھی نہیں۔ بہت عورتوں کا پیام نہ کشمی۔ پیام سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے کشمی دیوی کے حسن کی دولت کو سلام کیا۔ پیسہ تو ہم نے اپنے خدا سے بھی نہیں مانگا کبھی۔ وہ خدا ہے تو بن مانگے وہ گاہ۔ اب تو سب سے زیادہ بھیک مسجد اور مندر کی قبر گاہ کی مانگی جاتی ہے۔ خدا کے گھر کیلئے۔ خدا غریب اور بے گھر ہو گیا ہے۔ جن کو ضرورت ہے گھر لے۔ اللہ ہر کس سے تو پھر سارا جہان مسجد ہے۔ کشمی دیوی کے بعد مجھے کئی دیوی اچھی لگی۔ جتنی دیوی نہیں نظر نہ آئی۔ ہم نے کسی سے پوچھا نہیں۔ کہیں گستاخی نہ ہو۔ خدا تو خدا ہے جس کا بھی جو جیسا بھی ہے۔ جیسے بڑے دیو بھی تھے وہاں۔ کئی کئی باؤڈوں کا کھنکھن سروں والے۔ یہ واقعی ڈرا دینے والی چیزیں تھیں۔ جو لوگ سناپ اور بندر کو خدا مان لیں۔ انہیں کیسے خدا نہ مانیں جو بچہ فائدہ اور نقصان نہ پہنچائے۔ خدا

اس رات میں نے پھر خواب دیکھا جو جاتے ہی مجھے کچھ کچھ بھول گیا۔ اتنا یاد رہا کہ میں رات بھول
میں نہ تھا۔ دلی کی سڑکوں پر بھی نہ تھا۔ کہاں تھا۔ کیسں تھا۔ بعض اوقات آدمی کیسں اور کہاں کے
درمیان بھٹکتا رہتا ہے۔ آج پھر ہماری صبح دیر سے ہوئی۔ سچ ہے جانے کا نام صبح ہے۔ کبھی میں دن چڑھے
صبح کی نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہوں تو صیری ماں ناراض ہوتی ہے۔ حیران بھی ہوتی ہے۔ حیران زیادہ ہوتی ہے۔
میں اسے کہتا ہوں۔ صیری صبحی اس وقت ہوتی ہے ائی۔ امی چپ ہو جاتی ہے تو خدا کیسے خفا ہوتا ہو گا۔ وہ
ہانتا ہے ستر بزار بار زیادہ پیار کرتا ہے اپنے بندے سے۔

ہو تو دنیا میں خداؤں کی تعداد آدمیوں سے زیادہ ہو جائے۔ پہلے زمانوں میں انسان بھی ہوئے خدا۔ اب
بھی ہیں کیسں کیسں۔ ہر کیسں۔ ہر شخص بن گیا ہے خدا پر شرمیں۔ اب بندے خدا کی کا دعویٰ نہیں
کرتے۔ اب دعویٰ اور دعوہ دونوں ناقابل اعتبار ہوتے جا رہے ہیں۔

میں وہی و عریضی مندر کی سیر کرنے کے بعد پھر کشمی دیوئی کے سامنے کھڑا تھا۔ میں یہاں رات
گزارنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ ابھی ابھی مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ
مجھے مسکرا کر دیکھ رہی ہے۔ میں اس کی ذات کا بوجھ تھا۔ میں اس کے پیار کا گلیا سا تھا۔ عطا کی آنکھوں
میں صیری خواہش کا کس جھلکا لے لگا تھا۔ وہ بھی یہی کچھ چاہتا تھا۔ ہم صرف چاہتے ہی رہتے ہیں بہت
کچھ۔ ہم جو بات کشمی دیوئی سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک دوسرے سے نہیں کر سکتے تھے۔ بات ایک ہی تھی
اگرچہ کون ہے جو تمنا خواہشوں کی حفاظت کرتا ہے۔ خواہش اور اپنے دل میں ہوں تو ان کی خصوصیات
ایک ہی ہوتی ہیں۔

مسافرت میں رات فیصلہ کرتی ہے کہ کہاں گزرے گی۔ آج تو وہ بھول چکے تھے پہلے گزر جانا
چاہتی تھی۔ جنگل میں سب سے اونچی شاخ پہ بیٹھے پرندے کی آنکھ میں۔ بھرے شرکی روشنیاں اور
نیزدوں کے درمیان کسی جاتے شخص کے دل میں 'کیسں نہ کیسں گزری جاتی ہے۔ جب کشمی دیوئی کے
چہلوں میں کوئی بھاری کسی بھاری کے پسلیوں کوئی بھارن میں ہوتی۔ تب بھی گزر جاتی ہے۔

رات اکیلے آدمیوں سے پیار کرتی ہے۔ مسافروں سے پیار کرتی ہے اور اپنے پیاروں کو سٹاپ
کرنے میں اسے کوئی وقت نہیں ہوتی۔ ہم جب بھول میں داخل ہوئے رات ہمارے اندر چھپ گئی۔
مجھے رات جیسی صفات والے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ شرمیلے اور گہرے۔ کم آواز اور کم آباد۔ اس طرح
ڈرے ڈرے کہ ان سے کچھ کچھ ڈر لگتے لگے۔ پہلے کشمی دیوئی سے پیار ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی
عورت بھارت میں ضرور ہوگی کشمی دیوئی جیسی۔ کشمی ہوگی جسے، کچھ لوگوں نے بہت پایا۔ شاعری میں
محبوب اور بہت ایک ہی آدمی کے نام ہیں۔ گہرے میں آتے ہی بھول والوں نے قلم پلادنی تھی۔ نہ جانے
کیا نام تھا۔ اس قلم کا۔ جو ایک نر لیر اس میں بیرونی کارول کو رہی تھی۔ نام اس کا بھی نہ جانتے یا نہیں۔ قلم
میں اس کا نام کشمی تھا۔ اس نے غریب ہوتے ہوئے جس طرح دولت اور دولت والوں کو ٹھکرا دیا تھا۔
مجھے لگا کہ جیسے یہی کشمی دیوئی ہے۔ کشمی کیا صرف مندر میں اور قلم میں اور میرے دل میں ہے۔ دلی میں
بھی ہوگی کیسں کسی گھر میں۔ میری یہ رات اس گھر میں گزر رہی تھی اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دلی کی
سڑکوں پر عورتیں کشمی دیوئی کی بھارتوں کی نوکرائیوں سے بھی کئی گزری تھیں۔ دیوایاں میں۔

اداسیاں پر مجرم ہو گئی تھیں۔ اتنی مہربانی ہوئی عورتیں میں نے پاکستان میں کیسں نہیں دیکھیں۔ خدا کی قسم۔
ہندو کے کسی خدا کی قسم۔ وہ کسی محلے میں ہمارے خدا پر اعتبار نہیں کرتے۔ دیوایاں نہ ابھی ہندو نے
لوگوں سے۔

آپاں سوج تے جاواں گے

سنا ہے ہندو مسلمان سے بڑھ کر عفریہ تھا۔ اس کے طور طریقوں کی یہ افنگ بھی مرگئی۔ چروں پر بھی مکر کے آثار نہ رہے۔ منج کی ہل عمل چیزیں ڈھونڈنے نہیں تھیں۔ منج سور سے انھن اپو چاٹ کر تاور نماز پڑھتا اور ہندوں کا چھچھانک یا کھسی مل ہے۔ یہ تو خوبصورت عادتوں میں سے ایک ہے۔ عادتیں ہمارے معاملات اور معمولات میں ضائع ہو رہی ہیں۔ اب ایک روشن رویہ مٹی ہے مگر میں سفر میں کہیں بھیجنا نہیں چھوڑتی۔ آج کل منج سور سے صرف غسل خانے والے کالا کام یاد رہا ہے ہم کو۔ جن کو اخبار پڑھتا ہو یا دوڑتے ہو غسل خانے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک وقت میں دو دو کام بلکہ تین کام۔ بولوگ تیرا کام میں کرتے ان کے سامنے ذکر ہے کافارہ۔

میں غسل خانے میں گیا۔ عجیب جگہ ہے۔ بھی۔ بڑے بڑے بھوں میں غسل خانوں کے اندر ہر درجہ پر آکھینے ہوتے ہیں۔ آدمی چاروں طرف نگاہ نہ رہتا ہے۔ خود کو ہر طرف سے نگاہ کیے کر اگا پنے کی حفاظت کو چھوچھانکنا ہے۔ اس وقت جیسے میرے ساتھ کئی آدمی نماز ہے تھے۔ بلکہ ایک دوسرے کو نشانہ رہے تھے۔ تنگے کو تنگے سے کیا شرم۔ آدمی جب ایک اور سرے کا آئینہ اور کس ہو جائے تو شرم کیسی محرم کیسا۔ میں باہر آیا تو عطا دہی تنگے شویکی تیار کر رہا تھا۔ میں نے اسے چڑانے کیلئے واڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ بھارت میں واڑھی والے لی ہندو دیکھے۔ اپنے سر اور صاحبان تو واڑھیاں پہنتے ہیں۔ ان کے جسموں پر ہر طرف واڑھیاں ہی واڑھیاں ہوتی ہیں۔ ایسا ایسا خوبصورت سکھ دیکھا کہ حرا آگیا۔ اگر ان کو ٹوڑ دینے واڑھیاں منڈوائی ہوتی تو بائبل خض تھکتے۔ مسلمان اور ہندو کی چچان ختم ہو رہی ہے مگر سکھ جہاں ہوتا ہے علیحدہ ہوتا ہے۔ بھرتے بازاروں کی بجائے سکھ بھی بدست دکھائی دیا۔ وہ انکھائی ہر طرف سے نفرت آیا۔ ٹوٹی پھوٹی بھوپتروں کی کھڑت میں بڑے سے مکان کی طرح۔ وہی سکھ بدست ہیں۔ یہاں سکھ ہمسکھ کے معانی جیسا ہے۔ موت آتے آتے ٹھکانا ڈھلا۔ اسے اس کی پروا نہیں کہ ان کے پنجاب میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ بدست ہیں بلکہ بدست ہیں۔ سکھوں کیلئے تو خرمست کالاف بھی برا نہیں۔ ان کے سارے فیصلے قیام پاکستان کے وقت کے فیصلوں جیسے ہیں۔

”آپاں سورج تے جاواں گے“

کسی نے عرض کیا حضور! سورج پر تو گرمی اتنا ہی ہوتی ہے۔

”آپاں راست نول سورج تے جاواں گے“ سربراہ صاحب نے سید اور پھلایا۔

اب ہندو سیاست کی ترقی و محب کا سیک کچھ زیادہ ہو رہا ہے۔ سرور خاندان نے سکھوں کیلئے سورج سوانیزے سے لاکھڑا کیا ہے۔ قائد اعظم کے کہنے پر انھوں نے سفید کاغذ پر بھی دستخط کئے تھے۔ اب کاغذ جل کر کالا ہو گیا ہے۔ راکھ بننے والا ہے۔ دیکھیں یہ راکھ پہلے کون کس کی آنکھوں میں ڈالتا ہے۔ سخت مقابلہ ہے سکھوں اور ہندوؤں میں۔ ہندوؤں کو اب پتہ چلا ہے کہ اقلیت کیا ہوتی ہے۔

سامنے والی کڑی سے باہر میں نے ایک سکھ دیکھا۔ صرف جاکتا اور کڑا تھا اس کے وجود پر۔ اس طرح کڑا تھا پانے کھر کے سامنے فٹ پاتھر پر۔ جیسے غسل خانے میں کھڑا ہو۔ یہ بے تکلفی اور بے باکی ہندو میں بھی نہیں آتی تھی۔ میں نے ناشتے کے بعد اس سے مپ شپ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آج ہم اپنے بھولے سے باہر ناشتہ کرنے کیلئے نکلے۔ یہاں چائے کے ایک کپ کی قیمت دس بارہ روپے تھی۔ اتنے روپوں میں تو آدمی بیانی خرید سکتا ہے۔ ذیہ سو قدم کے فاصلے پر چوک تھا۔ لوگ ریڑھیوں پر ناشتہ لئے کھڑے تھے۔ ایک ریڑھی کے پاس کھڑے ہو کے ہم نے ناشتہ کیا۔ اس خوداک میں ایسی بو تھی جس سے ہم آشت نہ تھے۔ کھانے کا حرات آیا۔ دوسرے لوگ حے لے لے کے کھا رہے تھے۔ چائے ہم نے کھوکھا نما بوتل سے پی۔ ہمارے بچ پر ایک ٹھیکہ ہندو آن بیٹھا۔ دعوتی بانٹیں ہوئی گاڈھی کی طرح۔ سر منڈھا ہوا مینڈھ کی طرح۔ ایک خٹاں آرام سے کھلی ہوئی سر پر۔ مگر اس کے سر پر پے آرمی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گاڈھی والی بر سکون چلائی بھی نہ تھی۔ مینڈھ کی شرح صحریت ہندوؤں کی قسمت میں کہاں۔ وہ پینڈو تھا۔ کسی دور کے گاؤں سے آیا ہو۔ دلی میں ہم سے بھی زیادہ اجنبی تھا۔ جیسے کسی اور ملک میں آگیا ہو۔ اپنی کسی جیب سے اپنے آپ سے بھی سلا کاغذ نکال کر ہم سے کچھ معلوم کرنے لگا۔ ہم اس کی چچاس طرح سن رہے تھے کہ اس کا کام کراسے بننے ہیں۔ نہ نہیں گئے۔ ہم بھارت پاکستان میں دفنوں کے سامنے ہونے کس کس آدمی کی جان چھڑاں گے۔ کرپشن بھارت میں بھی عام ہے۔ رشوت کا کاروبار چھانہوا ہے اور ہندو غضب کا کاروباری ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کیلئے بڑے بڑے ذرا سے ضروری ہیں۔ کسی غریب آدمی کا کام کون کرے گا۔ یہاں غریب اور امیر دو بالکل مختلف حکومتوں ہیں۔ یہ حالات پاکستان کے مقابلے میں زیادہ بگڑے ہوئے ہیں۔ دلی میں میٹروکول ایسے لوگ روزانہ دیراتوں سے آتے ہیں۔ ریڑھیوں اور مگریت چائے کے کھوکھے والوں کا کام پھنار بٹاتا ہے۔ پھر لوگ دفنوں میں دھکے کھانے والوں کی زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے۔ ان کا کال بے مثل بلکہ بے ادب مسافروں سے بھی برا ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر دلی میں بھی کوئی تاریخی مقام نہ دیکھا ہو گا۔ لاہور میں لوگ رہتے ہیں اور ایک بار بھی انارکلی بازار نہیں دیکھا۔ لاہور میں جس نے انارکلی بازار نہیں دیکھا وہ لاہور آبادی نہیں۔ لوگ زندہ ہوتے ہیں اور زندگی کے بازار میں بھی آئیں پاسے۔ جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ تو نے نہیں دیکھا تو پھر یہی ادبی نہیں ہوا۔ تو گویا چند آدمیوں کو بھڑک کر کوئی جیسے پیدائی نہیں ہوا۔ میں دلی میں تمام اچھی جھوں پر جانا پھرتا تھا وہ لاہور میں نہ تنگہ مقیم

سائیکل سوار سڑھی

مہارانی کے سب لوگوں کے دوست یعنی اپنے "گراں" پنھانوں جیسے محض منور اعلیٰ سے ملنے کا سوچا اور نکل کھڑا ہوا۔ جیسی ڈرائیور ایک اور سٹک تھا۔ میں نے لاوہ کیا کہ وہ لطیفہ سناؤں۔ کوئی لطیفہ سناؤں۔ میں نے جو لطیفہ سنا۔ کسی فخر سکھ کو میں سنا چکا ہوں۔ سکھ جس کے پریشان ہو گیا۔ سکھ بیٹے بست ہیں۔ زور زور سے ہنسا زور لگا کر ہنسا سکھوں کا شاید رواج ہے۔ اس جیسے ہونے زمانے میں ہنسنا ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی ہنسنا تحمل اور تحیر کو برباد کر دیتا ہے۔ سکھ ہر بربادی کو بربادی نہیں سمجھتا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ سکھ جوانی لطیفہ نہ سناے۔ وہ چھبلی سینٹ کی طرف مزہ مزہ کر دیکھتے ہوئے لطیفہ سنا رہا تھا۔ اب میرے ذمے دو کام تھے۔ یہ کہ ہنسوں اور سامنے کا خیال رکھوں۔ جیسی کوئی لطیفہ نہ کر دے۔ ابجی کی آواز اور سردار جی کے قہقروں میں فرق نہ رہا تھا۔ سکھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے لطیفے کا مخاطب پاکستانی ہے البتہ تو آیا ہے۔ لطیفہ سناؤں سناؤ کوئی لودروہوں سے سکھ سکھ ان کے شاکر و معلوم ہوتے تھے۔ مجھے تو سکھ اپنی بربادی کا کشیدہ آدمی سمجھتے تھے۔ ایک آدمی نے تو پوچھ بھی لیا جتنا بچاؤ کیا ہے۔ آج کل یار لوگوں کو اپنے سر سے زیادہ بچاؤ کی فکر ہے۔ میں نے سردار صاحب کو بتایا کہ داڑھی میرے رسول اکرم و اعظم کی سنت ہے۔ وہ سارے جہانوں کا گرد ہے مہاترو۔ سکھ نے ہاتھ جوڑے اور ماتھے تک لے گیا۔ نمسکار میں ایک عام عقیدت ہے۔ یہ خاص عقیدت کا منظر تھا۔ میں داڑھی کو ایسا مل نہیں سمجھتا۔ جس کا نہ ہونا بے عملی سمجھی جائے یا بے عملی۔ داڑھی پرانے لوگوں کی وجہ سے تھی۔ آج کے لوگوں کا فیشن ہے۔ فیشن بگڑی ہوئی عادت ہے۔ یہ بہت پرانے زمانے میں کیا اور انداز سے لوگوں کی عادت ہو کر رہی تھی۔

سکھ ڈرائیور نے آدھا لطیفہ سنا یا تھا کہ سڑک ایک عورت کی چیخوں سے تھم گئی۔ وہ چلا رہی تھی اس کا سائیکل ہمارے آگے چلا جا رہا تھا۔ عورت سائیکل فٹ پاتھ پر کھڑا کر کے ابھی اپنے دوڑاؤ سے ٹک نہ پہنچی تھی کہ سردار صاحب نے سائیکل کو اس صدارت سے ٹکڑی کر کے دو کر انھیں۔ سیدھا چل پڑا۔ جیسی رکی تو سائیکل بھی پاس ہی لیٹ گیا۔ اسے اس بات کی فکر نہ تھی کہ جیسی فٹ پاتھ پر کیا لینے آئی۔ وہ اس بات کی داو لینا چاہتا تھا کہ سائیکل کو کس طرح چلا دیا۔ میری ہنسی کو سردار صاحب نے داؤ سمجھا۔ سکھوں کیلئے اس سے ابھی واڈ کیا ہو سکتی ہے۔ اسے میں عورت نے آکر باقاعدہ کالم گلوچ ٹھہر کر دی۔ ہندی زبان میں گائیوں کا احترام نہ ہوتا۔ اگر اس کی آواز اتنی اونچی نہ ہوتی۔ اور اس کے منہ سے تھوک کا پھیر کاؤ نہ ہوتا۔ وہ خاص مٹی ہوئی عورت تھی۔ نیڈی بکری کی طرح۔ جسے میں اس کی سلامتی بھی

جنگلی نہیں گیا۔ میں غیر ملکی ہو کر دلی میں ہوں۔ کر ڈوں لوگ بھارت میں ہوں گے اور آج تک دلی نہ آئے ہوں گے۔ کبھی نہ آسکیں گے۔ پاکستان میں کتنے لوگ لاہور نہ آئے ہوں گے۔ کئی لوگ ساری دنیا بھر آتے ہیں اپنے ملک میں کس بچنے میں جاتے۔ ہر ملک کی اپنی دنیا ہے۔ اس دنیا میں ساری دنیا ہے۔ ذرا غور کریں تو ہر شخص کی اپنی دنیا ہے۔ دلی والوں نے عمل دنیا کا ہے انسان کو۔ کئی ملک میں اندر۔ کیا کیا پرانے۔ کبھی کبھی ہستیاں۔ ہم اندر کے غریب تھے ہی نہیں۔ اندر ایک سمندر۔ ہم ساحل پر کھڑے دیکھتے ہیں۔ اس طرح کیا نظر آئے گا۔ کتنا نظر آئے گا۔ جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہ بھی کیا ہے۔ دیکھی ہوئی شے کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ حقیقت میں ایک اور حقیقت ہے۔ ہمیں تو حقیقت کا پتہ نہیں چلا اب تک۔ اسی کا پتہ نہیں چلا۔ ہم اس سوچ میں پڑ گئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیسے ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے اور ہو رہا ہے جو ہوتا ہے۔ جو نہیں ہونے والا وہ بھی ہو رہا ہے۔ جو ہونا چاہتے تھا۔ وہ کب ہو گا۔ ہم سوال کے کھوڑے پر سوار ہیں۔ گھوڑا سرکش ہے۔ اندیشہ ہم پر سوار ہے کہ ہم گر نہ پڑیں۔

کہتے ہیں "آخری سوال کے اندر جواب ہوتا ہے" ہم آخری سوال تک پہنچتے نہیں۔ پہلے سوالوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ پوری طرح الجھتے تو سمجھتے بھی۔ ہم سڑیہ نکلے ہیں ذوق سڑ نہیں رکھتے۔ سامان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ شوق کو سامان نہیں سمجھتے۔

تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ یعنی اب بھی، عورت قبول کرنے کا موقع ہے۔

ساتنے وہ عورت اپنے سائیکل پر سوار ہوئے کیلئے ٹانگ اٹھادی تھی۔ جیسی دیکھ کر اس نے ہانک سائیکل کی کاغذی پر اس طرح رگے رکھی۔ وہ نہ کھڑی تھی نہ چلی تھی۔ اس کے نصف درمیں یعنی ٹھیکے دھڑ کے سارے دائرے اور توپیں اور خطوط جیو میٹری کی کتاب بن گئے تھے۔ دائرے دراز زیادہ بڑے اور واضح تھے۔ کسی پنجابی فلم میں ہیری اس اداکار نے ہائیڈروجنس جیو میٹریس میں سنبھال میں۔ آج کل ہماری اکثر لکڑیوں میں لکڑیوں میں کم فرق رہ گیا ہے۔ وہ پہلے پروا دی عورت بد صورت نہ تھی۔ خوبصورت بھی نہ تھی۔ میرا ایمان ہے کہ ایسے لوگ اچھی اداکاری کر لیتے ہیں۔ میں نے منصوبہ بنایا کہ اگر وہ منظور کر لے تو میں اپنی تھوڑی بہت گاؤں کی زمین چھ کر فلم بنائوں۔ اس میں اس کو ہیروئن کا کسٹ کروں۔ پیسے بھی کم لے گی۔ میں نے اسے کہا "تم میری فلم میں کام کر دو گی۔"

وہ ہنسنے دہری ہو گئی۔ وہ دست اٹھاتی تھی۔ ہماری کوئی فلم ایکٹریس اس طرح ہنسنے کی اداکاری بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے میری بات کو وہ رات سمجھا تو ابھی اس کی اور میری زندگی میں نہ آئی تھی۔ اس نے کہا۔

"فلم تو ہتی رہے گی یہ تلو تم پھر کیوں لگا رہے ہو۔ کس پیکر میں ہو"

میں نے اسے صورتحال سے آگاہ کیا تو اس نے تنہید ہو کر کہا۔

"تم جیسی جیوڑو میں جس سائیکل پر چھوڑ آتی ہوں"

میں نے اسے دیکھ لینی کیسے ممکن ہے۔ اگر ممکن ہے تو پھر بھی کیسے ممکن ہے۔

وہ میری پریشانی پر پھر بھی اور سائیکل پر بیٹھ گئی۔ پوری طرح تیار ہو کر جیو میٹری کی کتاب کا ایک اور صفحہ کھل گیا تھا۔

"تم نے دیکھا نہیں یہاں عورتیں سائیکل رکھ چلاتی ہیں اور تم سے دگنے دگنے لوگ پڑے ہوتے

ہیں ان پر"

"کس پر"

وہ میں پھر پریشان ہوا اور وہ پھر بھی اب اس کا جواب ہی نہیں تھا۔ نہیں ہی نہیں۔ میں نے اس کی تائید کو

ایک ایسا رکشا میں نے دیکھا تھا جسے اندر گاؤں میں ہی ہم عمر عورت چلا رہی تھی۔ عورت سب کچھ چلا

سکتی ہے بھارت میں۔ سائیکل ہو سائیکل رکشا ہو موٹر سائیکل ہو۔ دفتر ہو۔ حکومت ہو۔ وہ تو خود کو بھی چلا

سکتی ہے اگر چاہے تو اس پر وہ ریل گاڑی۔ آخری آخرے پر جس اس پر کہ وہ اس طرح سائیکل چلاتی ہے

جس طرح اندر اس کو مت چلاتی ہے۔

"جس طرح میں سائیکل چلاتی ہوں۔ اندر اکاپ بھی حکومت نہ چلا۔ وہ دوسرے مقابلے میں کیا

چاہے گی۔ اس نے پیچ کر دیا پورے ملک کو۔ پھر بھی جانتی ہے چتا ہے سارے خاندان کو بھانرا کر اپنے

اس کی اپنی طرح ہے تھوڑی اور اس کے ہاتھ سرداری کا ڈرامہ ہی ہے۔ حلقہ کی تدبیر سے سردار صاحب کی چٹائی میری جھولی میں آگئی۔ میں نے اٹھا کے سر رکھ لی۔ ایک ایک عورت خاموش ہو گئی اور پھر یکایک جس دی۔ مضطرب ہوئی جی خطرناک ہوتی ہے۔ اپنے سامنے کے آئینے میں سردار صاحب نے یہ منظر دیکھا اور عورت کو بھی ہنسنے دیکھا۔ کچھ بھال ہوا ہنسنے ہنسنے پر حال ہو گیا۔ ٹھنک کے ساتھ والی سیٹ پر ہو بیٹھا۔ وہ عورت دروازہ کھول کر ڈرائیور سیٹ پر ڈٹ گئی۔ میں نے کہا "میں انخواہ کرنے کا ارادہ تو نہیں"

"میں انخواہ کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پاکستانی ہو" میرا چہرہ لال بلکہ لال دین ہو گیا۔ میں اس وقت پر غمازی لڑنے کی طرح ٹنگ رہا تھا۔ یہ بات اس نے مذاق کا کڑا کھائی محبت سے کہی تھی۔ شاید۔ اس نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو"

"اپنے دوست کی طرف جو میرے شرمناک لڑائی کا بیٹھنے والا تھا"

"تھا" کو چھوڑو۔ ہستی چیزیں ہو کر آتی ہیں۔ میں بھی خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ جب لالہ ہو میں تھی۔"

"تم اب بھی خوبصورت ہو۔" میں نے اس کی تعریف میں جائز مبالغہ کیا۔

"یہاں خوبصورت لوگ بھی خوبصورت نہیں لگتے۔ وہاں جو خوبصورت نہیں ہوتے وہ بھی خوبصورت لگتے ہیں۔"

"یہ تو فلسفہ ہے"

"فلسفہ میں سچ ہے۔ عقلوں اور شکلوں پر مار پڑتی ہے بھگوان کی۔" اس نے غصے کی نظر والی تنکے سر سے سکھ پر اور مسکرا دی۔ اس کے چہرے پر غصہ سو یا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنکھ رہی تھی۔ وہ واقعی خوبصورت لگتی تھی۔ جو عورت بد صورت نہ ہو۔ بد مزاج نہ ہو۔ وہ کسی وقت بھی خوبصورت لگ سکتی ہے۔ فلسفہ حقیقت بن جاتا ہے۔ حسن ایک کیفیت کا نام ہے۔ سکھ کی حالت تھی جیسے اسے بچا کر کھڑے کھڑے دیر ہو گئی۔ مزید مزاکے طور پر اس خاتون نے کچھ پینے کیلئے کہا۔ سردار نے نبھائے لیا تھا۔ اس کیلئے سزا ایک انعام کی طرح ہونے والی تھی۔ میں نے خوبصورت لگتی ہوئی عورت کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر عذرت بھی کر دی۔ جیسے اس نے اپنا فرض سمجھ کر وصول کر لیا۔

جیسی ہی تلو سردار صاحب نے لطف بھی شروع سے شروع کر دیا۔ میں ابتدا ہی میں نہیں پڑا۔ یہ لطف میری قسمت میں نہ تھا۔ لطف اپنے آدھ پر پہنچا تو مجھے یاد آیا کہ مجھے اپنے دوست کے گھر کاپتے یاد نہیں رہا تھا۔ سردار کو پچھنے ہوئے عورت یا خاتون سے بھی کچھ بھول گیا تھا۔ اور اس نے مائے آدمیوں سے پوچھا تھا کہ اب گھر ملتا ہے یا نہیں ہو گیا تھا۔ لطف پورا نہ سن سکتی کی بورت اور خاتون کے ہاں کچھ نہ سن سکتی کی آکٹاٹ اس کے اندر اہل رہی تھی اور اس وقت وہ غصہ میں اس شخص کو صدمہ دہ رہا تھا۔ جس نے اسے رست لٹا دیا تھا۔ لٹا رہتے پر لگا دیا تھا۔ وہ دروازہ وہاں نکل آیا تھا۔ جہاں اس نے سائیکل کو شاندار کر مارا

اوپر بھارت میں جمہوریت ہے اس لئے باتیں کر لی جاتی ہیں۔ پاکستان میں جمہوریت نہیں ہے۔ باتیں اس طرح کی لوگ کر لیتے ہیں۔ عورتیں قاتل اور آسانی سے کر لیتی ہیں۔
اس نے سائیکل تنگی کے آگے جا کر کھڑا کر دیا اور تالا لگا دیا۔ اور مجھے گاڑی سے باہر آنے کا حکم دیا۔ میں نے پہلا ڈانڈا ڈال دیا۔

”جب ڈرائیور کا تو چالان کریں گے۔ میرا کیا کریں گے“

”جیسے قید کروں گی اپنے گھر میں۔“
وہ پھر ہنسی اور ہم ہنسی کے پیچھے پیچھے گھریں داخل ہوئے۔ اس کا گھر ایک موٹی عورت کی طرح پھنسا پھنسا لگا خود اس کی طرح۔ کبیں کبیں اس کی ہنسی کی طرح۔ وہاں ایک لڑکی نظر آئی۔ جیسے وہ خود ایک دم پہلی ہو گئی۔ وہ بولی یاد ہو چکی لڑکی بولی۔

”ہاں میں نے جیسے کہا تھا میرے بوم ورک کیلئے کاپیاں لے آؤ اور تم“

”شہر یہ بھی کاپیاں ہیں اور وہ ہنسی۔ وہ لڑکی بھی ہنسی۔“

”یہ تو ف کاپی ہے“ اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

”اور یہ کھنسی ہوئی۔“

میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔

”اچھا کھنسنے والا کاپی کے پہلے دو تین صفحے خالی چھوڑ دیتا ہے اور ہمیشہ ورق کے ایک طرف لکھتا ہے۔“

تم کھنسی ہوئی کاپی کو کھول کر تو دیکھو بہت ان کھنسنے والے جاب میں گے اس کاپی میں۔ کچھ صفحے اس طرح لکھے ہوتے ہیں۔ مٹا چاہو تو مٹ بھی جاتے ہیں۔ بوم ورک کرنے والی لڑکی کی نگاہیں اس پشلی کی طرف مڑتی ہیں۔ جو کھنسنے کے ساتھ مٹانے کا کام بھی کر سکتی ہے۔ ایک طرف ریز ایک طرف سک۔ کچھ نوکیلاں کھنسنے ہوئے حرفوں پر بھی لکھتی ہیں۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

وہ ان گھڑی پشلی کی طرح نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ اس طرح دیکھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ جو میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔ وہ اندر بھاگ گئی۔ ہم ڈرائیور میں چلے گئے۔ وہ اپنی بہت سی کھنسی ہوئی کاپیاں میرے پاس لے آئی۔ وہ کاغذ میں پڑھتی تھی۔ مگر میں اس سے ٹوٹن پڑھنا چاہتا تھا۔ میں اس کی کاپیاں دیکھتا رہا۔ ہمارے رسم الخط نہ پڑھ سکے کے باوجود میں پڑھ رہا تھا۔ دل میں اتر کے ساری زبانیں ایک ہو جاتی ہیں۔ میں اسے بجاتے کیوں نہیں جانتا چاہتا تھا کہ اس نے کہا تھا کہ لکھا ہوا میں پڑھ نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھ پہ جو لکھا ہے وہ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ میں تو اپنے ہاتھ پہ لکھا ہوا بھی نہیں پڑھ سکتا۔ وہ بھی شاید جان سکتی تھی۔ کتنے کی تم ان پڑھ ہو۔

”میں۔ لیکن کاش میں ان پڑھ نہ ہوتا۔ صرف ان پڑھ لوگ دلوں کی کاپیوں پر کھنسنے حرف پڑھ

سکتے ہیں۔ لامعلی کی اپنی ایک تفسیر تھی۔ جب عورت اور مرد ایک دوسرے کے انسان تھے۔ امیر اور غریب میں مگرے اور کالے میں صمان اور میزبان میں کوئی امتیاز نہ تھا۔“

وہ دودھ کر پھر کسی کمرے میں گئی۔ ایک اور کاپی اٹھا لی۔

”پاکستان سے آیا تھا پہلے بھی ایک۔ بہت دن رہا۔ پڑھیں اس پر کچھ لکھتا رہتا تھا۔ چلا گیا۔ یہ بھول گیا تھا میں۔“

میں نے اس کاپی کا اردو میں لکھا ہوا پہلا صفحہ دیکھا اور اسے بتایا کہ وہ خود یہ کاپی میاں پھوڑ کر گیا ہے۔“

”وہ آئے گا۔ اس نے کہا تھا مجھے۔“

میں اسے کہنے جاتا کہ جو باتیں لکھی جاتی ہیں۔ بالعموم کی نہیں جاتیں اور مختلف کاپیوں میں لکھے ہوئے لفظ ایک ساتھ نہیں پڑھ جاسکتے۔ ہم سب مختلف کاپیوں میں لکھے ہوئے لفظ ہیں۔

اس کی باہی چاہتی تھی کہ ہم ایک ہی کاپی میں لکھے جائیں۔ اس وقت تھوڑی دیر کیلئے کھنسنے۔

اور میں جانا چاہتا تھا۔ وہ جو پہلے چلا گیا تھا۔ شاید اسے بھی ایسی ہی مشکل ہو۔ مجھے تنگی تک چھوڑنے دو

دونوں آئیں۔ میرے ایک ہاتھ میں وزینٹنگ کارڈ اور دوسرے ہاتھ میں کاپی تھامی گئی جو اردو میں لکھی

ہوئی تھی۔ وزینٹنگ کارڈ ہندی میں تھا۔

گجرال اور مجتبیٰ کا کمال

بڑی کوھیاں - کوھیاں کے آگے یا پیچے - ہر ایک گھر مہارانی باغ ہے۔ کچھ پر تو مہاراجہ باغ کا گماں ہوا۔ عام لوگوں کو یہاں سیر کرنے کی اجازت ہے۔ ان کو جو کسی سے ملنے آئے ہوں ان کی تو سیر ہو جاتی ہوگی مگر وہ غنیمت و صومندرتی سے بڑے بڑے کئی مکانوں میں دو دو آوی رہتے ہیں۔ جبکہ اسے رہتے ہیں دو سو آوی آسانی سے رو سکتے ہیں۔ ایسا کئی آدمی نہیں گجرال صاحب کی کوھنی کا کیا پتہ دیتا۔ وہ کوئی ان سے ملنے آیا تھا۔ آئی۔ کے گجرال و زبردہ چکے ہیں۔ روس میں سفیر رہ چکے ہیں۔ جس کو بھی یہ نہیں شک ہوا۔ وہ ۱۳ نمبر قحی مری کی بجائے "بی" تھی۔ بلکہ بڑی بی تھی۔ کئی پیکروں کے بعد ہم نے "بی" تلاش کر لیا۔ شہادت دے گی کوھنی - ایک خوش طبع دروازے سے گزر کر ہم اندر پہنچے۔ ہندوانہ امارت سے لدا یوازہ رنگ روم جہاں تین چیزیں ہمیں پسند آئیں۔ پہلے سے کئی ہوئی کتابیں۔ گجرال صاحب اور مسز گجرال - کپ شپ زیادہ دکھا دیا ہوا نہ بنا سکی۔ کہ ہم ابھی تک دلی میں قانون قحی کے جرم تھے۔ پاکستان تھے۔ اس لئے یہ اقدام بہت قحی سے کم خطرہ ناک نہ تھا۔ گجرال صاحب اس صور حال میں بہت افسوس ناک نظر آ رہے تھے۔ سیکرٹریٹ میں ایک معتمد افسر سے فون پر بات کرنا چاہ رہے تھے جو ہمارے کاغذات کو وارنٹ بننے سے روکا نہ سکے۔ مسز گجرال نے خاصی خوش و خاشاک مصالحتی کھلائی۔ ہندو خائیاں بہت ابھی بناتے ہیں۔ والوں اور سبز لوں کی کئی فہرستیں۔ اب تو وہ گوشت میں بھی ہم سے اتنے پیچھے نہیں۔ پتہ نہ ہو تو گائے کا گوشت بھی کھا لیتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کھانے کے بعد ہی پتہ چلے۔ گائے اور پاکستان صرف قسادات اور مفادات کا شغف بن کر رہ گئے ہیں۔

مسز گجرال ہندی کی ابھی شاعرو ہیں۔ ہندی شاعری کا وہ احاطہ مکمل عورت ہے محبت کرنے والا عورت کی زبان میں یہ بات کہ آہے بلکہ کرتی ہے

قیم جو میں جانتی بہت کرے دکھ۔ کھوے
مگر دھندلہ جیتی کہ بہت کرے نہ کوئے
جب وہ عشق کرتی ہے تو قاری اور اردو رولنے والا سو فی شاعر اور شاعر بھی عشق کر لیتا ہے۔
موسیقی اور قہقہے بھی خسرو نے ہندو عورت سے سیکھا ہوگا۔

خسرو در عشق بازی کم زبندہ زن مہاش
اورائے مردہ سوزہ زخمہ جان خوش را

میں نے ایسی ہی ہندو زن دیکھی جو محل گر مری نہیں تھی۔ محل میں کر رہے تھے چارہ تھی۔ کسی نے عشق میں نہ زیادہ بڑی آزمائش ہے۔

ہم سیکرٹریٹ آئے گئے۔ یہاں پاکستان جانے کے ارادے میں جہاں بھارتی باشندوں کا جہوم تھا۔ جن میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ وہ دو ہجرت نہ کر سکے۔ غیر ملکی بھی تھے کچھ پاکستانی بھی تھے جو تھکے اور یہاں قیام کرنا چاہتے تھے۔ کئی کئی گھنٹوں سے منتظر ہو رہے تھے اور سرد۔ چھڑکیوں کے تھوکر مرم پر یہ حقوق صاحب لوگوں سے زیادہ صاحب ہمارے۔ خوش نصیب تھے وہ جن پر اندر والے مہمان تھے۔ اب لوگ اوپر والے کی مہمانی سے بے خبر ہیں۔ سو فی انشور واصف صاحب نے کہا ہے "خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے"۔ اس کے بعد کسی کو خوش نصیب کا لقب دینا مشکل ہو گیا ہے۔

ہم فوراً اندر چلے گئے۔ پھر ایک سکھ سامنے تھا۔ بہت بھلے نامس سکھ تھا۔ ایک فارم اور بھرا۔ ایک درخواست اور نکلی۔ سردار صاحب اپنے صاحب کے پاس گئے ان کے دستخطوں سے کاغذات ہمارے دوست بن گئے۔ دستخط نہ ملے تو قحی ان کے ساتھ بیٹے سے عہدے کی مہربانی چاہتے۔ اب آٹو گراف لینے وقت بھی لوگ مہر کا مطالبہ کیا کریں گے۔ کاغذات میں ہر طرف خدا کے دستخط نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں انسان اپنی سر لکھا تھا جاتا ہے۔

ہم دفتر سے باہر نکلے تو ایک پالتو بی کی طرح ہمارے ساتھ تھی۔ ہم اپنے بوشل راج وپ جاتے جاتے کنات بیل میں رک گئے۔ ایک بوشل میں جا کر فون کیا تو ہمارے کمرے میں تجنی حسین قابض تھا بوشل والوں نے اسے کیسے بچان لیا۔ اور یہ مان لیا کہ وہ ہمارا دوست ہے۔ زیادہ شک کس پر کیا جائے بوشل والوں پر یا تجنی حسین پر۔

تجنی حسین "ایر ایم جلیس کھاہتی ہے۔ بھارت کا علی درے کا حراج لگا ہے۔ خائے بھی اس نے لکھے ہیں۔ گھڑا رو فوجو وری کا ہرنگ ہے بس کہ قاف ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوں گے۔ دونوں اوچی سے کھینچے ہیں۔ خرقہ مارنے میں زور نہیں لگاتا بڑا کسی کو۔ تجنی کو مل کر وہ قیاد آیا۔ کچھ لوگوں سے مل کر بے وفائی یاد آئی۔ پروفیسر سجا باقر رضوی کو کچھ لیں۔ ان کا رنگ سنا تجنی حسین ہے۔ باقر صاحب تجنی ہی تجنی۔ تجنی حراج ہی حراج۔ تجنی کی ایک کتاب "بالآخر" میں ایک مضمون ہے۔ "اردو کا آخری قاری" بھارت میں اردو اور اردو والوں کی پریشان حالی کا اس سے موثر انداز نہیں ہو سکتا۔ مذاق مذاق میں اس کی جیس جیس دی ہے اردو سے محبت کے جھوٹے ٹیڈنڈ بانگ و موٹی والوں کی۔ یہ تو جو مضمون پڑھے "اسی کو پتہ چلے اردو کا قاری تلاش کرنے میں کتنی خواری اٹھانا پڑتی ہے۔ گھٹے تو لیں لگا جیسے بھارت میں اردو کا آخری قاری خود تجنی حسین ہے۔ سب لوگ اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں وہ خود بھی اپنی تلاش میں ہے۔ دلی میں اردو کا کتنی جیس لاشن کم کرے۔ عاشق ایک مقام پر جا کر معشوق بن

جاتا ہے۔ لہذا گزندہ گور۔ بھریہ ہوتا ہے کہ ڈاکر ڈاکر اور گزندہ کو ایک سی شخص ہو جاتا ہے۔

نہجی سے مل کر سب ملاقات کا لطف آیا۔ ماحول مکمل کیا جیسے کائنات کے بعد پورا راجہ ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ یہ شخص اردو مزاج کے مفکروں کیلئے ادا و باہمی کا دفتر ہے۔ جو چھٹی کے دن بھی کھلا رہتا ہے۔ محال ہے جو مکمل سیاست پر رادراست کچھ کہے۔ ہر قسم کی سیاست کو مزاج کے چولے پر چڑھا کر نظروں کی تیز آنکھ میں گلا کر لڈیو خوراک بنا دیتا ہے جسے پیٹ بھر کر کھانے کے بعد انتھار مسکن کو بھی بدبھنی نہ ہو۔ کبھی کبھی ادنیٰ سیاست کی کچی لسی پیا سوں کے ساتھ پیٹھ کر لی لیتا ہے مگر ذکاوت میں مارا۔ لوگ ایسے مہنگوں پر اوپر پیچھے سے ہوا خارج کرتے ہیں کہ بدبو سے دم گھٹنے لگتا ہے بہت جگہوں پر اس بدبو نے ہمارا سانس لینا محال کر دیا۔

مسلمان افسر کا ڈرائیونگ روم

ہم نے شرباتی کو فون پر بتایا کہ ہم کل ہونٹل چھوڑ دیں گے۔ وہ اوپر پر کاش سوچی سے حساب لیں۔ حساب کا مطلب رعایت تھا۔ شام کو چھٹی میں جس الرجن فاروقی کے ہاں لے جانے کیلئے پہنچ گیا۔ میں نے سڑک سے منظر کو آنکھوں میں بھرے کی کوشش کی۔ اب تک لنگ رہا تھا جیسے ہم ایک ہی رستے پر آ جا رہے ہیں۔ ایک سی سڑکیں امرنگوں کے آسے پاسے درخت۔ اکا کا کار پر کچھ بیس اور بس۔ دلی میں ٹریفک کا کوئی خاص مسئلہ نہیں۔ بڑے بڑے گول پتھر۔ گول پتھروں میں پھول ہی پھول۔ پورا مہین۔ میرا لی جہاں کہ جیسی سے اتر کر ان گلشنوں میں پھروں۔ جس الرجن فاروقی کے پاس اتنے پھول کہاں۔ کچھ لوگ اتنے سستے ہوئے ہوئے ہیں۔ جیسے ان کے اندر رست سے گول پتھر ہیں۔ ہر آدمی کے اندر ایسا ایک ہی گول پتھر ہو جو پھر کوئی کسی پتھر میں کیوں پڑے۔ اکثر لوگ یہاں پتھر ہی پتھر ہیں گھن پتھر۔ اب کے ذرا تیر کوئی ہندو تھا شاید مسلمان تھا۔ ہر حال سکھ نہ تھا۔ یہاں سکھ کے علاوہ جیسی ذرا تیر ہو گا کسی کو بچا ہی نہیں۔ جیسے گول پیچند نارنگ بھٹتا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کو تحقیق اردو ہونے کا حق ہی نہیں۔ وہ تحقیق سے وہی کام لیتا ہے جو سکھ جیسی سے لیتا ہے۔ یہاں جیسی سے مراد جیسی ہے۔ حالانکہ گول پیچد دوسرے کام والی جیسی کو تحقیق کے حوالے سے زیادہ مناسب بھٹتا ہے۔ اردو اور تحقیق کو بھی اس کام کیلئے استعمال کر لیتا ہے۔ میں نے سوچ لیا کہ گول پیچے پتھروں کا کہ جیسی کہیں ٹیکس کی مونٹ تو نہیں۔ وہ خوند ہو جائے کہ پھر تم پر چھو گے کہ گول پیچ گوب کی مونٹ کیوں نہیں۔ شب خون مارنے والا (اودھ سوری) رسالہ "شب خون" ڈھالنے والا فاروقی تو ستر مرتباًں مرجع آدمی ہے۔ جسے ہمارے ایک دوست نے مرزا خان مرجع پڑھا تھا۔ ہم نے بھارت کے جدید اردو نقادوں میں سے مسلمان فاروقی کا سنا تھا۔ شب فاروقی اپنے آپ کو بھارت میں اردو کا آخری نقاد بھٹتا ہے۔ اس آخری نقاد اور آخری قاری میں کیا فرق ہے۔ پتہ نہیں۔

ہم ایک پرانے خاموش طبیعت مکان کے اندر داخل ہوئے۔ ایک بہت بڑے مسلمان افسر کا گھر ہے۔ اس طرح کے گھر کے آدمیوں کو روٹیں میں افسر کہا جاتا ہے۔ بھارت میں وہ خیرے مسلمان بھی ہو تو اسے مختلف افسر کہا جاتا ہے۔ فاروقی میں افسرانہ طرز سے کاچورا ہے۔ ایک سادہ سے ڈرائیونگ روم میں ہم بیٹھ گئے۔ ایک ڈیوان افسانہ نگار قمر احسن پکے سے وہاں موجود تھا۔ فاروقی آیا۔ پھر چائے اور کڑاے بھی آئے۔ تعارف ہوا۔ تعارف صرف میرا ہوا۔ باقی لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ حالانکہ تعارف ان کا ہونا چاہئے جو ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ایک دوسرے سے انجان ہونے سے بڑا رشتہ

کئی نہیں۔ سارا زہر جان بچانے پہلے ہوا ہے۔ شاعری پر بات یونہی شروع ہو گئی۔ غفر اقبال کی "آب رواں" سے ہوتے ہوئے گندے پانی کے جوڑ تک پہنچی۔ اس سے پہلے کہ فاروقی باہم سے کوئی اس میں چھانک لگاتا۔ انتظار میں رہ آئے ہوا۔ برآمد ہونے کا مطلب برآمدے سے آگاہ نہیں۔ انتظار بیدار رہا۔ درانگہ روم میں داخل ہوا تھا۔ جیسے بھارت سے پاکستان میں داخل ہوا ہو۔ تب مجھے ممتاز صفائی عجب الرحمن شام کی بات یاد آئی "پاکستان اگر ذرا رنگ روم ہے تو بھارت بیدار روم ہے۔" دوسرے کئی محالوں کے علاوہ دونوں ملکوں کے دفاع کا مسئلہ بھی میری طرح آپس میں جڑا ہوا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمسائیگی میں بیٹھے مرنے کے بت سے سلسلے مربوط ہوتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ افغان مجاہدین اصل میں ہماری لڑائی لڑ رہے ہیں اس کے بعد یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کے مستحکم ہونے میں بھارت کے محفوظ ہونے کا راز چھپا ہوا ہے۔ بھارت ایک انڈیا بیدار روم ہے جس کے دروازے ہماری طرف کھلے کے علاوہ کسی بھی اطراف میں کھلے ہیں۔ اس بیدار روم کے اندر بھی کئی دروازے ہیں۔ غفر نہیں آتے۔ مگر ان پر دستک شانی دینی رہتی ہے۔ بنگو دیش کا تھا تو حکیم جی مدھو چو این لائی ہے کہ تھا کہ "اصل میں یہ بھارت کے ٹکڑے ہونے کی ابتداء ہے" "جنگی استقامت اسے بہت پہلے ہو جایا کرتی ہے۔" روس ہمیشہ دوست ملک (جیسے افغانستان) پر قبضہ کرتا ہے۔ ان کی "دعوت" ملنے پر۔ یہ کہاں تک جے جے۔ بہر حال دوستوں کو اس دعوت میں دشمن بنانا ہے۔ روس نے آج تک کسی دشمن ملک پر قبضہ نہیں کیا۔ حملہ بھی کہی کیا ہے۔ پاکستان اور روس ایک دوسرے کے دوست ہو کر بھی دوست نہیں ہو سکتے۔ لہذا دوسرے دعوت کا سوال فی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن یہ کیا سیاست ہے کہ چونکہ ہم روس کے دوست نہیں اس لئے اس کے دشمن ہیں۔ بھارت روس کا دوست ہے۔ اس لئے دور یا دیر بھارت میں افغانستان سے ملتی جلتی صورتحال پیدا ہوگی۔ روس زیادہ دیر دوستوں کو اکٹھا نہیں چھوڑا کرتا۔ پاکستان میں مختصر وقت کے بعد اس کا مستقبل قیام بھارت میں ہو گا۔ دوست ذرا رنگ روم میں کتنی دیر بیٹھے گا۔ آرام کرنے کیلئے تو اسے بیدار روم ہی میں جانا ہے۔ بے تکلف دوست ذرا رنگ روم کو بس راہداری کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔ اور اس معاملے میں روس سے بڑا بے تکلف بھلا کون ہو گا۔ یہ بات آف دی ریکارڈ ہے کہ موجودہ صورتحال بالکل نہ بدلی تو ہندوستان (بھارت + پاکستان) کا کثرت تبدیل ہو تاکہ گینٹ ہو یا نظر آتا ہے۔ انتظار اور شامی کی گفتگو یہی چاہئے تھی۔ انتظار چھپے کے اعتبار سے صحافی ہے۔ اور شامی ذوق و شوق کے حوالے سے ادیب ہے۔

شام گمری ہو کر بیٹے گئی تھی اور ہمیں شامی یاد آ رہا تھا جس عطا اور تجھی بادی بادی بیدار روم سے گزر کر بھارت روم گئے تھے۔ ایچ بی بھارت روم بہر صغیر میں ایسا بھارت روم کونسا ملک ہوا۔ میرا خیال ہے یہ بھارت ہے۔ جو اب ایک ملک نہیں پھر بھی ملک ہے۔ اس کا ایک دروازہ ذرا رنگ روم (پاکستان) میں بھی کھلتا ہے۔ کشمیر کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ فوری طور پر اس بھارت روم کے دونوں دروازے بند کر دیے جائیں۔ جو اسے

ایچ بی بناتے ہیں۔ اس کا دروازہ ان معجزوں کی طرف کھلے دیا جائے جو اسے جت نظیر بناتے ہیں۔ پاکستان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ دیواری ہمسائیگی کے تصور کو قائم کرتی ہے۔ خلوص شرط ہے۔ رسول کریم نے تو ہمسائے کے ساتھ حقوق بیان فرمائے کہ جیسے اسے جائیداد میں شریک کر دیں گے۔ بھارتی کچھ دیر کیلئے اپنا ہاتھ روم آسام کا نہیں یا بھارتی پنجاب کو۔ یہ دونوں قواس کے ہاتھ روم بن بھی چکے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ہاتھ روم ہیں بھارت میں۔ اسے آخر اپنی غلاطی خود ہی سمجھنا پڑی۔ گندہ کی کالڈی اور جرنے سے بچنے کیلئے یہ ضروری ہے پھر کئی غفر اقبال آج رواں کھلے کئی فاروقی گندے پانی کے جوڑ سے اس کا موازنہ کرے۔ یعنی تحدید لگے۔ فاروقی کے اندر ایک اور فاروقی ہم نے دیکھ لیا تھا۔ ورنہ اس کے پاس بیٹھ کر ہم اتنی دور دوری نہ سوچتے۔ فاروقی نے کل یہ احساس ہوا کہ ہم بہر حال ایک مسلمان نے مل رہے ہیں۔ اس کے پاس مسلم تہذیب کا ایک انداز موجود ہے۔ وہ بات بات پر لا حول والا قوت بہت احمق سے نکلتا ہے۔ اس وقت ہم میں سے ہر آدمی کو خود پر شک سا ہوا لکھنا اطمینان ہوا کہ فاروقی بار بار لا حول پڑھتے پر اندر سے مجبور ہے۔ چھپکے کئی دنوں سے اللہ رسول کا نام سننے کو ترس گئے تھے۔ ان کی آواز قلم امراؤ جان وادیں سنی ہو ہو مل والوں نے ہمیں دکھائی تھی۔ اور لا حول والا قوت فاروقی نے سنا۔ شاہ فاروقی کی ایک بیٹی نے ایک ہندو سے شادی کر لی ہے۔ جو مسلمان ہو گیا ہے۔ نہایت شادی سے پہلے یا بعد میں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عورت اور مرد کبھی محبت سے پہلے تو وہ مسلمان ہوتے ہیں۔ کم از کم اس وقت تو ہوتے ہیں کافر حسین اہم آشنائیت کا ملاپ سے پہلے کے لقب ہیں۔ محفوظ شادیاں بھارت میں عام ہو رہی ہیں۔ آج مسلمان لڑکی اور ہندو لڑکا شادی شدہ ہو جاتے ہیں "مشہور" ہو سکتے ہیں جو بچے ہوتے ہیں نہ کوئی مسلمان ہو جائے نہ ہندو۔ وہ ایک دوسرے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ قبول کر لیتے ہیں۔ باقی سب تعلقات خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں ہیں۔ ایک شادی ہو جاتی ہے کہ نکاح خدا پرست ہے۔ اور دونوں طرف سے خائیاں اور جھانپاں گواہ بنتی ہیں اگر دونوں کے خدا الگ الگ ہوں تو بھی کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔ اعتراض تو صرف خدا کے ہندو کو ہوتا ہے۔ فاروقی کے دادا دادا نے اپنا حرم چھوڑ دیا اس کا کریمت فاروقی کو جانا ہو گا۔ مگر فاروقی تو اپنی بیاری بیٹی کی شادی کسی بڑھے (مسلمان) سے کرنا چاہتا تھا۔

اب وہ بڑھا حرم پر ہندو ہو گیا ہو گا۔ دادا فاروقی تو مسلم تو ہوا نہ ہندو پر فہم نمازی بھی پڑھتا ہے۔ یہ خاص بات ہے ورنہ مسلمان ہونے کیلئے تھوڑا سا کافر ہونا پڑتا ہے۔ یا ہونا چاہئے تیرا قیاس ہے کہ اس واقعے میں کچھ واقعہ نامور استاد اور ایب پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ان کی بیٹی سلمی صدیقی اور ان کے دادا مشہور افسانہ نویس کرشن چندر جیسے۔ صدیقی کے بعد فاروقی صدیقی صاحب نے تو خود کشی کی کوشش بھی کی تھی۔ شاید فاروقی نے بھی خود کشی اپنے اندر بھی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد سلمی صدیقی سلمی کرشن نہ بنی۔ فاروقی پر دل کا دورہ پڑا تھا قصور کسی غلطی کا ہوا جواب دل پر مگر سے موٹھنوں والا بیکڑا جائے والا بھی والا۔ مونس تو فاروقی کی ہیں۔ وادیں اندر ہوگی۔ اپنے اندر تو آدمی خود کو خود سے نہ چھپا سکتا ہے نہ بچا

سکتا ہے۔

تو سب سے اونچی آواز میری ہوتی زہد باد۔

میں جب ہندوستان کہتا ہوں تو اس میں بھارت اور پاکستان دونوں شامل ہیں بلکہ پچھلے دنوں کشمیر اور
کئی اور ملک بھی افغانستان بھی۔ اس صغیر ہند میں یہ سب شامل ہیں۔ اس سرزمین کی مقام ایسے آئے کہ میں
نے بھارت زہد باد کے لغزے کیلئے بھی آزادی اور کشادگی محسوس کی۔ بھارتیوں کیلئے پاکستان زہد باد کہنے
کے کئی مواقع ہوتے ہیں وہ کہتے بھی ہوں کہ گمران کی آواز کوئی نہیں سن پاتا۔ چلنے بھارتی لیزر پاکستان
مرد وہارت کہنے کی ہی قسم کھائیں جن میں کہیں گے ہم کہیں گے بھارت مرد وہاد، مرد وہاد کہتے ہوئے
آوی خود اپنے اندر مرنے لگے خود کو مارا ہے۔ بھارت میں بالخصوص جارحانہ پالیسیوں کو سیاست کا نام
دیا جا رہا ہے۔ ملک کے اندر فلاح و بہبود کی بات کہیں نہیں صرف باہر اپنی طاقت کا مظاہرہ ہو رہا ہے سیاست
کے معنی ہیں دھوکہ لوگوں کو، چٹاؤں کو، مسلمانوں کو اور اپنے آپ کو۔ دوسروں کو دھوکہ دینے والا
دراصل خود کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے۔ ایک انجمنی رویہ بزرگ خرو شیفت نے کہا تھا کہ کامیاب
سیاستدان وہ ہے جو ایسی جگہ چل جائے کہ پکا پھوڑ کرے جہاں سے کبھی نہری نہیں گزری۔ ایک انجمنی
بھارتی بزرگ (بزرگ کی مرثیہ) اندرا گاندھی نے کہا کہ سیاستدان وہ ہے بلکہ کامیاب سیاستدان وہ
ہے جو کسی جگہ ہمسایہ ملک (پاکستان) کا پل توڑنے کا ارادہ کرے جہاں سے کبھی نہ سرائی آئی بھی نہیں
گزرا۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہر پاکستان دوست ہندوستانی اور مسلمان ہندوستانی ہندوستان میں شکست ہے۔

قانون اور حق اور ملوی اور صدی اور باغی اور دوسرے ایسے مسلمان - مسلمان کھٹے والے پکے ہوا
ہیں۔ جب کوئی مسلمان رائٹر لکھنے کی کوشش کرے تو سیاست اسے بھی اپنے کھربے میں لے
لے۔ ویسے بہت کم کھٹے والے ہمارے ہوتے ہیں۔ اندرا بھی کھراؤں کی لکت کا نظریہ پان لوگوں
کا قلم ہے جو کھراؤں کی بوس رکھتے ہیں جی شاعر ادیب تو لکیر ریاست ہوتا ہے صوفی اور سانی بھی اسی
قلم میں آتے ہیں۔ سوویت یونین کا ایک مخرف یعنی "مسلمان" ہے سوویت شمس - روسی اپنے
مستور میں مخرف کو مسلمان سمجھتے ہیں ان کے لئے مسلمان ہے بڑا "کافر" کوئی نہیں - عظیم ادیب
سوویت شمس نے کہا کہ بڑا "ادیب ریاست کے اندر ایک ریاست ہوتا ہے یعنی وہوں ہمسائے ہوتے ایک
دوسرے کے "سوویت یونین اور بھارت کا جو سلوک ہمسایوں سے ہے سب جانتے ہیں۔ یہ دونوں ملک
اپنی اپنی ترقی کے مطابق چاہتے ہیں کہ ان کے ہمسائے میں کوئی ہو ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو ایسا تو جیسے بھارت
کے صوبے ہیں اور صوبہ بھی وہ جہاں مستقل صدر راج کاغذ ہو - سوویت یونین کے صوبہ جی بھی
حماقی حکومت کے ماتحت ہیں۔

آج رات جس کار میں ہم تھے وہاں بھی جیسے صدر راج کاغذ تھا۔ بھارت میں آبادی کی کثرت سے
لوگوں کا ہفت روزہ حال سے اس سے کم ہے اس کا راج تدارک تھا۔ یہ بھی ہوتا تو توجہ تھی - کھراؤں کے ہفت روزہ کاغذ
ہندوستان ہے ہر پار سے ملک کو - اس ملک کے لوگوں پہ مجھے یہ سادہ رحم آج بھارت میں اس قدر خود پ

ہندوستان یا بھارت

ہم تقریباً نو مزدور جس فاروقی کی کار میں بھر گئے کار سے
دیکھ کر بلکہ بیل گاڑی کا کام بھی لینے والے لیتے ہیں۔ کار فادری میں کام کو کہتے ہیں۔ اس کا پریکٹیکل
آج دیکھا۔ یہ بھارت میں بننے والی کار تھی۔ جو اس وقت زیر حاشی - بھارت میں باہر کے ملکوں کی کاریں
نہیں۔ اور بھی باہر کی چیزیں کہہ سکتے ہیں آئیں۔ سوائے مسافروں اور سیاحوں کے - مگر گھر کی چیزوں کی
حالات پتلی تھی۔ ایسی جو چیزیں پاکستان میں تھیں وہ بھارت والوں سے معیاری ہیں جیسے سائیکل اب
بھارت کے موٹر سائیکل سے ہمارے سائیکل کا مقابلہ دو مناسب نہیں۔ چیل کا مقابلہ کدو سے۔ یہ مثال
بالواسطہ بات مانتیں آپ خود لکھیں۔ ہم نے موٹر سائیکل بنانا تو چھوڑ دینا۔ ہمیں اتنی جلدی نہیں
شاید - بھارت اس مسئلے پر عمل کر رہا ہے۔ دو روزہ زمانہ چال قیامت کی چل گیا وہ یہ دو قیامت کو قریب
تر کر رہی ہے۔ بھارت کو یہ بھی فکر ہے کہ نہیں پاکستان کسی میدان میں اس سے آگے نہ نکل جائے۔
اس اس لئے وہ دنیا کے مقابلے میں پیچھے رہ گیا ہے۔

مقابلے کا شور مچا کے وہ پاکستان کو اپنے مقابلے پر لے آیا۔ بھلا فائدہ کس کا ہوا۔ مخالف کو
نقصان پہنچانے کے جن میں بعض اوقات اس کا فائدہ کیا جا رہا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہمارے گاؤں میں
نیل میاؤں میں مرقی ہوئی تو ہمیں - زیادہ سوخا ہونے مندوں کو دوڑ لگایا پانی آگے نکل گئے ایک محلے
کے دو آدمی ایک جاٹ دوسرا فقیر پیچھے دو گئے کچھ جاتی فقیر کے برابر آکر کتا
"کیتا ہاں فقیر" (تم سے آگے نکلنے والا ہوں فقیر)

سبے چارے فقیر نے دو تین بار تو صبر کیا پھر کہنے لگا

"جناب وہ جو سو سے زیادہ تیرے باپ آگے چارے ہیں انہیں کیوں نہیں کتا" (کاٹنا بھائی والا)

سے اور یہ کیتا کی کار وہ ہے)

بہر حال یہ تو ریکٹل مذکورہ بات تھی جی بہت بھارت والوں کی بیڑی تھی جو کئی باتوں میں ان کی بڑائی کا
ثبوت تھی کہ نہیں کرتے باہر کی کوئی چیز استعمال - ہماری طرح نہیں کہ اپنی چیز کے استعمال سے شرم
محسوس ہوتی ہے۔ کچھ افسر امیر و نازن پاکستانیوں کہیں چلے تو سانس بھی غیر ملکی لین کی کساتھ
ساتھ ہوا بھی باہر کی منکوائیں۔ اپنی کسی چیز خیال دیات کی باہر والے تعریف کر دیں تو بس ایک دم وہ چڑھ
جاتی ہے۔ ہم نے علامہ اقبال پر مشرقی قہن کے کہنے پر ہانپ لے لاہور میں کار دیکھ کر کتا ہے جیسے ہم تو بیس
پھر ہے جن آدمی میں ہم صرف آدمی نہ تھے۔ ہر آہٹ پانا ہم بھی اپنا۔ اس وقت کوئی ہندوستان کاغذ لگا

کھانے کی دعوت میں باگڑ بہ

ہم شریف آدمی کے گھر پہنچے تھے اور وہاں گولپی چند تارنگ بھی تھا۔ افتخار عارف اور جوگندر پال بھی تھا۔ افتخار عارف ہمیں والی کرٹے والا آدمی ہے۔ لندن میں اردو کی لٹری ڈال رہا ہے۔ دوسریوں کی گڈی چڑھا رہا ہے۔ بونکانی صداؤں کا انیس مناتا۔ سارے کے دھاکے اچھی چنگ کے ساتھ جوڑنا کرتا ہے۔ اس کی چنگ گولپی اڑی ہے۔ فی الحال اس کا ہواؤں کا رخ پچھتا رہا ہے۔ پاکستان فی وی کے ایک پروگرام "کسوٹی" کے ذریعے مقبول ہوا۔ شاعری کے ذریعے کس بل ٹکالے اور فی آر کی وجہ سے عام ہوا۔ اس کی ناپائنت اس وقت ہمہ فنی کے بس ہے سچی ہوئی تھی۔ وہ راپیلے کا اور کوٹ ہر وقت پہنے رکھتا ہے۔ اسے لٹے پٹے بازو دست پھیلاتے رہتے ہیں۔ گولپی لٹے سے پہلے ہاتھوں کی جھکڑی بنالیتا ہے۔ اسے دائرہ ہونے کی بجائے عمر تھانہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ پاکستان آچکا ہے اس سے بھول جانے والی ملاقات ہوئی تھی لیکن میں اسے بھولا نہیں۔ عطا نے ان دنوں ایک کالم لکھا تھا "باگڑ جانا میاؤں چوری سے ایک انڈیو" موصوف نے انڈیو لینے والے کی پیند کے انڈیوں کے نام گمن گمن کر رکھوائے اور یہ بھی کہا کہ اس کے علاوہ آپ جن کا نام لینا چاہیں لکھ لیں جبکہ کسی دوسرے آدمی کو انڈیو دیتے ہوئے اسی حوالے سے ہانکل دوسرے لوگوں کے نام لکھوائے۔ مثلاً موصوف نے گولپی چند تارنگ نے کہا "شوہر تاجپری بی ناول نگار ہے"

کہا کیا کتاب انہوں نے اب تک ایک بھی ناول نہیں لکھا۔ جواب ملا "لکھ لے گی جناب لکھ لے گی ناول بھی جس میں لکھ لے گی رست پر ناول ہو گا وہ "پھر فتویٰ لینے والے کو بھی فتاد کا خطاب دیا اور کہا کہ یہ باتیں آف دی ریڈار میں ہیں۔ انڈیو لینے والا ریڈار میں ہو کر اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اپنی گفتگو کو از نرم اور فیصلی جانتے ہوئے کہتا ہے مطمئن رہیں اس انڈیو کے چھیننے کے بعد آپ کو سب ادیب فتاد مان لیں گے۔ یقیناً عطا کا یہ کالم گولپی کے بارے میں تھا اب عطا گمن گمن مانتا تو یہ بھی ایک ثبوت ہے کیونکہ آجکل کچھ "بیڑے" لوگ اسے فتاد مانتے گئے ہیں۔

گولپی نے پاکستان میں تمام محفلوں میں ایک ہی تقریر کی صرف موصوف کی مناسبت سے نام تبدیل کر دیتے۔ وہ تقریر میں ٹکرا کا بادشاہ ہے۔ مشرق کی پیٹرو سٹیول میں اور ہوتا کیا ہے۔ رنرچ کا مطلب ہے لکھنوی ری لے۔ سیاست جہاں پیچھے کی مٹی ہو گا "بندے" کو گنا کرتے ہیں تو دشمن کرتے۔ یہ بھارت کی "ذہالی سیاست" کا ایک اور کرشمہ ہے کہ گولپی چند تارنگ جامعہ علیہ میں صدر شعبہ اردو ہے

رہا تھا کچھ پتے نہیں چل رہا تھا کہ ہم کہاں کہاں سے گزر رہے ہیں یا ہمیں کہاں سے گزرا جا رہا ہے۔ بس گزرا ہو رہا تھا۔ باہر کیا ہو رہا ہے کیا نہیں ہو رہا پس اتنی تہہ ہمیں کد رات ہے کالی۔ اسے اندھا بھی کر دیا گیا ہے وہ پاگل ہو کر چاروں طرف کھڑکی طرح کی ہوئی تھی اور ڈاکٹر شارب کا گھر آئی نہیں رہا تھا۔ وہ جو ایک عذاب میں مبتلا ہے مجبور ہوا اور کوئی گھرت آ رہا ہو وہ کیا کرے۔ اب میں کیا کہوں کہ بھارت کے غریب اور بڑھال لوگ کیا کریں۔ اس بات کی انہیں کیا سمجھ آجکل کہ رستہ ہی پٹنے والوں کا گھر ہے عمر میں تو رستہ بھی پٹنے والوں سے چھین لیا گیا ہے۔ پرانے رستوں کو پرانے رستے بنادیا گیا ہے کسی کو بند ذہبہ میں والی کے لڑھکا دیا جائے تو وہ مسافر کب رہا ہے چارہ۔ کسی دوسرے ملک میں یا دوسرے شہر میں تو نہیں جا رہے ہم۔ میں مجبوری سے ہی چوچھکتا تھا مگر اس کے اور میرے درمیان کوئی تھا۔ میں بھر کسی سوچ کی کار میں بیٹھا ہوں۔ اس طرح جیسے میں خود اس کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک محاورہ ہے "نی کی دنی بلانا" دنی بلی بن جی تھی یا توبلی نہیں جنگلی بلی جو جست لگائے آگے ہی آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔ ہماری کاریں جا رہی تھی جیسے چوہا باری چھانے میں بھاگتا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی سب کو لگ رہی ہوئی دلی میں یہ تیسری دعوت تھی دعوت تو ایک ہی تھی جس میں ہم مدعو تھے۔ راجدپ ہونے والے آدم پر کاش سوچنے کے کھانا کھاتے ہوئے ساتھ بٹھا لیا تھا یا واقف تھا اس لئے منافق نہ تھا ہمارا ایک دوسرے سے غرض وابستہ نہ تھی کسی کھانے میں ایک ہی خود غرض ہو تو وہ دعوت دعاوت ہو جاتی ہے۔ شارب کے بارے میں شدید تھی کہ شریف آدمی ہے شریف آدمی بالعموم ظالم کے ساتھ بھی انتہائی شرافت کا رویہ رکھتا ہے جتنا مظلوم کیساتھ۔ شریف آدمی دعویت کھانا باز یا دوسرے کھانا تم ہے۔

بھڑکے میں بھی گولی کا ہاتھ تھا اس وقت رات بھی بھڑکے کے موڑ میں دکھائی دیتی تھی اور بعد میں فارغ
 بیٹھنے والی بھی نہ تھی۔ خاصی ٹیجی ہو رہی تھی۔ اب کے ہم کار میں ابھی طرح تک ہو گئے۔ ایک آدھ آدمی
 کم بھی ہو گیا تھا مرگ نہیں رہا تھا۔ عجیب راحی تھی کم یا زیادہ آدمیوں کا پتہ ہی نہیں چلنے دے رہی تھی۔ اگلی
 سیٹ پر یکتا انتھار حسین شے میں کچھ کے جاری تھی۔
 ”کوئی خاتون کھائے میز پر ہرات میں پاکستان دشمنی کا رنگ جگہ جگہ ال دیتی تھی تنگ آ کے میں
 نے بھی سارا کچھ انڈیل دیا“
 وہ سب کچھ یکتا انتھار کے کار میں بھی انڈیل دیا تھا۔ بہت مزہ آیا انتھار حسین کی شریلی مسکراہٹ
 سے بھی زیادہ۔

وہ تو جامعہ طبر کا پہلا بندہ وائس چانسلر بننے کا عہدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اب تک کوئی مسلمان ہی جامعہ کا
 وی سی ہو تا ہے یہ جامعہ کی ایک ناخبر روایت ہے۔ وہ جامعہ طبر کبھی مسلم گزشتہ پندرہ بی و ال اعلیٰ کرنا
 چاہتا ہے۔ جامعہ کا وی سی کوئی بھی ہو مگر سازش کے ذریعے ایک روایت کو جلا کر تازہ کر دینی جیسے بغالمانہ فعل
 ہے۔ جامعہ کے علاوہ گولی اپنی منافقت جامع طور پر پھیلاتے چارو گرام پھانچا ہے۔ اردو ادب کے حوالے
 سے پاکستان کے کچھ علاقوں میں بھی یہ بد رو پھیلائی جا رہی ہے۔ ایک دفعہ گولی کے کسی ہی بیٹے نے افواہ اڑائی
 تو ایک شخص ہندو پروفیسر نے بے ساختہ کلوہاڑے میرے سنفرو پھونکا۔
 میں حیران ہوں کہ شعبہ اردو میں عجم خنی کو کھینے لے آیا گیا۔ ہر شے میں نمونے کے طور پر ایک
 آدھ آدمی رکھنا پڑا ہے باقی کے دانت کھائے اور کھائے کے اور۔ جامعہ طبر کے شعبہ اردو میں
 دھانے کا ایک اور دانت بھی ہے۔ کھانے کے سارے دانت گولی جی نے اپنے لئے رکھے ہوئے ہیں۔
 اس کے دماغ میں بھی ہر طرف دانت لگے ہوئے ہیں۔

وہاں میرا تعارف جو گندہ پال سے اپنے آپ ہو گیا کسی نے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف نہ
 کرایا۔ اصلی تعارف یہی ہوتا ہے پال کے افسانے ہم بڑی دیر سے پڑھ رہے ہیں وہ سارا وقت اپنے دور
 پاکستان کا ذکر کرتا رہا۔ شاعر و ادیب ظفر خان نیازی کی مختصر افسانوں بلکہ افسانوں اور نثریچوں کی کتاب
 ”چو کو رہیجے“ کا تین پانچ پال نے لکھا ہے۔ افسانہ نگار احمد داؤد کے لئے کہنے لگا ”یہ شخص میرے لوس میں
 تھل گیا“ احمد داؤد کی ایک کتاب کا نام ”دھن دار آدمی“ ہے اور وہ بہتر سننے دوست دار آدمی
 ہے۔ وہ قانع احساس کے علاقے میں رہنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اس لئے پہلے افسانوں کے مجموعے کا نام

”مفتوح ہوا میں“ رکھا ہے۔ پال کے پاس برٹش پریس ہے زیادہ اس کے گھر کو یاد کیا گیا ایک مندر تھا
 ۔ پال نے ایک افسانہ بھی اس حوالے سے لکھا ہے جس کے آخر میں میکان نماز پڑھنے لگ جاتا ہے۔ میں
 نے پال سے کہنا کہ مندر میں خراب ہوتی ہے۔ پال نے مجھے اس طرح دیکھا کہ اگر وہ افسانہ لکھ کر
 ”افکار“ کراچی کو بھیج نہ چکا ہوتا تو یہ دوبارہ لکھتا۔ میں اس دلچسپ ”آخریے“ کا افسانہ پورا سنتا چاہتا
 تھا مگر کھانا شروع ہو گیا۔ ایک مسلمان گھر کا کھانا پہلی بار نصیب ہوا۔ مسلم اور غیر مسلم کھانے میں کیا فرق
 ہے۔ یار لوگ مرغ مسلم کو مرغ مسلم پڑھتے ہیں کھانے کے بعد بیٹے بیٹے کی محفل ہوئی۔ لطیفوں کا سوا
 واٹر آہستہ آہستہ پیا گیا جو لوگ اس محفل میں موجود نہ تھے ”زیادہ لطیف ان کے بارے میں سنائے گئے۔
 یہاں زیادہ تعداد استادوں کی تھی۔ مگر عجم خنی نہ تھا۔ عنوان چشتی بھی نہ تھا بے عنوان لوگ بہت تھے اور
 بے استاد بے بھی۔ غور میں بھی جس طبعیدہ ”زنا“ ”ڈیپے میں۔ اس طرح کا ماحول دیکھنے کا یہ پہلا اور
 آخری موقع تھا۔ لطیفوں کی زو میں بہت آیا ہوا شخص باقر مصدی تھا اپنی عدم موجودگی میں اسکا موجود۔ لندن
 والے رالفہر سل بھارت آئے تو اس سے پہلے خورشید الاسلام نے باقر مصدی کو لکھا کہ ان کا خیال رکھ کے
 اور کوئی لڑائی بھڑکانہ کرے جب اسے خط ملا اور سل صاحب سے لڑ بھڑکا کر فارغ ہو بیٹھا تھا۔ اس لڑائی

دین اور دین

رات آخری کروٹ لے رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر بیٹھے بھی نہ تھے کہ ٹی وی پر فلم چلنے لگی۔ اب انہیں فلمیں ہی نہیں کہ اس کیلئے ٹھکن کو لگنا پڑا یا جانے۔ اگر سنی کی بھارتی حکومت نے ہمیں فلمیں دکھانے کیلئے ہی لگایا ہے۔ یہ فلم تحریک آزادی میں مسلمانوں کے ”غلط“ کردار کے بارے میں تھی۔ اس کردار کو کرنے کیلئے جو ایکڑ چٹا گناواہ ایکٹنگ بھی غلط کر رہا تھا۔ دو غلطیاں اس وقت ہم سے برداشت ہونا مشکل تھیں۔ ہم ٹی وی کو چن چھوڑ کر سو گئے۔ آواز باہر جاتی رہی اس وقت آنکھ کھل گئی جب فلم ختم ہوئی یہ بھی انوکھی بات تھی اٹھ کر بیٹھ کر دیا میں نے۔

اس رات ہم ابھی طرح سوئے دیر سے سوئے مگر صبح جلدی اٹھ بیٹھے۔ آج کی صبح کئی مہینوں سے مختلف تھی ہر صبح دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔ محسوس نہیں کر پاتے لوگ بس سیرج ہر روز اور کسی مقام سے ابھرنا ہے اور نئی جگہ پر غروب کرنا ہے سب سے بڑی اور سب سے چلی کتاب قرآن حکیم میں لکھا ہے (رب المشرق رب المغرب وہ مشرق کا رب ہے اور مغرب کا رب ہے) رب المشرق و رب المغرب (دو کئی مشرق کا رب ہے اور کئی مغربوں کا رب ہے) آجکل مشرق و مغرب میں مقابلہ و مناظرہ کرنے والے کہیں بھولتے ہیں کہ مشرق و مغرب صرف یہی نہیں اور بھی کچھ ہے۔ جبکہ مشرق اور وہ مغرب ظاہر ہو گا تو سارے کے سارے موجود قلعے و حصرے کے دھڑے رہ جائیں گے۔

گھر سے آدمی باہر ہو تو کسی کسی وقت لگتا ہے جیسے گھر میں ہی ہے اور جب گھر میں ہو تو۔ ایک یہ اہل دہک سمیت اندر آیا اور اس نے تھوڑی سی شراب کی درخواست کی۔ ہم نے اسے دیکھ کر اگلی ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن تھوڑے ہی ہو کر دو دہر چلا گیا بھارت میں یہ پملا آدمی تھا تو انا کچھ دانا لگا۔

ہم ہوئی چھبڑنے کیلئے ہر طرح تیار تھے۔ ہمارے سامان میں کتابیں زیادہ تھیں جو بھارتی ادیبوں کو پیش کرنا تھیں اور کتابوں کی فرشتیں تھیں جو یہاں سے پاکستانی ادیبوں کیلئے لیکر جاتا تھیں۔ فون کی کھنٹی بڑبڑائی دیا مارگر بول رہا تھا وہ مصر تھا ملک مصر تھا ملک لبنان تھا یہاں حال اس وقت وہ بھارت تھیں۔ مالک اس کے خدا کا نام ہے۔ خدا ہی مالک ہے۔ دیا مارگر کا خدا مالک ہو گا۔ بدھوڈھ میں بھی ذات پات کی قسمیں نہیں کھیں ہوتیں۔ سچو سچو بدھوڈھ تھے پہلے طب میں ہیں دونوں اس بات پر ناراض ہیں مذہب میں بدھوڈوں کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ فرقوں میں بڑھ رہی ہے اس وقت بدھوڈوں کی فرقہ ہوتے ہیں جب بدھوڈ مسلمان قداوت ہو رہے ہوں۔ مسلمان فرقوں میں زیادہ چھٹے گئے ہیں وہ مسلمان کہ شیعہ سنی بدلتی و بدلتی زیادہ ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک اجلاس کے دوران مولویوں کی طرف سے باجماعت نمازی

تجوید کر دی تھی کہ ہم یہ تاثر نہیں دینا چاہتے کہ ہم مسلمان کے علاوہ سنی شیعہ بریلوی اور وہابی بھی ہیں ذہم ایک ہیں چار پانچ چھ نہیں۔ قائد اعظم کی بصیرت کے مطابق یہ نماز ہمیں انھیں کرنی تقسیم کرتی ہے جو جڑی میں توڑتی ہے بلکہ توڑ پھوڑ کرتی ہے۔ قائد اعظم کی ذمے فطرت اور وقت کی طرف سے ڈیوٹی کچھ اور تھی یہ سوال کرتے والے کہ وہ نماز نہیں پڑھتا تھا جواب دیں۔ کہ برصغیر کے مسلمانوں نے صدیوں پرانی مذہبی قیادت کو ٹھکرا کر آخر محمد علی جناح کو قائد اعظم کیوں مان لیا جس کیلئے کفر کے قوت پرست سے ملانے وین آج بھی قائم ہیں۔ قائد اعظم نے مسلمانوں کیلئے جو ملک بنا دیا وہاں سنی شیعہ بریلوی دیوبندی رہتے ہیں ایک دور و مند اقلیت ان سب فرقوں کے خلاف ہے مگر لوگ اسے بھی ایک فرقے کا نام دیتے ہیں سہرا حال پاکستان میں سب سے زیادہ تعداد مساجد کی ہے وہاں نماز پڑھی جاتی ہے یہ تو ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے لوگ نظر تو آتے ہیں اب کیا خیال دیوبندوں کا اس واٹر گھٹی منڈے بے نماز کے بارے میں۔ اب بھی کچھ مولوی قائد اعظم کو دائرہ اسلام کے خارج کرنے پر بعد میں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو دائرہ حیات سے باہر کرنے کی جو کامیاب کوششیں ہو رہی ہیں کیا فرماتے ہیں علامہ دین محمد حسین صاحب اس مسئلے کے۔

اس دور میں جتنا نقصان مسلمانوں نے اسلام کو پہنچایا، کسی اور نے نہیں پہنچایا۔ پاکستان کو اصل خطرہ پاکستانیوں کی طرف سے ہے اور یہ کہنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ بھارت کو اصل خطرہ بھارتیوں یعنی بدھوڈوں سے ہے اور یہ کہ انسانییت کو تباہ کرنے والے صرف انسان ہی ہوتے ہیں۔ دنیا ایک بارود خانہ بنی جا رہی ہے۔ بھارت ایک موزہ بن چکا ہے اور پاکستان کو ایک قلعہ بنایا جا رہا ہے اور مناجر یکمکسب لائن مناجر بنیں سے پہلے بھارت سے بھی مناجر بن گئے تھے۔ مناجر بن کیلئے دو دروازے بند نہیں کئے جاسکتے۔ تاریخ میں بڑے بڑے عظیم لوگ اس قلعے میں نظر آتے ہیں ہم سب مناجر بن سب کے سب بے گھر کی سلطنت کی طرف سفر کرنے والے۔ مناجر بن اپنی اصل میں ایک ہی شخصیت ہوتا ہے۔ مناجر بن اور جلیبدن کا قبیلہ ایک ہی ہے۔ مناجر بن انشی سے چھڑا ہوا جھوٹا ہے۔ مسافر تو نہیں بھی ہوں ہم بھی ہیں۔ باقی دونوں حیثیتیں صلا مصلحتیں ہمارے اندر بھگی ہوئی ہیں۔ ہم سب اگلی بھنگے ہوئے ہیں۔ منزل ہمارے اندر ہے۔ مل جائیگی آخر۔ جو شے پاس ہوتی ہے آسانی سے ہمیں ملا کر مگر ہم بھی نہیں ہوتی۔

پر بھی۔ بعض اوقات گودھے پر آدمی کو اس طرح بٹھایا گیا کہ منہ آدمی کی طرف تھا گردھ کا نہیں آدمی کا نہ سیلو تھا اور گدھے میں ہار تھا جو تیل کا۔ آپ کسی کانام نہ لے دیں کہ میں کوئی پہلی نہیں بھجوا رہا۔ پہلی ضرور تھی میرے لئے کہ اونٹ کا تیل جھسکیں تھا میراں۔ اونٹ عربوں کا قوی جانور ہے اور مسلمانوں کیلئے مہار کا ہے باہر کے مسلمانوں کیلئے۔ مقامی مسلمانوں کی اتنی کون پروا کر تے تھے مگر کی مرثی والی برابر اور گھر کی دال کسی برابر نہیں۔ دال اور سبزی ہندوؤں کی بھی قوی اور ذہنی ڈش ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کو دال بھی کب سمجھا جاتا ہے۔ یہ اگر دال ہے بھی تو اس میں ریت اور ٹنکر والے ڈش سے زیادہ ملا دیئے گئے ہیں۔ حیرت یہ تھی کہ گائے کا بھسنہ تھا ہندوؤں کی مذہبی ماں بی کا۔ باجی کے بھسنے کا نہ ہونا سمجھ میں آتا ہے کہ بھارت کے سیاسی بڑ یا گھر میں اس کی پسند کا کھانا بھی نہیں بن پارہا۔ امریکا کا کھانا بھی بعض اوقات اپنے ہی دوستوں کو کھانے کی کامیاب ترکیبیں بتاتا رہتا ہے۔ روس کا سیاسی دورہ رچھ بھی نہ تھا جبکہ بھارتی ذہن میں جبکہ اس نے کھانیں لگا کر ہیں۔ گائے سرکوں پر آوارہ پھرتی ہے اسے کھاس ڈالنے والا کوئی نہیں۔

شنا ہے بھی بھوک سے لگ آئے ہوئے ہندو ایسی کوئی گائے بھون کر کھاتا ہے جس اور اس کا گھر کسی مندر کے دروازے پر لٹکا دیتے ہیں اور پھر ہندو مسلم فسادات میں شریک ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں بھی کئی مقامات پر میں نے ایسی ہی گائیں دیکھیں۔ مست پھرتی رہتی ہیں انہیں کوئی کچھ نہیں سمجھتا۔ سنا ہے فقیر منٹش اور آوارہ حراج گائے کا گوشت 'دودھ' لسی اور بھی بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ ایک بار ممتاز شاعر سلیم شاہد کسی نشے میں ایسی ہی ایک گائے کو سیکڑوں سے باز کر اپنے گھر لے جانے لگا تھا۔ لاہور والی گائیں کسی ولی کی نشانی ہیں۔ بھارتی والی کسی دیوی دیوئی کی۔ تو خود دیوی ہے۔ بھارت میں گائے کی موت کا منتر بہت دھمی ہوتا ہے۔ وہیچے کے تہنے پھرنے کی ادائیگی سے مختلف ہر تہنک کہ ایسی کا قمار ہے۔

ہوٹل سے ہوٹل

آج ہم ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل میں ہجرت کر رہے ہیں۔ مسافرت میں مسافرت کا لذت۔ شرمابی آکر سوچ صاحب کے پاس صاحب کتاب کرنے چاہئے تھا۔ یہ شخص ہمارے لئے اپنے سارے راجیلے، خاٹیلے اور راستے آزمایا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہمارے لئے خاصی رعایت کرانے لے آیا۔ کھانا پیا منافع گھاس ڈونے کے پیچھے میں نہیں لینے پائیں گے اور جو ہمارا 'شیخ' 'میراں' ٹونا تھا۔ خیر۔ سوچتی ہی چاک سے ملے خیر کلکی مسلمانوں کو خوش آئیے اور الوداع کہنے کا ایک ہی انداز ہوتا ہے۔ ایک طرح کی

گر جو شری ایک رنگ کی مسکراہٹ۔ سوچتی ہی اپنے ملک کا سربراہ نہ سہی اپنے ہوٹل کا مالک تو تھا سیاسی اصطلاح میں مالک کو سربراہ کہتے ہیں۔ بادشاہ صرف سیاہ و سفید کے مالک ہوتے تھے۔ سربراہان کالے گورے کیلے پیلے بزدل اور سرخ ہر رنگ کے مالک ہوتے ہیں بلکہ ہر رنگ میں مالک ہوتے ہیں۔

یا تری فراس پہنچنے کے خوش میں بہت نہ چلا کہ رستے میں کیا تھا کیا نہیں تھا۔ اچھا ہوٹل ہے یہ۔ اندرا بنی نے اچھے کام بھی کئے ہیں۔ میرے نزدیک ہر وہ کام اچھا ہے جس کے دوران اپنا دل برا محسوس نہ کرے اور دوسروں کا دل دکھے نہیں۔ یہ ہوٹل تو ہر لحاظ سے ہوٹل کی طرح ہے۔ ہوٹل والا اس کا نیپ ٹاپ اور چال چلن نہیں۔ ہوٹل کے محلے سمیت بھارتی لوگ کم تھے۔ اکثر غیر ملکی تھے۔ تقریباً ہر ملک کے باشندے یعنی 'ہر کاس کے طلبہ و طالبات' 'عرب بھی تھے' 'مغرب والے' زیادہ تھے۔ دوسرے بھی کہ نہ تھے۔ حرم زیادہ تھے جو تیس بھی تھوڑی نہ تھیں۔ ایک شہر میں ایک اور شہر بہت سے شہر۔ اس وقت بھی گراؤندہ طور پر میلہ سالگا ہوا تھا۔ خوبصورت چہروں کی چٹھیں اذری تھیں نیچے نیچے ہر طرف نظروں کی ذوریں ان کیساتھ کلی تھیں کئی ایک دوسرے کی ڈور کاٹنے کی فکر میں نہ تھا۔ کمرے کی چھایاں ہمیں مل رہی تھیں مگر ہمارا جی نہ چاہتا تھا جانے کو۔ سامنے جمال دیا اور راحت جان کے کئی دروازے بن رہے تھے۔ ہال کے صحن بچوں میں اونٹ کا بھسنہ کھڑا تھا اس اونٹ میں اتنا فرق تھا کہ اس پر سواری نہ کی جا سکتی تھی اگرچہ یہ کہیں جانے کیلئے تیار آ رہا تھا۔ اونٹ ہوتا بھی تو ہم کو کسی سواری کریتے۔ اب اونٹوں 'گھوڑوں' ہاتھیوں پر سواری کے دن گئے تھیں میں تو گئے شہروں اور سرساقوں کا زمانہ اور اوڑھتا ہے۔ ذیلے بھی بھارت میں دیسات اور شہری زندگی میں کم از کم ایک ہزار برس کا فاصلہ ہے اس کو طے کرنے کیلئے اسی طرح کی سواری چاہئے۔ سواری بھی اور چاہئے۔ کھوڑے باجی موٹر ویل اور جہاز سے مسافروں 'مناجروں اور مجاہدوں نے اپنے اپنے زمانے میں خوب کام لیا ہے۔ سواری شیر پر بھی کی ہے حضرت آدم نے اور گودھے

دونوں جرنیوں کا حسن استزاج

بھوک نے اطلاع دی کہ وہ ہرگز بچکی ہے۔ وقت گزرنے کی اطلاع تو ہمیں نہ کہیں سے کسی نے کسی طرح مل ہی جاتی ہے۔ یہ نرہوں کو خصوصاً بڑوں کو کوئی بتاتا ہے کہ صبح ہونے والی ہے اور کئی جانوروں کو بھی پہلے یہ چل جاتا ہے کہ زلزلہ آنے والا ہے۔ وینس میں ستریمز کا فطری نظام کتنا مضبوط ہے۔ ڈانگس ہال میں کس سے انداز کا ہے کئی کاؤتھرتے چائے کٹائی مغربی کھانا بڑی بائیزی (یہ تان وینٹرن کا ترجمہ ہے) یعنی گوشت خوردہ تان بھی بھارت میں گوشت خوردہ تان میں کھنچا جاتا ہے۔ شرابیہ ہے کہ کھانے والا مسلمان ہو۔ میں نے بڑی کھانے کا رادہ کر لیا۔ اور ڈانگس ہال کے کنارے کنارے بستے ہوئے امیرین کہیں میں چھہ کر میز بچانا شروع کر دی۔ ہمارے ذہن میں سیلف سروس کا خیال نہ آیا تھا۔ یہ کہیں شاید ہندوؤں نے اکبر اعظم کی یاد میں خواجے تھے لوگ ان میں بیٹھ کر یوں لگ رہے تھے جیسے جھروکے میں رعایا کو درشن دیتے آتے ہوں یا پھر یہ کوئی جملہ عروسی ہوئے ہوئے لہجے اور جھرمے کی طرف ہے۔ کبھی نہیں بھی ہوتا۔ لیکن دشمن تو ساتھ والے کہیں یعنی جھروکے یعنی تھنے میں بیٹھی تھی۔ ایسی لڑکی تھی جو اپنی فطرت میں معصوم اور سرور مزاج لیکر آتی ہے۔ مغل شہزادی تھی کوئی اپنے کسی پہلے جنم میں قیفا مغل شہزادی ہوئی اس سے پوچھا جاتا تو وہ بتاتی کہ وہ ساتویں بار سات سمندر پار سے آئی ہے۔ وہ ایک لکھنؤ کی لکھنؤ تھی جو اس ادا میں بیٹھی تھی۔ وہ مجھے ایک لکھنؤ کی لکھنؤ تھی۔ بار بار میز بچاتے دیکھ کر یاس کر اپنا کھانا چھوڑ کر آئی اور کسی زبان میں کچھ کہا جس کا ترجمہ میں نے یہ سمجھا کہ وہ اپنی میز پر بلاری ہے میں فوراً سے پہلے اٹھ کر اس کی میز پر جا بیٹھا وہ تھوڑی سی پریشان ہوئی تھوڑی سی حیران ہوئی تھوڑی سی خوش ہوئی۔ ضرور ہوئی ہوگی کہ میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ ڈھونڈ لی اس کی اس کے چہرے پر مسکراہٹ ڈھونڈنا اتنا ہی آسان تھا جتنا اس کے سر پہلے پرچہ وہ ڈھونڈنا نہ ضرور کے وجود میں ہر عریض میں متاثر بہت کچھ مل جاتا ہے۔ کچھ لذت کی طرح مزیدار چوتھے دیکھ کر منہ پر روتی آجائے۔ اس شان والی خاتون کا چہرہ بھی ہوئی آنکھوں کو بھی تلاش کی فطرت سکھاتا تھا مغرب کے لوگ بھی اتنے بھولے بھالے سے سندھ ہو سکتے ہیں جیسے ہیں لیسان جہاں کا بھی ہو اس کی اصل اصلی ہے۔ کچھ اور معصوم اور اس کو بھولنا کھانا بھی اس کے بس میں ہے اس نے پھر کچھ کہا میں نے اس کا ترجمہ بھی از خود کر لیا آپ کیا لکھنا کھانے چاہتے ہیں "اس وقت اس کے علاوہ کیا کہا جاسکتا تھا۔ ایک حرف کا معنی ہم دونوں کو آتا تھا۔ وہ جینتوں۔ وہ پہلے ایک دفتر نما کھوکے پر بیٹھے ادا کئے۔ ریدی اور پھر دینتوں والے کاؤتھرتے وہ کھانے اٹھ کر بیٹھ کر دیکھ دیئے اور سامنے والی کمری پر اپنی ہی علامت سے اپنے آپ کو بھی رکھ دیا ہم کھانے سے بہکام

ہوئے میری آنکھیں اس کے چہرے پر لکھا ہوا کلام پڑھ رہی تھیں۔ ادب عالیہ کا ناؤر چٹپوہ۔ وہ جرمیں تھی۔ مجھے اس وقت اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ وہ مشرقی جرمیں کی ہے یا مغربی جرمیں کی۔ دونوں جرمیوں اس پر فخر کر سکتی ہیں۔ جرمیں عورتوں کے بارے میں لوگ شہزادوں میں لکھا ہے کہ بہت وفادار اور مرد دوست خاتون ہوتی ہیں بھئی عورت کی وفا شہزادی کا بھی سن رکھا ہے یہاں بھی ہوتی عورت کو صرف جرمیں زبان آتی تھی یہ نہیں آتی تھی کہ نہ آتی تھی جس طرح ہم میں سے بہت سوں کو اردو میں آتی پھر بھی ہم کو شش کرتے ہیں بھائی پڑھنا اور ادا میں آتی اور ہم اس کیلئے کو شش بھی نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ غلط سلف انگریزی مارتے رہتے ہیں۔ انگریزی مارنے کا محاورہ کتنا میٹھا ہے۔ زبان تو آدمی بہت سیکھ لیتے ہیں مگر زبان میں اس خاتون نے خاطر داری اور صمان نوازی کی۔ اس کا ترجمہ بھی ہر زبان کے لڑکچیں میں پڑھنا چاہئے۔ اس نے اپنا نام بتایا ایسا نام تھا جو ممتاز سفر نگار کچھ کاظم اپنے سفر نامے میں بار بار استعمال کرتے ہیں وہ پہلی گئی تو اس میں ہوا کہ ڈانگس ہال میں ہو گیا کسی ایک شے یا شخص کے نہ ہونے سے اختلاف کیا کیوں پڑا ہو جاتا ہے۔ اس لڑکی نے میرا نام پوچھا تھا نہ کہہ۔ میں اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔ جیسے وہ خوابوں میں میری نیند کا بہتاد یا تھی جس میں آدمی ڈوب ڈوب کر تیرتا چلا جاتے۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ کیوں نہیں۔ عجیب بات ہے دنیا میں اچھے چرے والے لوگ کم ہیں اچھے دل والے ان سے بھی کم ہیں۔ محبت کرنے والے دور رکھنے والے حسن ظاہری اور حسن باطنی اپنے اندر مشترک کرنے والے ممبر کرنے والے شکر کرنے والے لوگ کم ہیں بہت سی کمر پوری دنیا میں یہ لوگ اقلیت میں ہیں۔ سارے ملکوں میں سارے جہاں میں اصل اقلیت ہیں لوگ ہیں۔ ان کا جو استحصال ہو رہا ہے اس کا کچھ حساب نہیں کیونکہ میں اس کو تقریباً بیچھٹے دوسری طرح کے لوگ ہونے کا علم اور بے درد "بد صورتی اور بدبو کا اپنے اندر نہ کرنا کرنے والے اہل پیش اور اہل پیش۔

اُردو گھر میں بے گھری

سینے کی طرح۔ ایہوں کی گردن گنگ نے مہم بھی پیدا کر رکھا تھا اس طرح کے جلنے اس لئے نہیں ہوتے کہ پاکستان سے کوئی جنون لکھنے والا آیا ہے۔ پاکستان میں بھارت دوستوں کی تعداد میں اضافہ کرنا مقصود ہوتا ہے کچھ لوگوں کے نزدیک بھارت دوست ہونے کا مطلب پاکستان دشمن ہونا ہے۔ حکومت ایسے لوگوں کے ذریعے اپنے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ان کے مفادات حکومت کے مفادات سے زیادہ گھنیرے ہیں۔ مقصد کچھ بھی ہو اس کیلئے ستر آہیں کا انتخاب ضروری امر ہے بھارتی لکھنے والوں میں اچھے اور بچے لوگ بھی ہیں۔ ان کے علاوہ نائن رائٹرز یعنی غیر ادیب ہمیں زیادہ اپنے اپنے گلاب دوست لوگ انسان دوست بھی ہوتے ہیں۔ لوگ محبت اور دوستی کی فضا پیدا کر سکتے ہیں اس فضا کو ہر خود لافظادوں اور محققوں کے اندھے خوابوں سے بچانے کیلئے کسی نہ کسی کو بچھڑنا پڑے گا۔ ورنہ لوگ خواب دیکھنے کی قسمت گھٹا جائیں گے۔ خواب اور انقلاب کے رشتے سے انکار کر دینا کوئی عمل نہیں۔ افکار اور خواب کی مشترک ترقی روایتوں کی اہمیت نہ مان کر ہی حکومتوں نے منافقوں کو دوستی کی حفاظت پر مقرر کر دیا ہے۔

تقریب کے بعد ایک دوسرے سے متعارف ہونے کی رسم کچھ دیر تک ادا ہوئی رہی۔ مختلف مسائل کی تصویریں بنی رہیں وہ لوگ جو ملنے ملائے کی جلد بازی میں مبتلا تھے ان کی آنکھوں میں بے نیازی کی کشش کیرب کی آنکھ سے زیادہ حساس تھی جہم میں سے بڑی دیر کے بعد نکل آئے والے قرائدین اور ان کی جگہ بہت جرات سے ملے۔ دونوں ایڈیڈ کیت ہیں۔ بزرگ شاعر اسرار ذہبی کی عدم موجودگی پر حرت کردہ کتاب میں شامل میرے مضمون ”شاعری میں عدم کی موجودگی“ پر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ مگر میں انگشتوں کا کس کو یاد تھا ایک دوسرے کے بارے میں بحث بننے کی آرزو اور ہر اڑھڑکھ رہی تھی۔ اس گیند کی طرح جو پھٹ چکی ہو مگر لوگ اس سے کھینکے بلکہ کھل کھینکے پڑنے ہوئے ہوں۔

ہمارے اردو گھر پہنچے۔ میاں صاحب خانہ ڈاکٹر خلیق انجم ہے اس کی بیوی ہندنی ہے۔ ابھی بے ہمت سی باتیں ڈاکٹر کو اس سے سیکھی جا چیں اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ وہ خلیق بھی ہے اور انجم بھی ڈاکٹر خلیق انجم بھارت کی راجیہ سیمپلنگ ہاؤس آف لارڈز کا ناظرہ ممبر بننا چاہتا ہے۔ جمہوریوں میں ناظرہ کیوں کے تصور سے ہی وحشت ہوتی ہے۔ دنیا کی قدیم ترین جمہوریت برطانیہ میں پورا ہاؤس آف لارڈز ناظرہ ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں ناظرہ کیوں سیاسی جوتز اور اقلیتوں کو بلیک سیل کرنے کا عمل ہے۔ اقلیتوں والے اہلیتوں والے اس کے بغیر ”ایران جمہوریت“ میں آئی نہیں سکتے۔ وہ نہ جیت سکتے ہیں نہ ہار سکتے ہیں یہ وہ انتخابی نہیں لڑ سکتے اس حال میں ناظرہ اور ناظرہ ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ خلیق ممبر بن سکا تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوگی۔

اردو گھر میں انتظار حسین ”عطا الحق“ کا بھی اور افتخار عارف مہمانان خصوصیت تھے۔ چونکہ میں بھی پاکستان سے آیا تھا ان کے ساتھ بھارت یا گیا پاکستانی ہونے کی فضا بھارت میں جگہ جگہ محسوس ہوتی جیوے پاکستان کتنا اچھا لفظ ہے۔ یہ جیوے پاکستان کا نعرہ ہے ہند کے مقابلے میں نہیں بنایا گیا مجھے یہ لفظ بہت اچھا لگتا ہے مگر نعرہ تو پاکستان زندہ باد ہی ہے۔

عطا نے اپنا مشورہ مزاحیہ ”اندوین کے جن کا زوال“ سنایا اس کے اکثر فقرہوں پر شعروں کی طرح دالوائی گئی کبھی اپنے زوال کا بیان بھی آدمی کو غروب بخش دیتا ہے۔ اس دوران انتظار حسین کتاب سے موزوں الفاظ تلاش کرنا رہا اس نے جلدی میں اپنے الفاظوں کی ابھی طرح تلاش نہیں لی تھی۔ اس کے افسانے پڑھنے کی چیز ہیں سننے کی نہیں ہم از کم خود اس سے سننے کی توہر گز نہیں۔ افتخار عارف نے بہت سی چیزیں سنیں اور محفل کو مجلس بنادیا وہ بڑی آسانی سے مشاعرے کو میدان اور میدان کو میدان کر بلا بنا دیتا ہے۔

قائد مجاز میں ایک حسین بھی نہیں

منیچہ پر پاکستان کے دوست ایلیے شاعر کوثر مندر سنگھ بیوی کی موجودگی سے پورا متحرک ہو گیا رہا تھا۔ کچھ سوچنا تو بہت سونا ہوتا ہے۔ آخر میں مالک، رام نے صدارتی خطاب دیا۔ جو مندر پاک کے روادار کے بارے میں تھا جو اردو ادب کی وجہ سے تم ہو سکتے ہیں بے چارے مالک صاحب کو کیا معلوم کہ پاک و ہند کے کچھ ادیب مرا سم اور مفادات کو ایک ہی لفظ بنا دینے پر مل گئے ہیں بھارت میں بہت لوگ بریٹان تھے کہ آخر ایسے آدمیوں کو حکومت کی شک کیوں ہوئی ہے اردو گھر کا کچھ نہیں یعنی بال بستان تک ہے کسی متعجب کے

ترکمان گیتے بھارت منظر

نہاے ہم کہاں کہاں

ہے گزرتے ترکمان گیتے پیچھے۔ کاریں رکیں ہم آدے گئے اب پھیل چلا تھا اور خاصا ملنا تھا۔ سامنے ایک حصار تھا حاضری کا وقت تھا ہم نے اپنی نگاہیں اندر بھیج دیں کہ خود بھی چلے جاتے تو کی جگہ کرتے۔ شاید یہاں انگریز تقسیم ہوا تھا بدراستی چاہا کہ ہمیں نظر وال دیں انھیں صاحب کا کھانا خوب ہو گا مگر نظر کے مقابلے میں کیا ہو گا

دل دریا سمندر میں دوٹوئے کون دلاں دیاں جانے ہو

انھیں صاحب سمندر میں نہیں ہیں مگر ساحل تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اس وقت سوچنے والی بات یہ تھی کہ نظر اور دعوت میں کیا فرق ہے۔ اب تو شاید انا ہو۔ جب صحیح معنوں میں اللہ والوں کے نظر چلتے تھے۔ ایک جہاں کھانا تھا میر ہو کے۔ بلکہ سیر کر کر کے۔ مگر ہم نہ ہو ابھی کچھ سمندر سے چاہے جتنا پانی نکال لو۔ اب کوڑے بھی کوڑے چاہے ہیں کوڑے میں سمندر بند کرنے کا کھلا روہ گیا کہ امریکی کتوں میں۔ وضو کرنے والے بھی نہیں رہے۔ استنہا بھی کاغذوں سے ہوتا ہے۔ کوڑے کا صحیح استعمال نہیں رہا۔ سمندر کا کہاں ہو گا سمندر تو میدان جنگ ہے۔ اور دل دریا خشک ہوا پڑا ہے حضرت بابو کے حصار پر کیوڑن کے چموروں اور گدڑی فٹپوں سے زیادہ صاحب فخر ہیں

سائوں آدڑی ماراؤڈا پھو ساہاں آڈی آڈی بارے ہو

اب لوگوں کا کوئی ضروری کام نہیں سوائے تازی مارنے یعنی تالی بجانے کے۔ سامعین بھارے تالیاں بجاتے ہیں۔ مقرر صاحب میڈر صاحب میں جاسیں گے جب تک وہ تقریر ختم نہ کر لیں یا ان کی تقریر ختم نہ ہو جائے وہ لوگ کیا لوگ ہیں تو عمر محدود سروں کے لئے تالیاں بجاتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے کبھی تالی نہیں بچتی ممتاز صوفی دانشور ادیب اشتقاق احمد کو ایسے لوگوں کا کشت خیال رہتا ہے

سائوں آڈی ماراؤڈا پھو

کیوڑن حصاروں پر رہتا ہے انور میں بسر کر تپے اور مغرب میں دانائی کا میل ہے مشرق میں نادانی کا کبھی دانائی اور نادانی میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی اصل مقام ہے۔ جب علم ڈگری کا نام نہ تھا۔ لوگ زیادہ مذہب زندگی بسر کرتے تھے۔ جہیز صادق تھے اور رشتے بچے تھے۔ اب بھی ایسے لوگ زیادہ پر سکون اور بھرپور زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہم مہرے علم لوگوں نے نہیں بنایا۔ جب دوائیاں اتنی کثرت سے نہ تھیں تو لوگ اتنے بیمار نہیں ہوتے تھے۔ جب کاریں گاڑیاں مجاز نہ تھے تب بھی سڑک لینے تھے لوگ۔ زیادہ اچھا سڑک لینے کے فاصلے کم ہوتے اور ریلے ٹپے گئے بدل والا ٹوٹا صاف تھا۔ میں تعلیم یافتہ اور

ترقی یافتہ قوموں اور لوگوں کے خلاف میں بھی علم دوست اور منصب کی طرح دوسروں پر رعب ڈالنے کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مقابل کو اس داؤدے مارنے کی کوشش کی جاتی ہے جسے وہ جانتا نہ ہو۔ ڈاکٹر اس وادی سے مرعیں کا علاج میں کر سکتا جس کے بارے میں اسے (مرعی کو) پتہ ہو۔ پہلے حکیم علاج جس طرح کرتے تھے انھیں صمدی کئے گا یا ہاتھ بڑا دل میں دفن رہتا حکیم صاحب کے قبر میں دفن ہونے تک۔ اس لئے عام لوگوں کا جلدی قبر میں جانے کا پروگرام میں بننا قیاد مگر سے نہیں نکلتا ہے قبرستان کو چارہ ہے ہیں۔ پہلے قبرستان شرسے باہر ہو کرتے تھے اب قبرستان کے کئی قبرستان ہوتے ہیں۔ کچھ بستیاں ہوتی ہیں شہروں میں کہ ان پر شر غوشاں کا گلہ گزرتا ہے ہم چل رہے تھے کوئی پرانی آبادی تھی۔ اور حصار غوش بندر دوازہ ہر طرف اندھیر لگی ہیں اکا کا لوگ تھے جو نہاے گئے دیکھ رہے تھے۔ گلی کی بد حالی اور تاریکی جیسے لوگ ایک دہلیز پر ہواں گورت چمبی تھی شاید بڑھاپے کا انتظار کر رہی تھی۔ بھارت میں غریب حور میں ایسے ہی رہی ہیں جیسے جیسے انھیں مار رہی ہوں۔ وہ رحمت میں کر سکتی خدمت کر سکتی ہیں۔ بن ہاں سے لے سکتی ہیں طلاق میں لے سکتیں۔ وہ کسی کا انتظار نہیں کر سکتیں۔ آجائے والے پرلے اور بے کے جھوٹے کا اقتدار کر سکتی ہیں۔ انقلابی دانشور لیڈر جیڑن میں ڈالے گا تھا "عورت ڈہرے احتمال کا فلاج" ایسی حرورت سے کچھ دور ایک بوڑھا جوان کی امیدیں موت کو بڑا رہا تھا۔ بھارت میں غریب بھی بوڑھی ہوتی جارہی ہے۔ بوڑھا پانچ غریب ہے۔ ہندوستان کو بڑھاپے اس بڑھاپے کا وقار جدید بھارت کھلیا۔ بھارت نے کسی میدان میں بہت ترقی کی ہے تو وہ میدان جنگ ہے۔ میں اس میدان سے نہیں گزرتا ہاتھ بھر بھارت میں اکثریتوں پر یہ میدان بچھا دیا گیا ہے۔ ایسے میں سڑک کو انگریز میں لکھنے کوئی چاہتا ہے۔ یہ باتیں بھی انگریز کی کار بڑھ چکی ہیں کہ بھارت مردے کھانے والوں کا دیس بننا چاہا ہے یہاں ہر شخص میں پائیس پچاس پچے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تعداد سو ہونے والی ہے سالانہ ڈیڑھ دو کروڑ کی آبادی کا اضافہ ہوتا ہے جو ہر اعظم آسٹریلیائی جموں آبادی سے کم نہیں۔ بچنے غریب میں چاندانی گردش پوری کرتا ہے بھارت کی پہلے سے لدی پھنڈی منڈیوں میں دس پندرہ لاکھ نئے مزدور ملحق جاتے ہیں۔ اگیندر پچاس برسوں میں یہ دنیا کا ملک ہو گا۔ بھوک مٹنے سے روز گاری کا قید خانہ بلکہ معویت نماز۔ ایک معاشی معاشرتی موضوع پر کسی کے لیے اب فکر بہت سنی فزین ہیں۔ بچے کے تاریخ عالم میں انسانوں نے اپنی غیر انسانی زندگی کم کر لی اس وقت بھی لاکھوں لوگ روٹی کے ایک تھے کے لئے ترس رہے ہوں گے۔ حکومت کے ماحول میں سے کوئی پھٹے کہ انھیں مکھن بیوگوں کا علم ہونے کے بعد بھوک کیسے اٹھتی ہے پاکستان اور دوسرے جہاں ملکوں سے خطرے کا سامنا کیا کر لوگوں کا پیٹ میں اچھا سا کھانا کتا ہوں کہ بھارت کو خطرہ بھارت سے ہے۔ یہ ملک اپنے آپ کو کشت دینے والا ہے۔ فاکر نے والا ہے اپنے آپ کو بھارت میں انکو کر کسی سوشلزم اور سیکولر ازم کا ایک جیسا حال ہونے والا ہے بھارت میں سوویت یونین والا سوشلزم نہیں چلے گا۔ ڈیڈو کر کسی برطانیہ والی نہیں چلے گی سیکولر ازم کے لئے میرے ذہن میں کوئی مثال نہیں۔ کوئی مثال ابھی ہے نہیں۔

ہندوستان کے ایک سابق انگریز حکمران لارڈ مونیئر نے کہیں لکھا ہے کہ عام غریب ہندوؤں کی زندگی حیرانی و غلط فہمی تک محدود ہوتی ہے۔ ان کی پوری زندگی جس پیشے میں صرف ہوتی ہے۔ اس پیشے میں بھی ان کی سمارت کسی معمولی جانور سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ ایک تیل یا ہندو سے زیادہ صلاحیتوں کے مالک نہیں ہوتے۔ انسانوں کے لئے ایسی رائے دینے والے کی انسانیت پر بھی شک ہے مگر جو کچھ بھارت میں ہو رہا ہے۔ ہو چکا ہے ہونے والا ہے۔ یہ رائے خوفناک اور خطرناک حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ تیل اور ہندو کو خوراک کی تلاش میں اپنی پریشانی اور مشقت نہیں ہوتی ہوگی۔ یعنی بھارت میں انسانوں کو حاصل رزق کے لئے ہوتی ہے پھر بھی بھوک ان کا رزق ہے۔ عام بھارتی مظلوم حقوق میں پشاور کیلنگس کھتا ہے۔

”ہندوستانی آدھے آدھے شیطان ہوتے ہیں بھلا کر یہ کیا پائی پئی۔ جس دھوت کو ہم چارے ہیں۔ اس میں وہ سارے لوگ شریک کئے جانے چاہیں جو دلی کے ترکمان گیت میں بھوکے سوئیں گے جاگ رہے ہوں گے۔ وہ بھوکے کو نیند کیسے آتی ہے ایک شے سیاسی غربت بھی ہوتی ہے تو میری دنیا کے چھوٹے ملکوں میں کثرت ملتی ہے۔ پاک بھارت سرحد پر مہاجرت کے ارادے سے دو کسٹرن کا کالہ کتنی بڑی حقیقت ہے۔ بعض اوقات لیٹنے بھی گھرے لیٹے کی تر بھائی کرتے ہیں۔

ادھر کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ ادھر بھونکنے کوئی نہیں دیتا۔

گھر دونوں طرف لوگ ہیں جو یہ دونوں کام پیٹ بھر کر اور دل کھول کر کرتے ہیں۔ ان دونوں طرح کے کام کرنے والے لوگوں نے کام خراب کر رکھا ہے بھوک اور زبان بندی ایک جیسے ظلم ہیں۔ ویٹ کی پرچی اور راجن کارڈ دنیا کے ہر انسان کا حق ہے۔ یہ حق اپنی پوری عملی معنویت اور دیانت کے ساتھ۔ ترکمان گیت کی اس پریشان حال گلی میں کسی دروازے پر نام کی پینٹ نہ تھی۔ گھنٹی کب ہوگی۔ بٹنے گھروں کے دروازوں پر گھنٹیاں لگی ہوتی ہیں پتھر اور کان و سٹک کے لمس اور آواز سے نا آشنا ہوتے جا رہے ہیں ترقی یافتہ علاقوں میں گھنٹیاں خطرے کی گھنٹیاں بننے والی ہیں اور امیں خبر تک نہیں غریب بستیوں کا رخ بڑے لوگ کرتے ہی نہیں۔ میراجی چالاک کسی کارڈوازہ ٹھکنے والے۔ دھڑول والا کھانا پورا پورا اٹکتا ہے چھ لے کے گرد بیٹھ کے کھانے میں حرازی اور ہے۔

ہم موڑ مڑ چکے تھے۔ سامنے ایک مسجد تھی بلند۔ کئی بڑھوں کے اوپر چوڑے پر بنی ہوئی مسجد میں جانا میری قسمت میں کب تھا۔ کم کم اندھیرے میں وہ اور پر ٹھونگ رہی تھی کسی نے مجھے بتایا کہ یہ کوئی مقبرہ ہے۔ تھانے والے کو یہ پتہ نہ تھا کہ کس کا مقبرہ ہے۔ میرے دوبارہ پوچھنے پر اس نے کہا کہ جناب مرنے والے کو میں نے نہیں مارا تھا۔ اور نہ یہ مقبرہ میرے کسی رشتہ دار سے تھا یا مجھے کسی مظلوم کوں تھا۔ یعنی یہ کیا کہہ رہے کہ اسے مسجد اور مقبرے کی پہچان ہے۔ وہ ٹھیک تھا میں معبود اور مرقمہ بھی فرق نہ کر سکتا تھا۔ فرق رہنے ہی نہیں دتا زمانہ تبکو تھیں تو خواہ کوا وہ بے ہزار اور خستہ ہو جاتی ہیں قاتل اس بات کی پرواہ نہیں کرنا کہ مقتول دو چاروں بعد دل کے دور سے سے بھی مر سکتا ہے۔

مجید یا مقبرے کے سامنے پہنچ کر ایک چھوٹا سا موزم کہم دھوت خانے میں پہنچ گئے تاریخ میں کئی موزا لے گئے ہیں۔ ہر موزا آج کی طرح بظاہر ایک بھوتی سی ضرورت تھا۔ جو بہت بڑی عروسی بن گیا عروم ہونے اور مرحوم ہونے میں فرق نہیں بل۔ بس ذرا مرنے کی دیر ہوتی ہے۔ کہیں ادھر لوہر دائیں بائیں دکھانے میں دیر تھی یہاں بھی ارد گرد والی حالت تھی۔ جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ جس کو کہیں جگہ ملی وہ بھی بیٹھ گیا کہاں کیسے یہ سوچنے کا اس وقت وقت نہ تھا۔ حکیم صاحب ایک رسالے ’آزادی ہندوستان‘ کے کدیر ہیں۔ اس کدیرے میں بھی کدیرے کا راج تھا تصویریں چھپوانے کا شوق زوروں پر ہے لوگ اٹھ اٹھ کے بیٹھ رہے تھے۔ یہاں وہاں جہاں کدیرے کی زد میں آسکیں اس کے بعد کھانا ان کی زد میں تھا۔ اوپر کے ایک کونے پر کھانا تھا لوگ کھانے کی میز پر جھوم کر گئے۔ ٹیبلین کم تھیں پیچھے زیادہ تھے۔ تھوڑی سی نفسا نفسی کا عالم ہو گیا۔ ایک زمانے میں خاکسار اعظم علامہ مشرقی کا بیٹے سیاسی اسٹلے کے طور پر استعمال ہوا تھا۔ اب سیاسی چچوں کا دور ہے ان سے ہر طرح کے اسلحہ کا کام لیا جاتا ہے۔ کئی ہم چچے کی شکل کے بننے لگے ہیں۔ چچے اور آدمی میں بھی بہت مشابہت ہوتی جا رہی ہے۔ خاکسار سے غائبی تک زیادہ دیر نہیں لگی۔

بینکا گاندھی کی سیاسی مردانگی

سیاست میں کھانے پینے کا ہوتے ہو گیا ہے۔ اب اپنی سیاست کا بھی زور ہے۔ اس طرح کی محفلیں ہو گئیں ہیں۔ دوسرے وقت کے لیڈر کرنے کا اندیشہ لگ جاتا ہے یا لوگوں کو۔ عورت بھی لیڈری کے شوق میں مردوں کے حقوق پر قبضہ کرنے کوئی کھڑی ہے اب کچھ مرد بھی کچھ کرنے پر ڈٹ گئے ہیں پہلے بھی سب کچھ اسی کا کیا حرا ہے اس مقابلے میں کچھ مرد عورتوں سے آگے ہیں۔ بلکہ عورتوں کے آگے ہیں۔ حقوق مردوں کی تحریک چلی تو دیکھیں گے عورت کہاں تک اس کے شانہ بشانہ چلتی ہے۔ اب تو وہ اس کے سینہ پر سینہ ہو رہی ہے یہاں سینہ پر سینہ کا وہ مطلب نہیں جو ہوتا ہے دیکھو وہ بھی مقابلہ ہی ہوتا ہے۔ بس اس میں محبت ملی ہوتی ہے اب مقابلے کا مطلب دشمنی سمجھا جاتا ہے پاکستان کا منہ پتہ ہے کہ کس مرد اور عورت اگلے اکیلے ہوں تو وہ صرف قاتل اعتراض حالت میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی ایسا سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے بھارت میں یہ حالت قاتل اعتراض نہ ہو یورپ کی طرح ایسے اعتراضات ختم ہونے کا نام نہ آ رہا ہے ہر کس۔ اعتراض کرنے والوں کی ایک قوم ہے۔ اب سیاسی اعتراضات کا زمانہ ہے۔ سیاسی لیڈروں پر لندن میں بھی جیسی اعتراضات (کنٹرول) ہوتے رہے ہیں بھاری ریل گاڑیوں سیشنوں بس شاؤں اور دوسری جگہوں پر دو بجیں ہوتی ہیں عورتوں کے لئے۔ مردوں کے لئے۔ مردوں کو اکثر جگہوں پر مردوں بنا دیا گیا ہوتا ہے اور یہ عورتیں نہیں کرتیں۔ مرد کرتے ہیں مردوں کے کچے دشمن مرد ہیں۔ عورتیں نہیں عورت کی اصل مخالف عورت ہے مرد نہیں ان دونوں کو مقابلے میں لانے والے دونوں کٹھن ہیں۔ میرا تین ہے کہ حقوق نسواں کا چکر مردوں کا چلا یا ہوا ہے کیا چکی بات ہے فتنے میں کہ بدکار آدمی بھارت سے اچھا ہے۔

نہایت بھاری رسم الخفا میں مردوں کو مردوں کیسے بنایا جاتا ہو گا۔ دلی میں دیواروں پر ہاتھ سے لکھے ہوئے اشتہاروں کی کثرت ہے لاہور کی طرح تہہ نہیں بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے میں نے سوچا کہ وہ نہ ہو یہ بھارتی کے علاج کے اشتہارات ہوں۔ توہم زنی تفتیش پر یہ علامت ہو گیا۔ دنیا میں جتنی ہے وہ اب جتنی ہے اتنی دوسری کوئی دوسری جتنی جتن کے لحاظ سے یہ فتنے سے بھی زیادہ بڑھتی ہے بھارت کے رسالوں میں سب سے زیادہ اشتہارات بھارتی کے علاج کے ہوتے ہیں دوسرے نمبر پر ضرورت رشتہ کے ان اشتہاروں کو ایک ساتھ شائع کرنے سے کیا مطلب ہے۔ بھارت نے نفسیاتی معاشرتی اور معاشی مسئلوں کا بازار بن چکا ہے۔ یہ سب کچھ بھی مردوں کا مردوں کے خلاف کیا حرا ہے۔ عورت خواہ کھڑا اس میں آگئی۔ پھر مقابلے میں آگئی پاکستان میں مرد بھی مقابلے میں آگئے اس لئے کہ دوسری طرف بھی کچھ مردی مقابلہ میں ہیں۔ بلکہ مرد زیادہ ہیں۔ ایسا صرف ہمارے شہروں میں ہے بھارت کے شہروں میں مرد عورت کے

مقابلے میں آتے نہیں عورت کی بھارتی سے گھر چل سکتا ہے۔ ملک کیوں نہیں چل سکتا بھی تو گھر ہے مجھے بھارتوں پر صرف یہ اعتراض ہے کہ وہ ملک کو صرف اپنا گھر سمجھتے ہیں عورت کی اہلیت کی ہے توہین کے ساتھ ساتھ ہو گئیں نہیں۔ یہاں عورت پر مرد کو ترجیح دینے والی آزاد خیال عورت ہے۔ مرد نہیں۔ یہ عام مشرقی ممالک میں جو تینوں کو ہی اولاد سمجھتے ہیں۔ یہ بھارت کی وزیر اعظم جی جوائے علاوہ کسی عورت کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتی جی جوائے اس کے دوبارہ وزیر اعظم بننے میں اس کی ہونیکا کا حصر کسی سے کم نہ تھا مینیکا اپنے اندر اندر کا تو تلاش کرنا چاہتی ہے۔ وہ بھارت کی چند عورتوں میں سے ایک جی جس سے میں ملنا چاہتا تھا۔ میں اسے پر نام کرنا چاہتا تھا وہ بھارت میں سیاسی مردانگی کی علامت بن رہی ہے۔ مردانگی ایک مفت کا نام ہے جبکہ بھارتی کی جی جوائے ہیں۔ مینیکا گھری عورت ہے یہاں تک کہ بپاک اور ترقی کرنا کی کے لئے دریاؤں کے علاوہ بھی دریا ہیں۔ وہ ڈوب ڈوب کر ابھرے والی عورت ہے۔ وہ شاعر ہو گئی ہے۔ جب پنجپور یا سیاستدان بن گیا تو اس نے کہا

جیو تم کھیر کر آدمی بن گئے ہو

کیا تم کچھ زیادہ آدمی نہیں بن سکتے۔

جبکہ مرگیا یا مار دیا گیا تو مینیکا لیڈر بن گئی۔ پنجپور کے دوست اکبر احمد نے مینیکا میں پنجپور کو تلاش کر لیا مگر اندر انے اسے کم کر دیا تھا۔ اکبر احمد بھارتی سیاست کے جہان میں اکبر احمد بننے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وہ اہل آدمی ہے مگر تعمیر نہ آدمی کی آنکھ میں چھپائی جا رہی ہیں پھر ہندو سیاست کے وارث اکبر اعظم کے بھی خلاف ہو جائیں گے

بھارت کی ایک اور عورت کو میں سلام کرنا چاہتا تھا وہ چولن دیوی ہے۔ دنیا میں کوئی ہے جو چولن دیوی کو نہیں جانتا۔ جو کچھ بہانہ دونوں کے بارے میں جانتے ہیں بھارت کے لوگ بھی نہیں جانتے خاص طور پر چولن دیوی تو ہمارے شیر بھانوی کی آئینہ ہے ہماری اینکریٹیس جو کچھ مرد سکریٹ پر نہیں کر سکتیں اس نے سچ کر دکھایا۔ مینیکا ہمارے سیاستدانوں میں اتنی مقبول نہیں کہ وہ بھارت میں حکومت کی مخالفت پسند نہیں کرتے۔ انہیں یہ کام صرف اپنے ملک میں اچھا لگتا ہے۔ مینیکا اور چولن ہمارے عام لوگوں میں بہت مقبول ہے۔ مینیکا کا مقابلہ عورت کے اندر گھات لگاتے مرد کے خلاف ہے چولن کی بے لوثت مرد کے اندر انتقام پر ہندو عورت کے خلاف ہے۔ دونوں کا کام ایک ہے محاذ مختلف ہیں وہ دونوں مردوں کے خلاف نہیں۔ جی عورت مرد کے خلاف نہیں ہو سکتی بھارت عورت کے خلاف نہیں ہوتا۔ جموں کوئی کی مخالفت جھوٹے کر رہے ہیں

چولن دیوی نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اتنی ہی دکھ ہوا تھا مشرقی پاکستان میں جہل نیازی کے ہتھیار لانے کا ہوا تھا چولن ایک خاص علاقہ میں پور بھارت تلاش کر لیتا تھا جی

ایک مردناک عورت

جی توینک در جات نئے جاتے ہیں بنا ہے پہلے پہل ہر بھارت کچھنی کواتے گا روڈ آفر آجڑ کشاں کی کیا قیام گاہ
س اس کی آڑ کے لئے بہت سے گاؤں بدلے گئے تقریباً سب قابل ذکر بھارتی شاعر و ادیب یہ ذوقی بھگت
تھے جس کیلئے گنبد انیس بجھا چکی ہے گنبد اور مندر میں بہت فرق ہے۔ گنبد تو صرف نام کی گنبد ہے
مندر ایک پوری مندر یعنی سلطنت سے اس سلطنت کے بارے میں یقین ہے کہ یہ پاکستان میں ہے۔ ورنہ
یہ تو ہم کمال رہے گی اب گنبد کی حالت مجاہد سے زیادہ نہیں بھارت میں۔ کشور و یمن اور پیش کے علاوہ
خرگس مرزاں کی بھی حکومت ہے۔ وہ اس جگہ پر بھی جلی جاتی ہے جس پر لکھا ہوتا ہے مندر مردوں کے لئے۔
دوست مردانک خاتون ہے وہ وہاں ہے مردوں میں بیٹھی ہوئی ہے تو ان کی زیر پیش میں بدل جاتی ہے جس
طرح اس مرد و عورتوں کی عقل میں راجہ اندر ہے بیٹھے ہوتے ہیں سکھ ایسے مردوں کی مجلس میں رانی اندر امن
بیٹھی ہے ویسے وہ اپنے گھر میں جود عورت کرتی ہے اس میں عورتوں کو بہت کم جاتی ہے کیلکس کی مخالفت
کرتے ہوئے ان کو اپنا دوست بنائیں ہے وہ عورتوں کی دوست بن جاتی ہے بھارت کے سفر میں مجھے وہ یاد آئی
کہ ان کے یہاں بھی ایک ایسے خاتون ہوئی جاتے

ایک محفل میں عجب صورتحال ہوئی کہ قمیدور برائے پاکستان کی دل کھول کر ادب پیش بھر کر مخالفت کر رہی تھی۔ ایک بھارتی خاتون پاکستان کی حمایت میں بھی کھڑی تھی اس خاتون کے اندر کشور تائید کا یہاں سیاست نظر آیا۔ پاکستان میں کئی جدید بلکہ شدید عورتوں نے کشور کا پران ان زینت پسینی کی پوشش کی حران قبت ہو گئیں کشور وہ قسم ہے جس پر ہر کسی کا لباس عجب جاتا ہے۔ پاکستان میں اس نے ہر طرح کے غیر ملکی مروتوں کے علاوہ کوئی چند رنگ کے اعزاز میں بہت مت چھو کیا کر آیا کشور کو میرا مشورہ ہے کہ جب وہ بھارت جاسے اور وہ جاسے گی وہاں اور لوگوں کے علاوہ ہمیشہ خفی کو بھی اس کا بہت انتظار ہے کشور پر لازم ہے کہ کوہلی سے ہوشیار رہے بلکہ براہ کرم اس سے پردہ کرے کشور کو کسی شخص سے اجتناب ہے کئے لئے کامیاب ہے تو سوچتے کہ وہ کئی شخص ہوگا۔ پردے کی بات سے مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ خوبصورت شاعر منیر ناز نے انکا کہ میرے دوستوں سے میری بیوی پردہ میں کرتی کر میں اپنی بیوی کا کشور سے ضرور پردہ کرتا ہوں۔ ہر حال میں پردہ سے اور بے پردگی کو یکساں طور پر اچھا نہیں گھٹتیں ہیں چاہتا ہوں کہ عورتوں کے دل پر بھی پردہ نہیں پڑا ہوا جاسے اور مردوں کی محفل پر بھی نہیں۔ مشرقی و افش کی طرح مشرقی عورت بھی مجھے خوب ظاہر کچھ شہل حقیقت کی طرح ہے۔ راز کے آہستہ آہستہ تکشف ہونے کی سرخوشی جیسی تو خیال سے ہر کہیں عورت مردوں کے سامنے انسان کی آزادی کی چودھ میں برابری کی شریک ہے۔ میں ایسی عورتوں کو سلام کرتا ہوں۔ میں نے بھارت میں عورتوں کو مردوں کے شاہنشاہ بھیگ مانگنے دیکھا وہ عورت ہے عورت پر مظالم ہم سب کے لئے شرمناک ہیں۔ عورت کے مرد پر مظالم بھی کم عبرت ناک نہیں۔ قلعین افریقہ افغانستان مشرق وسطیٰ تمام میں کچھ ہو رہا ہے۔ وہاں عورت مرد کی کوئی تحمیش نہیں۔ جب زندگی اور زندگی اور شرمناک کے حصار عذاب میں گھری ہوئی ہو تو آزادی نسوان کی الگ تحریک ایک بے معنی مذاق ہے۔

پاکستان کے ایک دانشور انشراحق نی نے کشور نامیہ کو ادب کی چھوٹ دی کہ دیا۔ مروجہ گردن راہروی
بلکہ دیارے راہروی جو جیسے آدمی کے ہونے کی طرح سوچتا تھا بار بار ہے کہ چھوٹوں نے پاکستان میں داخل
ہونے کی کوشش کی تھی تاکہ انھیں ناگی اور کشور نامیہ کو یکسو وقت قرار دیا جائے۔ مگر اس کے بعد
کراہے۔ دیگر قرار ہوئی کچھ چھوٹوں دیوی کی گرفتاری کا نتیجہ ہے مگر انھیں اور کشور کے بیچ جانے کی خوشی بھی
ہے۔ شاید کہ انھیں چھوٹوں کے لئے ایک طویل نثری نظم لکھ رہا ہے۔ خطرہ ہے کہ کشور اسے اپنے قید و
پیشے کی وجہ سے سمجھتی ہے کہ پاکستان کے قومی ترانے کی پہلی سطر اس کے لئے لکھی گئی ہے۔ کشور حسین شاد
بھلا کشور کو چھوٹوں دیوی کے وقت خطا پر کیا اعتراض ہے۔ وہ اس سے بڑے بڑے اور بڑے بڑے
القاب پر بھی ناراض نہیں ہوتی بلکہ کشور نامیہ ہوتی ہے کشور ہماری ادبی دنیا کی گھر پہنچ سیدنا سیدنا
کوئی ماننے ماننے اس وقت پاکستان میں اس کے گرد وہی کار و درویشاں زور و پر ہے جو وہ ادبی سیاست بلکہ ادبی
حکومت کی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے ادبی گروپ کی مالک ہے مگر وہ اپنے آپ کو ٹھیکہ دار پرست
سمجھتا ہے۔ اب پاکستان سازشیں بھی ہوتی ہیں ایک آدھ کا نام بغاوت بھی ہو چکی ہے جس کو کوئی زبان نہ
”کوئی نہ ہو بکرانی کے معاملے میں کشور اندازے میں نہیں اس کے یہی چلن اور چالیں رہیں تو وہ کسی نہ
دن کسی نہ کسی ملک کی دہراؤ ہوگا۔

اس نے ادبی سیاست میں بیٹھتے بیٹھتے کئی خاص کام ہوئے وہ یسے کسی روز کا کام بھی۔
 کاساپانی کے لئے ناگامی کا تجربہ ضروری ہے۔ کئی ذرا امداد نگاروں کی ادبی شہرت و ترقی وہ نہ تو رکھ سکا حالانکہ یہ
 کام نہ ہونے دینے کے لئے اس نے مدت سے کام ہونے دئے ہیں نہ وہ دستوں کی فوج تیار کر لی ہے جبکہ
 کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دستوں کی فوج خطرناک ہوتی ہے۔ اسیں اپنا تختہ اٹھنے کا بہت غلطو ہوتا ہے۔
 کرائے کے لوگ یاد دہی کی مراد کے بارے لوگ مل جاتے ہیں وہ دھڑاں گاڑا ہوا میسرے رکھنے کے لئے
 کافی ہے ذرا سنی کی اداکاری آتی چاہئے ڈرنے کا کام لوگ خود کر لیتے ہیں۔ حالانکہ سیاسی شعاع و جب میں
 تختہ پر بیٹھا ہوتا ہے اس پر بستے زیادہ لوگ بیٹھے ہوں انہیں وہ مضبوط ہو گا مگر ان شہرت کے بھوکے گرد پڑنے
 یعنی سر ہونے اور پیوں کے نزدیک دوست سے مراد ان کی ادبی منزل گاڑی کو دھکا لگانے والوں جیسے ہے ان
 کے بعد صرف دھواں اور دھول ان کا مقدر ہے جب ان سے خطرہ را ادبی مہاںوں کو کسی خاص جگہ نہ چاہا ہو
 ”دوستوں! کو میر کرادی جاتی ہے کبھی تختہ سے زیادہ اونٹنے کو ترنگ چڑی ہے شرط ہے کہ اس پر چڑھنا والا
 کئی اور ہر دور سے اٹھ جھٹ سے ملکہ پڑی آتش جھٹ سے اس کی ادبی کمانداری کی ہے فہمیدہ و جلیبہ احمد

تھکن میں مگن فرانسیس

رات ساگ رات کی طرح بنی ہوئی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ کچھ ایسے ہی محوم گھام رہے تھے۔ ایک جوڑا ابھی سامان سے لہا پھندا پیا پچا تھا۔ شاید کوئی کمرو خانی نہ تھا۔ جوان سامان اٹھائے اٹھائے دفتر والوں سے بات کر رہا تھا سامان رکھنے کا سے خیال نہیں آ رہا تھا۔ عادی آدمی کو یاد بھی نہیں ہوتا کہ اس نے سامان اٹھایا ہوا ہے۔ لڑکی اس کے پاس کھڑی ہر طرف دیکھنے کی جراتی نکیر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رنگوں کی سماجی معلوم دیتی تھیں۔ وہ اپنی تھکن میں کھلی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی شہد نے دودھ میں بست سی مٹی ملا دی ہے۔ یہ مغربی عورتیں اپنے جسم سفر کی بہت وفادار ہوتی ہیں۔ وہ یہاں اپنے طور سے دوسروں کی طرف اتنا بھی دھیان نہیں دیتی جتنا اپنی لڑکیاں یہ خواہش رکھتی ہیں کہ اپنی طرف دیکھنے والوں کو وہ دیکھ لیں۔ ایک میلی داڑھی والا فرانسیسی لڑکی اس سے وقت پوچھ رہا تھا وہ ابھی ایک اور آدمی سے بھی یہ سوال کر گیا تھا لڑکی کی کلائی گھڑی سے بے نیاز تھی۔ وہ اس سے بھی بے نیاز تھی کہ وقت کیا ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے بیل خانے میں داخل ہوتے ہی اپنی گھڑی توڑ دی اور کیلنڈر بھاڑ دیا۔ اسے عمر قید ہوئی تھی۔ لمبے سفروں پر نکلے ہوئے وقت سے پوچھ کر چلیں تو کہاں تک چلیں گے۔ اس گھاہ کی مٹی جیسی لڑکی نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ اس کے کنارے گئے چیلے بالوں میں ایک قرقرہ اہٹ جاتی چلی گئی۔ وقت کو اس سے پوچھ کر گزرتا چاہئے۔ اس وقت وہ وقت کی اس گشتاخی سے بھی بے نیاز تھی۔ اب گھڑی ہاتھ پر نہ پڑھنا دیشن ہو رہا ہے آدمی کو وقت کی پابندی نہیں بھی کرنی چاہئے کبھی کبھی وقت بھی تو پائید ہو آدمی کا۔ آدمی راتیں مسلسل جاگ جاگ کر گزارے تو ایسا ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ رات کو آہستہ آہستہ گزرنے دیا جائے کچھ لوگ وقت اس طرح گزارتے ہیں جیسے ڈیرا ہوا بچہ بھاگ کر سڑک پار کرتا ہے۔ یہ میلی داڑھی والا فرانسیسی ہلے میں کئی بار "سڑک" پار کر رہا تھا۔ میری رات تھکن میں مگن بے نیاز اور حیران آنکھوں والی لڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور میں "سڑک" کے اس طرف تھا۔ وہ میرا دیکھا اپنی آنکھوں میں لگا کر میرے پاس سے گمراہی اور ادھت کے مجھے کو ہاتھ لگا کر دیکھنے لگی۔ پھر پیلے والی ٹیک پر جا کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنی رات کو اس کے پاس چھوڑ دیا اور خود غالی خالی ہو کر اپنے کمرے میں چلا آیا رات رات کے بغیر گزر گئی۔ زندگی زندگی کے بغیر بھی گزرتی ہی رہتی ہے

تیسری دنیا اور اسلامی دنیا کا مرد اسے کیا آزادی دے گا۔ وہ ابھی خود غلامی کی عادت سے نجات نہیں پا سکا۔ وہیں لبریشن کا فلسفہ مغرب والوں کی مصلحت ہے جو مشرق کو کسی نہ کسی جال میں پھانسنے رکھنا چاہتا ہے۔ کشور جال سمیت اس نے کی کوشش کر رہی ہے کشور بڑی شے ہے بڑے بڑے مصر کے ملے ہیں اس نے لڑکی عورت کم کم ہوتی ہے۔ انہوں نے کام آن والی دوست ادبوں کے بہت کام آنے والی۔

کشور ایک پارامیک کنڈر خانہ اور کچھ دوسرے پورٹی ٹکوں کے دورے پر جاتی تھی۔ ویسے وہ یہ وہاں پاکستان کے اندر رہ کر بھی کرتی رہتی ہے۔ انگریز جاوید نے کشور کے اعزاز میں ایک امیر ترین ہوٹل میں تقریب کی۔ کھانے پینے کے علاوہ سوال جواب شروع ہوئے تو ممتاز بھٹی اور دانشور ڈاکٹر ویلر خواجہ محمد ذکر یانے کشور سے پوچھا

"تم مغربی ٹکوں میں پھرتی رہی ہو۔ وہاں عورت بہت آزاد خیال ہے۔ کیا تم نے وہاں اپنے سے بھی زیادہ کسی آزاد خیال کو دیکھا" بھارت میں ایسی عورت کو تلاش کرنا کیونکر ممکن ہے ایسا دعویٰ کرنے والی عورتیں ہمیں ملیں مگر ہم نے انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا انہیں دہلی کی عورت میں ایک بھی عورت نہ تھی ایک بھی عورت ہوتی تو پھر ہم خود کرتے۔ ہم اس پر بھی غور کر رہے ہیں کہ کشور نابینا انتھار حسین حسن رضوی "انگریز رپر آنا" مختصر سفر صدی اور صدی ضیاء الحق بظاہر کوئی نہ تھانگ کے ساتھ ایک جیسے حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے پیچھے کیا راز ہے اور اس کے آگے کیا راز ہے۔

اے محبوب الہی! ہم معتب الہی کیوں ہیں؟

اکھاپے کافنڈ منظر۔ شعر لکھے ہوئے تھے دیوار دیوے۔ غالب کے ہی ہوں گے۔ اس کے باوجود کہ اکبر الہ آبادی نے یہاں فاتحہ پڑھنے سے اپنے آپ کو منع کر دیا تھا۔ ہم نے بالائے لب فاتحہ پڑھی کہ اکبر نہیں تو غالب ہی نہ لے۔ ہمیں خدشہ تھا کہ اس نے سننے سے انکار کر دیا ہو گا۔ وہ کسی کی دعا سے خود کو بخشوانے والا نہیں تھا۔ ہم نے سارے پھول غالب کی قبر پر رکھ دئے۔ تجاے لہ نے یہ شعر کیوں لکھا تھا۔

ہوئے مر کے قہور سواہوئے کیوں نہ غرق دریا

نہ بھی جنازہ اٹھتے کہیں مزار نہوتا۔

اس کو ماننے والے آدمی نظام الدین اولیا کے حزار پر جانے سے پہلے اس کی قبر پر خوش کھڑے تھے۔ ”غزل بخش نا آفریدہ“ کو کون بتائے کہ اس کے لئے دنیا میں کہاں کہاں کیا گیا بانات کھل اٹھے ہیں۔ اس نے ایک صدی پہلے زوال آمادہ مسلم ذہیت کو ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا تھا جب مگر بڑے پوچھا۔ غالب صاحب قلم مسلمان ہو۔ تو اس نے کہا

صاحب ”آوہا مسلمان ہوں شراب پیتا ہوں۔ سو نہیں کھاتا۔“

شراب اور سو کے بارے میں آج بھی ہماری ترجیحات ہیں ہیں۔ ہم ابھی تک نہ پوئے مسلمان ہوئے ہیں نہ چر تھائی۔ اب تک آدمے مسلمان ہیں رسول اکرم نے کیا کی بات فرمائی تھی ذہن میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ کلام اہسنہ نے کہا کہ ایک نسل پیدا ہونے والی ہے جو نہ مسلمان ہوگی اور نہ کافر وہ نسل پیدا ہو چکی ہے۔ بلکہ جو اب ہو چکی ہے۔

ساتھ کھٹے میں زین العابدین عارف کی قبر ہے۔ یہاں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شعر غالب نے کس در سے لکھا تھا۔

اے غلبہ چرواہا قہار غلامی عارف

کیا تیرا بگڑنا جو نہ مرنا توئی دن اور

میں نے آسمان کی طرف دیکھا وہ اس وقت ہو اٹھا ہو گیا تھا اور زور و زعم چمکان سے زیادہ ذہن غصے کی خدمت میں حاضری کے لئے چل پڑے۔ ذہن رہنے والوں کے لئے کیا کیا اسباب اور کھیتیں اور مقامات ہیں۔ ذہن رہنے کے اپنے اپنے انداز ہیں۔ مرکز ذہن رہنے کے بھی اپنے اپنے انداز ہیں۔

حزاری کی طرف جانے والا دستہ تک ہے دکائیں بڑھ کر دیوار ہونے والی ہیں ہجوم دیواروں سے ٹکھٹے تھا۔ دو ایک موڑ آئے۔ ہم شاید مرگ میں گزر رہے تھے۔ ہم نے جوتے اتار لئے۔ مرگ

ہائی ہو گئی۔ ایک حزار اولیا صاحب اور ہمارے درمیان حائل ہو گیا۔ امیر خسرو نے فقیری اور موسیقی کو

لیکھنے میں گامے کے شاعری بنا دی اور ایک ترک میں اپنے ساتھ چلیا نظام الدین اولیا کے ساتھ حقیقت

سنو نہر نگا امیر خسرو کو یہ مقام دیا۔ کہ اب بھی اس کی اجازت کے بغیر آپ آگے نہیں جاسکتے۔ ذہنی

شکر ایشی کی دار فکلی موت کے دروازے پر بھی حفاظت کر رہی تھی۔ میں نے نہت کو شش کی کہ امیر کی

سارے رستے اس ہیستی کی طرف جا رہے تھے۔ رستوں پر چلنے

والے نہیں اور جا رہے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الہی کا بارہ۔ کبھی صرف یہی ہستی ملی تھی۔

یعنی کبھی دلی یہاں پہنچتی تھی۔ اب یہ ہستی دوسری ہستی ہے۔ ہر لحاظ سے دلی سے مختلف۔ دلی سے دور۔

یہاں پہنچ کر زمانہ بدل جاتا ہے۔ تاریخ پیچھے کی طرف حیران ہو کر دیکھنے لگتی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے ہماری

نیکس بھائی گیت کی طرف سے ملی تجوری و آناج بخش لاہوری کے دربار کو جا رہی ہے۔ بچوں اور بیڑوں کے

حزار درباروں سے بڑے دربار ہوتے ہیں۔ زندگی میں مخلوق کے محبوب۔ مرنے کے بعد مرتبہ خاص و

عام۔ کسی مولوی کی ذات اور خاک کبھی اتنی زندہ آتی تانہ ہوتے نہیں دیکھی تھی۔

دلی کے بہت سے مسلمان جو پاکستان کو ہجرت نہ کر سکے تھے۔ بستی نظام الدین میں پناہ لے بیٹھے۔

پناہ کا یہ سائبان ہوا میں اڑا کر لے گئیں۔ لوگ اب تک پڑے ہیں بیٹھے والی دور تیس ٹھکر پڑیں قوی محل

گیا۔ ان کے منہ خشک تھے۔ ان کی آنکھوں میں بے پروگی کا نور تھا۔ گھٹاف اور تکلیف مل کر ان کے

چروں پر چڑھا ہوا تھا۔ لوگوں کے سروں پر نیوٹاں تھیں۔ بلکہ نیوٹاں سروں کے بغیر تھیں۔ بدو میں پاجا سے

ان کی ہاتھوں سے لپٹنے میں معروف تھے۔ ایک چپا ہوا خوف ان کا جگر بنا ہوا تھا۔ ہم حزار کو جاتی تھی کھڑے

غالب آئیں ہی کے دفتر میں گئے۔ اس رستے پر نہیں نفوی سے بچ کر جانا ممکن نہ تھا۔ شخص آدمی نے واپس

سجری کو ہمارے ساتھ کر دیا تاکہ بیکمانگنے والوں کے قہور غصہ سے سلامت رہیں۔ ہم جو سخی حزاری کی

طرف روانہ ہوئے۔ کئی لوگ ہمارے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ہمارے ساتھ والا آدمی تجاے کون تھا کہ

اسے دیکھ کر ہاتھنے والے ہم پر ٹوٹ پڑنے سے ہار اٹھدے مرے کو روک رہے تھے۔ پھولوں ہاتھوں کی

دکائیں شروع ہو گئی تھیں۔ ہم نے پھول خریدے اور مردہ غالب کی طرف ہوئے۔ غالب آئیں ہی کی اونی

عمارت کے سامنے میں نظام الدین اولیا کے احاطے کی دلچیز ایک کھلا تھی ہے۔ اس کے کونے میں تاجرو

فہر آدھے میں غالب کی قبر ہے جو اس کے بڑے حلیے کی یاد دلاتی ہے بڑے حلیے کی غربت والے دنوں میں ادلی

مخانی غالب کو گالیاں بھرنے غلط لکھواتے تھے۔ غالب کیا بڑا فکار تھا۔ اس بات پر تجیدہ تھا کہ

”ان سالوں کو گالی دینا بھی نہیں آتی۔ بوڑھے آدمی کو کہاں کی گالی دینے ہیں بھلا“

ہمارے زمانے میں نہ ہوا غالب دور نہ کیا ہوا تاس کا۔ اب تو گالی بھی کالی ہو گئی ہے لوگوں کے لہو کی

طرح۔ اب لہو سفید نہیں ہو تا کالہ ہو جاتا ہے۔ اچھے اور بد گھر گھوں کی گالی مزہ ارفن پارہ ہوتی ہے۔ مگر ہر

بات میں انتہا پسندی کرنے والوں کا کیا کرین قبر غالب پر نیا لے رنگ کا چکر لگا ہوا ہے۔ سنگ مرمر ہو گا۔

نعت یاد کروں

محمد میر معقل رو دشب جانیکہ من بودم
مگر ناکام رہا۔ ابھی طرح یاد نہ کئے ہوئے شعرا کبھی کبھی دن کو یاد بھی آتے تاج کون دوسرے
دلوں سے مختلف تھا۔ یہ شعر کوئی خوش اور خیال کے بغیر یاد آئے
کبھی کبھی جنوں سے توجہ خاریا جلا
آیا نہ کھا گیا تو پیشی وصول بجا

اس دور میں یہ سارے کام ایک ہی آدمی کر رہا ہے مگر کہیں کے بھٹکنے کی آواز میرے ذہن میں
وصول کی آواز سے تیز ہو جاتی جارہی ہے پھر نکالنے والوں نے اپنا سب کچھ جلا دیا ہے۔ کتے کھا رہے ہیں اور
وصول بھی خود بجائے جارہے ہیں میں سوچا کہ اس حال میں نظام الدین کے پاس حاضری غیر حاضری سے
بہتر ہوگی۔ ابھی اسے خسرو سے اجازت بھی باقی تھی۔ مگر کوئی چیز مجھے لے جا رہی تھی۔ میں جا رہا تھا۔
دوسرے لوگ بھی تو جا رہے تھے۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے خسرو سے پوچھ لیا تھا۔ جو کچھ احاطہ حزار میں
ہو رہا ہے۔ سستی نظام الدین میں ہو رہا ہے دلی میں ہو رہا ہے بھارت میں ہو رہا ہے ہندوستان میں ہو رہا ہے۔
کیا وہ خسرو سے پوچھ کر ہو رہا ہے۔ بہت سے کاموں کی اجازت تو دلا دی گئی تھی میں دین گے۔ خسرو تو
اپنے حزار پر ان قاولوں کو بھی منع نہیں کر سکتے۔ جو ان کے شعر فلق کر کے پڑھتے ہیں۔ اس طرح پڑھتے
ہیں جس طرح بادام کوٹنے جا رہے ہوں بھکاریوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ وقت آنے والا ہے
جب وہ کسی اور کو حزار میں گھسنے بھی نہ دیں گے۔ پھر کئی قسموں کے چاندروں اور کئی رنگوں کے گلدی نشینوں
کو بھی نہیں سمجھائے کہ ان میں اور بھکاریوں میں ذرا فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہوئی خسرو کی کہ آپ نے اپنے
بعد کوئی اور خسرو پیدا نہیں ہونے دیا۔ محبوب الہی کے بعد کوئی دوسرا محبوب الہی کیسے ہوتا۔ یہی مسلمان
بادشاہوں نے کیا ہمارے بادشاہوں اور اولیاء کے جانشین دونوں کام کئے تھے۔

میں آگے بڑھ گیا محبوب الہی کے حضور جو محبت کرے وہ محبوب بن جاتا ہے۔ اللہ سے محبت اللہ
کے بندوں سے محبت کی ایک بند ہے محبت محبت بھی بندہ ہی ہے

حزار کے سامنے چھوٹا سا منہ ہے جہاں ہمیں دیکھتے ہی تابی بھٹک گئی تھی ہمارے خیر مقدم کے لئے
قوال شروع ہو گئی تھی غلط شعر بلکہ شیر۔ شیر بھی کہاں کہیں مجبور بکریاں ستائی جارہی تھیں جن کی رکھوالی کتے
کر رہے تھے۔ ہر طرف بھونکنے کی آواز کھینچتی جارہی تھی چڑیا ہوں نے چہرہ چڑا کر پرستار ہوا تھا۔ پریشانی ہے
کہ مجبور اور مجبور کے نام میں فرق نہیں

ابھی تک اس بستی کا رتہ نہیں بدلا گیا یا سب کچھ اس طرح بدلا ہے کہ سب کچھ بدل گیا ہے مگر
بلا ہوا لگتا نہیں یہاں ہر وقت کسی سرکاری کی تقریب کے ہونے کا گلن گزرتا رہتا ہے اور وقت گزر رہا ہے
اگرچہ وقت کب کا یہاں سے گزر کر جا چکی ہوگا۔ ہم وقت کے انتظار میں رہے ہوئے ہیں۔ شاید وہ
پتھر لگا کے ابھی جائے۔ وہ آیا اور دم نہ ہوئے پھر!

یہاں زائرین سے زیادہ سی آئی ڈی والے ہوتے ہیں ان کی عقیدت دینی تھی۔ عقیدت سے زیادہ
عقیدت کی ادکاری اعلیٰ تھی

بکھی اس شخص نظام الدین اولیاء کی حکومت تھی یہاں پر۔ اصل حکومت دلوں پر ہو جاتی
ہے۔ حکمران یہاں غلاموں کی طرح آتے تھے۔ اب غلام حکمرانوں کی طرح آتے ہیں۔ ہمارے سمیت
یہاں سارے پاکستان اپنے آپ کو سی آئی ڈی محسوس کرتے ہیں۔ نہیں کرتے تو ان سے کروا لیا جاتا ہے۔
نظام الدین اولیاء سے زمانے میں زندہ تھا۔ زندہ ہے۔ اس کی ذات اور زمانہ لوگوں نے اپنے اندر
نکھان ہوتے۔ کچھ لکھا تھا ہم نے اپنی ذات میں اپنے زمانے کو یاد کر ڈالا ہے۔ اس کی تجرہ زندہ ہے
ہمارے قلب پر کھینچے ہیں۔ یہ میں نے کس کا مقابلہ کس کے ساتھ شروع کر دیا ہے ہم مقابلے پر اترے
ہوئے لوگ ہیں اور کوئی نہ ہو تو ہم اپنے ساتھ مقابلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اب ہمیں فوجیوں والے لوگ
عجب مقابلہ کر رہے تھے۔ ہر جڑا فغانے ہوئے ہم سے دستخط کرانے کی ضد میں ایک دوسرے سے کم اور
ہم سے زیادہ لڑ رہے تھے۔ ان کو گراف لینے کا یہ ایک طرف تھا۔ ہم نے دیکھا نظام الدین اولیاء کے جانشین
ہونے کی گواہی اس طرح کی کرتی جا رہی تھی۔ اصل غلطی میں ہوں۔ میں ہوں میں۔ میں۔ مجبور بکریاں
منہا رہی تھیں یہ اس شخص کی سیدہ طور پر اولاد ہے جس کی ساری زندگی اس محل کی شہادت ہے۔ میں
تاہیں سب توں۔ (میں نہیں سب توں) پھر جو "قون" ہے میں کیا۔ من و قافری ہی کب رہا۔

من تو شہی تو من شہی من جاں شہد تو من شہی

تاس گویا بعد ازین من مجرم تو مجری

اب کس مقام کا فیصلہ جڑوں پر بھیجی و تحفوں کی تعداد سے کیا جاتا ہے۔ اس کے وسط کسی کی آنکھوں
میں تھے جو حکومتوں کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اور حکومت اس کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی۔
آج اس کی خاتون پر اسٹیک تو تیار وارث کیا کر رہے تھے۔ ہم کیا کر رہے ہیں۔

ہم حزاری چہ کھٹ کی طرف بڑھے ہمیں نہیں پیش کی گئیں۔ میں گئے سرچش ہونا چاہتا تھا۔ میں
لے لوٹی اپنے ہاتھوں کو پستادی۔ بھٹکری کا کام لوٹی لے لیا گیا۔ میں مجرم تھا محبوب سے زیادہ الہی
کا۔ الہی سے زیادہ الہی کے بندوں کا بندوں سے زیادہ الہی۔ میں مجرم تھا میری سزا میرے جرم سے
زیادہ ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے جرم سے بڑی سزا مل گئی ہے۔ میں سزا بڑا کا کا جلا۔ بھی ہم نے اپنے
ہاتھ میں لے رکھا ہے میں عموں کو خدا کو شکست دینے پر تکتے ہوئے ہیں مجبور آہستہ آہستہ کھٹک رہی
تھی میں اس کے سامنے آتا جا رہا تھا۔ جو خدا کا دوست تھا۔ اس نے کسی کو شکست دے بغیر سب کچھ فتح کر
لیا تھا۔ میں اس کے سامنے کچھ دو رکنا چاہتا تھا۔ مگر ہم ایک دوسرے کو کسی مقام پر گھسنے ہی نہیں
دیتے۔ ہم بے مقام ہو گئے ہیں۔ میں نے قبر کے چھروں کا کھنڈہ لیا مگر ہاتھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا فوجی کابین
سے رنگ حزار کو جو مناجا۔ میرے لب کھینچی سے لباب تھے۔ آنکھیں جھٹکنے لگیں۔ میں مجبور کے سلاب
سے نکل کر دیوار کے ساتھ کھ کھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک پھول حزار کے ہاروں سے ٹوٹ کر دم میں رہا ہوا

بھارت کے ساتھ جنگوں میں ہم دغا بین بن گئے۔ یہ کہ اللہ کرے ہمارے ہواؤں جنگی جہازوں کے نظام الدین والیا کے حارر بن جا کر یہی نظام الدین اولیاء بن جا کر یہی قطب صاحب کے احاطہ قریب نہ بن جائیں انھیں شریف سرسہ شریف جامع مسجد کی مسجد بن چاڑیں۔ کسی غریب مسلمان کے گھر پر نہ جا کر یہ کسی مندر کی غریب بندو کے گھر پر ہمارے بہنہ کر رہے ہیں اس جنگ کے خلاف تھے ہم جنگ کے خلاف ہیں۔ اور ہمیں بھی اور دھرم بھی۔ اور اسے ساتھ جنگ تو اسے اندر کی مسلمان میں ہوتی ہے

قائد اعظم اپنے زمانے کا محبوب الہی تھا۔ محبوب الہی بھی آدمی ہی ہوتا ہے، وہ مومن ہی تھا۔ اس کے اس روپ کا ایک انگہ پاکستان ہے۔ اب پاکستان میں ایک روپ ظاہر ہو گا۔ جلد ہو گا۔ ممتاز شاعر اور صوفی و دانشور سلطان محمود اشرف کے مطابق قائد اعظم فیضانِ آدمی تھا۔ فیض مل جاتا ہے۔ پر ایمان کی خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ جس کی کے ایمان کا اندازہ لگ ہو تا ہے۔ اس میں رجعت اور یکسانیت کا قائل نہیں ہوں۔ قائد اعظم کے پاکستان پر بھارتی مسلمانوں کا بھی برابر کا حق ہے۔ وہ ہجرت کے شہری ہیں۔ مگر ہمارے سارے شہران کے شہریں۔ قائد اعظم کے حوزہ پر جا کر ایمان کے لئے بھی دعا کرتے ہیں۔ ایمان

خوشحال مسلمانوں کا ترجمان

اشتباح کس قدر مفرد ہے۔ عطا الحق قاسمی اور اس کے دوستوں کے نام

گروینک کے اس دور میں کئی آدمی صرف اپنے ارد گرد لوگ اکٹھے کرنے کی خوشی میں جتا ہیں اور دلجوئی کی ہمیشہ والا آداری والا نسخہ بہت فکری سے استعمال کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بھی دو ایک ایسے ہیں جو ہر منزل پر سہ ماہی ہیں۔ محمد دوستوں کو راستوں میں رکھتے ہیں بلکہ راستوں پر ماہی ہیں۔ بعض اوقات تارکب راستوں پر ماہی ہیں۔ تارکب راستوں اور راستوں میں فرق نہیں رہتے دیتے دونوں کو ایک جیسے روانہ کرتے ہیں۔ دشمنی پر حملہ جتنے رکھنا چاہتے ہیں۔ دوست وہ ہے جو اپنے دوستوں کے لئے راستوں پر اڑنے والی دھول کو روشنی ہوا اور خوشبو میں بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوستی کے دھوپ اور دھول سا بھی ہوتی ہے۔ انہیں الگ الگ کرنا کیونگی ہے۔ جتنی حسین سے مت زور لگایا کہ عطاس بار حیدر آباد کی حرا جیہ کانفرنس میں شرکت کرے جو ہر سال ہوتی ہے تھوڑے دنوں میں ہونے والی تھی اس نے عطاس کے لئے دعوت نامے کے سامنے لوازمات کا اہتمام کر لیا۔ مگر عطاسے انکار کر دیا کہ کہیں میں اسے محسوس نہ کر لوں اور میرے فرشتوں بلکہ شیطانوں کو بھی خبر نہ تھی۔ ایسے موقعوں پر اس احساس کا کمان بننا شیطانوں کی طرف سے بد فعلی ہے۔ عزت اجتماعی احساس ہے شہرت کا اکھلا ہوا آدمی کو ہر ان کر دیتا ہے جس نے صرف اس سفر میں ایک آدھ بار ایک آوارہ خیال کا لہر بھر کے لئے سامنا کیا کہ کبھی کبھی دوست ایک دوسرے کے لئے ہماری سلمان کی طرح بھی ہو جاتے ہیں انھارے اٹھائے حیدر چٹانہ شوار ہو جاتا ہے جسے پیچھک دیتا اس سے بھی دشوار ہوتا ہے۔ سفر میں مشکلات کو معاملات بنانا پڑتا ہے۔ یہ عمل خود بخود بھی ہوتا ہے۔ آدمی کو خود غرض بد نیت اور منافق نہیں ہونا چاہئے

حیدر آباد کی حرا جیہ اولی کانفرنس اردو والوں کی خوشیوں اور خوش فہمیں کا اظہار اور اعلان ہے۔ بہت نام ہے اس کام کا۔ سبھی اس گرمی بلکہ گرمی کا کامل آسان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اردو زندہ رہے۔ تقویوں کے سارے ہی زندہ رہے۔ آسمانوں و زبان کے پاس بہت ہیں۔ رونے سے آدمی اپنے اندر سے کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ باہر سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا تاہم صرف دل کے خشک آلاؤں کو بھر سکتے ہیں۔ زمین پر گرین وقت سے زیادہ سے زیادہ دلدل بنائیں گے جو ان کے لئے ایک اور عذاب ہو گا زمین تو لوس لالہ دار بنتی ہے۔ البتہ اشک آلود مٹی خرق آلود ہونے کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہے ابی بھارت شہر اردو والوں کو آسمان سے کچھ نہیں ملے گا۔ جلدی جلدی بھی کچھ نہیں مل سکتا۔ جلدی جلدی جو جھوٹا ہے۔ زیادہ دیر تک پاس نہیں رہتا۔

ہمارے اخبار کا موقف صرف ہماری مسلمانوں کی مدد کرنا ہے اس کے لئے پاکستانی مسلمانوں کے خلاف بھی لکھنا پڑ جائے تو ہم ہر جہت میں سمجھتے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اخبار چل نکلا ہے۔ شاید امیر آدمی ہے اور ہماری مسلمان ابھی تک غریب ہیں۔ میں نے شاید کے کان میں کہا کہ پاکستان میں بھی جس نے اہل رات مشہور اور مال دار ہو جاتا ہو وہ پاکستان کے خلاف لکھ دے تو کام بن جاتا ہے۔ بات ایک ہی ہے ویسے دونوں مکوں میں اس نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا پھر جتنی کو مسکراتا ہوا دیکھ لیا میں نے ان دونوں کو دیکھا شاید جذباتی طور پر بد نیت نہیں وہ ہماری مسلمانوں کو غریب ہونے سے نہیں بچا سکتا غریب الوطن ہونے سے تو بچائے نہیں اپنے وطن میں بھارت میں مسلم صفت و قیادت کا قصور تو ہمیں جلدی پتہ چل جاتا ہے یہ پتہ ہونے کا وجود کچھ پتہ نہیں چٹا کہ تب ہندوستان کی مسلم قیادت کا کتنا قصور تھا اور اب پاکستانی قیادت کا کتنا قصور ہے جس الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا یہ بات شاید نے نہیں مومن نے ہمارے لئے کئی حقیقی پاکستان ہندوستان کے سامنے مسلمانوں کے لئے بننا تھا۔ کب بنے گا۔ کہاں بنے گا۔ جواب سوال کے اندر چھپا ہوا ہے۔ لوگ لوگوں کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں آنکھوں تانہ وہ ماضی کے اندر موجود ہوتا ہے ہماری مسلمان! بھارت ہمارا وطن ہے لی وطن میں ہمارا وطن ہے بھارت پاکستان جنگوں میں ہماری مسلمانوں نے کم قربانی نہیں دی ہندوؤں سے۔ مگر ہوا مسلمانوں کے ساتھ کیا لائن ہے چاروں سے بھارت اور پاکستان ایک جیسی زیادتی کر رہے ہیں۔ جتنی جنگیں بھی ہماری مسلمان ہم سے لڑ رہے تھے۔ وہ حق بجانب ہیں مگر ہندو مسکرا کر انہیں منع کیوں کر دیتے تھے۔ یہ جان شخص شاید صدیقی تھی دینا کے دے لیئے دینا کی دھن میں ہے۔ بھارت کی متعجب کنگھی میں یہ بڑا سنگسار ہے مگر یہ لوگوں نے دوسرا ایذا کی کم کر دیا ہے بے اختیار لوگوں کو گولیوں میں ہوتا۔ ہندو ہوا مسلمان بے غیر صرف بے غیر ہوتا ہے ایک گرد ہے۔ جو ہر کسی موجود ہے جس نے بات تارکب کی طرف سے کر کے کسی متعلقہ خود بخود اس آواز کی طرف ہوتے چلے جائیں گے۔ کون چھپا سکتا ہے اپنے آپ کو اپنے اندر اپنی قوم میں دیر تک۔

یہ جو باتیں ہم نے کیں۔ عطاسے کیں یا میں نے کیں۔ یوں سمجھیں کہ جو میں نے کیں میں نے کیں جو عطاسے کیں وہ ہم نے کیں عطاسے دوستوں کے ساتھ رہتا ہے وہ راہبوں کے درمیان یاروں کو زندہ رہنے دیتا ہے۔

اس حوالے سے آزاد شمیم کے ممتاز مزاج نگار محمد کیر خان کی کتاب "ہم ہمارا دشت" کا

اس بار وہاں انتظار حسین صدارت کرنے والا تھا اور کانفرنس میں عطاسے نے جانے کا ایک سبب یہ نہیں قلم مزاج نگار نے دوسرے لکھے والوں سے چڑتا ہے نہ مڑتا ہے یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ انتظار حسین

حراج نکار ہے۔ کیا ہر کالم نکار نکار ہوتا ہے حراج عطا کے کالم میں قسے لگتا ہے اور انتقاد کے کالم میں حراج بھی مرضی کا ملک ہے۔ کیا کیا جائے انتقاد کر رہا ہوتا ہے انتقاد اس لئے بھی کالم پر توجہ نہیں دیتا کہ یہ اس کے ادب کو نہ لگ جائے عطا کالم پر اس لئے مہربانی کرتا ہے کہ وہ اس کو ادب بھی سمجھتا ہے حراج نکار اپنی اداسی اس جگہ اکڑا ہوا ہے جہاں جائے دوڑ کا مقابلہ ختم ہو جاتا ہے دوڑ شروع رہتی ہے لوگ بظاہر ہمت آگے نکل کے بھی اس مقام پر ہوتے ہیں جہاں سے دوڑ شروع ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی بدحواسی اور افراتفری سے گلتا ہے جیسے دوڑ ابھی شروع ہوئی ہے۔

بھارت کے خوشحال و انشور مسلمانوں کی کلاس بھی دوڑ لگا رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ دوڑ شروع کمال سے ہوئی تھی۔ اور جا کے ختم کہاں ہوئی دوڑ بھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ بے چارے ہندو حکومت کو اپنی دانا واریاں ثابت کرتے کرتے خود منہمک ہوئے جا رہے ہیں۔ کچھ آسودہ مسلمان اپنے طور پر بھی اپنے ملک و ممالک میں جینے کا جتن کر رہے ہیں۔ مگر وہ جو آزدہ کلاس ہے۔ کچھ مسلمان ہیں۔ کچھ مسلمان سوائے مسلمان ہونے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ بھارت کا قریب مسلمان طاقتور بھی ہے۔ خاص معاملات میں اور امیر مسلمان کمزور ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے حوالے سے غریب اور امیر کا یہ خصوصیاتی امتیاز ہر زمانے میں ہر ملک میں رہا ہے تاریخ میں بڑے لوگوں کی فرست کا زیادہ حصہ غریبوں کے ہاں تھا۔ غریبوں کو تاریخ کے خداؤں کے حوالے نہیں کیا گیا مسلمان غریبوں کو صرف اپنی باتوں پر بڑا خطاب مشکل ہے۔ تاریخ انسانوں کی دشمن ہے۔ دشمن زیادہ ہے۔ یہ صرف چند لوگوں کی زندگی کے ریکارڈ کا نام بن کر رہ گئی ہے۔ اس میں بھی آف وی ریکارڈ باقی نہیں ہوتی ایک اور تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ مستقبل کی تاریخ حال میں لکھنے کی ضرورت ہے۔ دوست تاریخ نہیں جانتا ہے کہ اس کے پاس فقری میں شافی کرنے والے اور امیری میں قریبی اپنانے والے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں۔ اب وہ بھی نہیں۔ تاریخ بے سارہ ہو گئی ہے۔ تاریخ کی یہ چال اور پس انداز اور غریبی عروج پر ہے۔ اپنا اس زوال کے حوالے سے اسے کوئی ٹھکانہ نہیں مل رہا۔ ایک عجیب ٹیچر کی سی دکھ رہی ہے۔ مگر اسے کھانے والے چند ایک ہیں۔ بھارت کی تاریخ سہو خاندان کی وائزی سے زیادہ نہیں اور ایک تاریخ اس گھر اور ان گھروں کے باہر بھی بن رہی ہے۔ ہر تاریخ کا اپنا ایک گھر ہوتا ہے۔ اب اس پر بھی ناپاؤ بھید کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انسان کے مسلسل بے گھر ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

تبلیغی جماعت کا اصل کردار

تبلیغ کے لئے قافلے یہاں سے جاتے ہیں۔ جو بھی گھر سے نکلتا ہے کسی نہ کسی تبلیغ پر نکلتا ہے۔ یہ تو صاحب قبر کے پاس ذرا ٹھہرے سے

مجھ پر غایت ہو گیا تھا۔ مولانا کی قبر کبھی ہے اور بے بھت ہے۔ اس کے ساتھ دو قبریں اور ہیں۔ تین چکی قبروں میں ہیں یہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی قبر میں سوئے ہوئے ہیں۔ شاید تین قبروں میں وہی ہوں مگر آدمیوں سے پوچھتے کے بعد معلوم ہوا کہ درمیان میں وہ ہیں۔ دہاں کھڑے کھڑے پتہ چلا کہ قبر اور حجاز میں کیا فرق ہے۔ مرقہ کچھ اور شے ہے۔ مقبرہ کچھ اور جگہ۔

مکہ چنگے والی میں آسمان ان قبروں پر بھکا ہوا تھا۔ بالکل ساتھ تبلیغی جلسے سے خطاب کرنے والے کے الفاظ قبروں کو چھو کر فضا میں بکھر رہے تھے۔ حضرت مولانا ایسا ان چند لوگوں میں سے ہیں جو زندگی میں ناقابل یقین کام کر گزرے ہیں۔ اس کام سے اختلاف ممکن ہے مگر اسے ناکام نہیں کہا جاسکتا۔ کسی کسی کوششوں سے جب تین آدمیوں پر مشتمل چلی جماعت تبلیغ کے لئے نکل تو مولانا نے کہا ”آج سے ایک انقلاب آ گیا ہے“

یہ انقلاب کسی نے دیکھا تھا پورا نے دیکھا پاکستان میں سالانہ جلسے کے موقع پر آئے۔ جہاں حج کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ شاید اس طرح اصطلاحی معنوں والا انقلاب بھی آجائے۔ سچے آدمی کی بات کو کھلتا اور تاریخ پر آکر نہ کی پابند ہے۔ تبلیغی جماعت کو جماعت کہنا گراں گزرتا ہے۔ نہ اخبارتہ پر یہ بیگناہ نہ فتنہ و فتنہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رہتی جماعت سے نہ حکومت سے غرض نہ حزب اختلاف سے نہ مشرب نہ ریکارڈ نہ ایمین باؤدواؤں سے رابطہ نہ بائیں والوں سے کچھ بھی نہیں ان لوگوں کے پاس سوائے ارادے کے۔ ارادہ ہی ان کا سبب کچھ ہے۔ ان کا طریقہ تبلیغی ہے کہ جب کچھ نہ کیجئے ارادہ تو کیجئے اور یہ ارادہ ہے کہ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں کہ جہاں تبلیغی جماعت والے نہ پہنچے ہوں۔ اور وہاں کے لوگ ان کے سامنے نہ بن گئے ہوں۔ مولانا ایسا نے کہا ”مسلمان سناؤ اس دن یہ ختم ہو جائے گا جب قبر پر سمجھا شروع کر دو گے کہ دین کا کام صرف تم کر رہے ہو۔“

یہ کام اب بھی ختم نہیں ہو گا۔ یہ بات مجھے اس لئے یاد آئی کہ کئی دینی جماعتیں ہیں کہ جو ان کے ساتھ نہیں اسے کافر ٹھہر کر دیا جاتا ہے۔ کئی اسلامی جماعتیں ہیں جو ان کی حامی نہیں وہ شہادت نہیں دیتی انتہائی ہیں جو اپنی جماعت سے باہر کے لوگوں کو رجعت پسند کہتے ہیں تا مگر ان کی اپنی کے آدمی تمام دوسروں کو

آزادی کی موت پانے کے سفر تک پہنچے ہوئے عطا اللہ شاہ بخاری نے انگریزوں کو اپنی زمین پر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا تھا۔ ایک اور دستے پہنچنے والے اپنے سر مولا نا ایلیاس سے ملنے کے لیے دیوانے ہوئے تھے۔ کان لگا کر سننے والے نے بخاری صاحب سے کہا کہ مولانا کہہ رہے ہیں تبلیغ کے لئے کچھ وقت دیں۔ شاہ جی نے جواب دیا

”اب اس عرصہ میں وقت میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے اب میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں“

ہوئے پھر پہلے کان لگا کر سننے والے نے کہا

”آپ ہمارے کام کے قواب ہوئے جب آپ کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ آپ کسی کام کے نہیں“

بڑا کام وہی کر سکتا ہے جو کھتا ہو کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ دعویٰ کرنے والے کسی درد کا ادوی نہیں کر سکتے۔ اب حکمرانوں اور سیاستدانوں اور مذہبیسوں سے دعوے اور وعدے کو بھی بھرتک کر دیا ہے۔ اس واقعے کے تین چار دن بعد مولانا ایلیاس کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ نہیں تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کس قدر ہیں۔ اپنے دست ہونے پر اتارنے والے نہیں ہوتے تو انکے نہیں ہوتے۔

مولانا ایلیاس کے بارے میں یہ ساری باتیں میں اپنے پر محرم کو بتانا چاہتا ہوں اور یہ تحریر پڑھنے والا میرا ہم سفر بھی ہے تبلیغ کے لئے بھی مسافر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ تبلیغ اور سفر میں فرق نہیں۔ مولانا نے تبلیغ کے ذریعے لوگوں میں ذوق سفر کو ترقی بنا دیا۔ سفر اپنے باہر کی طرف۔ ظاہر سے باطن کی طرف۔ اپنے جہان میں کسی اور جہان کی طرف اس جہان سے اگلے جہان کی طرف۔ کئی جہانوں سے نئے جہانوں کی طرف مولانا کے طریقے نے مبلغ اور مالک کو ایک کر دیا۔ تبلیغ کو تخلیق بنا دیا۔ مالک کے توسعی ہی مسافر کے ہیں۔ تو پھر مبلغ اور کیا بوسطر اختیار کرو یعنی مشق اختیار کرو۔ زندگی اسی اختیار کا نام ہے باقی سب بے اختیار یاں ہیں۔

لوگوں کو لفظ تبلیغ پر اعتراض ہے۔ تو پھر یہ ابلاغ کہاں سے آیا ہے اور وہ کیوں اپنی تحریروں میں ابلاغ کو ایک مسئلے کے طور پر اپنے سامنے پاتے ہیں۔

بڑے بڑے حرا داروں کا گھٹھا اس کی قبر کے سامنے اپنا اہم بدلہ جا رہا تھا۔ اتنی دیر تو ہمیں محبوب الہی کے حزار پر بھی میں لگتی تھی۔ تاریخ تبلیغ میں مولانا شہید زماں کے وارث تھے۔ ان کی دعوامیں کچھ بھٹکا کر لائے کا اندازہ رکھتی تھی۔ اس کے بعد آئندہ لوگو کو کھان کر دینے کا طریقہ ان سے زیادہ کسی کو نہ آیا۔ دعا کو عمل بنا دیا کیا مگر کیا اب ہم پر عمل کے کیمرے ہی نکلتے گئے۔ تبلیغیوں پر ایک اعتراض ہے کہ وہ گھر سے نکلتے ہیں قان کے گھر والے سے گھر ہو جاتے ہیں۔ بلکہ سارا بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کے گھر وہی پریشان انسان کا مایہ ہے کہ تا شروع کر دیتے ہیں ان کے پیچھے وہی حال ہوتا ہے جو عیسائی کے لئے غیر ممکن میں جاتے والوں کا ہوتا ہے جیسے کنا اور نیکیاں کنا محض عمل ہو گا مگر

روسی ایجنٹ کہتے ہیں اور روسی لابی والے سارے مخالفین کو امریکی پھٹر کتے ہیں کوئی ایسا ہے نہیں یہ ان کی ذمہ داری نہیں۔ چونکہ ان کے ساتھ نہیں لکڑاؤ ہوگا۔ یا اسے ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب ہے ہماری اکثریت کا فروغ اور انقلاب دشمنوں کی بے لوث خیر کرے۔

مولانا کا خیال ہے کہ جو بھی جس طرح غلوں کے ساتھ وہیں کا یعنی حق کا کام کر رہا ہے۔ اس نے

مولانا نے انکساری کی انتہا اپنے کام کی ابتداء کی اور اس میں ایک اور انتہا ش کر دی۔ تبلیغ کے دوران ایک پھلان کو دھت دی۔ اس نے سنی ان سنی کر دی۔ آپ نے ایک بار اور مت کی۔ اس نے تعمیر بنا دیا۔ آپ اس کے پاؤں پر کڑوے لگے کہ مجھے معاف کر دو۔ میں صبح طرح سے بات آپ تک نہ چلا سکا۔ مجھے معاف کر دو۔ وہ پھلان بار گیا۔ بار کے حیت گیا۔ اس نے کہا

”میں ان پڑھ ہوں۔ میں کیا تبلیغ کروں گا“

”تبلیغ دوسروں کے لئے نہیں ہوتی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اپنے لئے ہوتی ہے“

یعنی تبلیغ کے لئے تقریر ضروری نہیں ہوتی

چونکہ یاد رکھنا ہے قواس مل کے تسلسل میں خود جانتا ہے۔ سویا ہوا آدمی سوئے ہوئی کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ آج کل زور زور سے بولنے والے دوسروں کو چپ رہنے کی تلقین کر رہا ہے۔

رات رات بھر جانتے رہنے کے دوران ایک وفد ہوئی نے آپ سے پوچھا۔

”کیا بریطانی ہے آپ کو“

”بھری بریطانی کی حمیت خیر ہو جائے تو جھگڑنے والے دو ہو جائیں پھر سو ہو جائیں اور“

پھر

اور آج جھگڑنے والے انکوں کی تعداد میں میں مگرینہ کا قبضہ نہیں ٹوٹا۔ مولانا سے کیسے پوچھوں کہ اب کیا کیا جائے تعداد زیادہ ہو تو حکومت بنائی جا سکتی ہے۔ زندگی بنانے کے لئے قاور کچھ چاہئے۔ یہ اور کچھ کہیں ہمارے اندر ہم ہو گیا ہے اور ہم باہر ہم ہو گئے ہیں۔

مولانا اصل میں صوفی تھے۔ کچھ مولوی بھی تھے۔ کسی قسم کے وہ جذبات اور عملوں کی منتظر ہے کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے مولانا کا کمال تھا کہ کسی کو بواہن نہ لگے دی اور کامیاب ہوئے۔ کشادہ عملی نے انہیں سرور خدا کھڑا آپ نے لکھا۔ نام کے مسلمان کو بھی کافریہ کو۔ کافر کو بھی کافریہ کو کہ تم اس کے مستحق ہیں خیر نہیں رکھتے۔“

جن لوگوں کی ہمیں اور انھیں کھرے ٹوکوں سے بھری رہتی ہیں ان کی خدمت میں عرض ہے کہ

آخری عرصہ میں مولانا ایلیاس صاحب نے اس طرح جان مار کر کام کیا کہ ان کے ایک ساتھی نے کہا۔

”ہذا کی قسم جنت اور دوزخ اس شخص کے سامنے آجائے تو جی اس سے بڑھ کر کام نہیں ہو سکتا اور یہ کر رہے ہیں“

مجھے یہ غلط ہونے لگا تھا کہ کوئی تبلیغی بھائی ہماری طرف بڑے گاؤں بڑی عاجزی سے عرض کرے گا۔
 ”بھائی کلر سٹاؤ“

پھر ہم اسے کیا سنائیں گے۔ کلر ہم نے بھلا دیا ہے ہم کلر پڑھتے ہیں مگر ہمیں یہ نہیں ہوتا کہ ہماری پڑھ رہے ہیں۔ رستہ رائے سبکی کی طرح۔ اس کے معنی ہمیں نہیں آتے۔ ہمارے لئے یہ کلر بھی کوئی فخر و بے باجی نہ ہے۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں خطا گھمرائی ہوئی شوقی کے ساتھ یہ نہ کہہ دے کہیں جی کیا ہوا کہیں کلر بدل تو نہیں کیا

کلر اور کلمات بدلنے کی کوشش تو بہت ہو رہی ہے دنیا میں اس لئے دیکھتے ہیں مسلمان کو مسلمان کرنے کی ضرورت ہے انسان کو انسان بنانا ہے مگر وہ معاشرہ کہاں ہے جس میں یہ انسان رہیں گے۔ ہم انسان بنانے کے لئے ہیں گئے ہوئے ہیں تبلیغی بھائی ان حلقوں میں نہیں پڑتے ان کا جو تبلیغی نصاب ہے۔ اس میں دوکڑ کا ذکر نہیں وہ صرف فرد کی اصلاح چاہتے ہیں کسی معاشرتی نظام کی ان کو ضرورت نہیں تبلیغی جماعت والوں کے خلوص اور درمندی پر کسی کو شک نہیں مگر اس کا کیا کریں کہ ہماری رقیبیں اور ہماری رقیبیں ایک ساتھ بدعتی جلی جا رہی ہیں۔ ہمارے خوف اور ہماری امیدیں ایک ہی لباس پہنتی جا رہی ہیں کہتے ہیں کہ ایک معاشرہ انسان کے اندر بھی ہے ہم سب اس معاشرے میں کیوں نہیں رہتے مگر یہ تجربہ ایک سوال ہے۔ تبلیغیوں کے پاس اس سوال کا کبھی سوال کا جواب نہیں۔ ان کے پاس کوئی سوال ہی نہیں۔ ان کے پاس صرف عاجزی ہے اور ارادہ ہے اور وہ دنیا والوں کے ارادوں سے بے خبر ہیں جن لوگوں کی موجودگی ان کی بہت بدعاتی ہے سنا ہے وہ ان غیر ملکی بڑے بڑے اداروں کے ایجنٹ ہیں جو ہر وقت اس فوج میں ہوتے ہیں کہ مسلم طاقت کہاں کہاں ہے اور کہاں تک ہے یوں کہنے والے تو مسلم ہر حال مسلمانوں کے گھر پہنچا ہوتے انوں سے لاکھ درجے افضل ہیں سبب بھی کہیں مسلمانوں کی تشاؤ کا یہ کہ آگاہی کرتے ہیں تو خوف زدہ ہو کر کئی ادارے بری طرح سرگرم ہو جاتے ہیں پہلے خود کو پوری طرح باخبر کرتے ہیں پھر بصورت حال کو بے اثر کرنے میں لگ جاتے ہیں اور اس کے لئے کئی طرح کے طریقے استعمال کرتے ہیں اب تو شاید مسلمانوں کا کوئی اجتماع نہیں پیش نہیں کر سکتے۔ حج۔ کچھ تبلیغی بدعت کا۔

اپنے تبلیغی اور انقلابی سفر میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید الی طالب میں محصور ہو گئے۔ صحابہ کرام گھبراہٹ ہوئے تھے تو وہ طاقتور ہستیوں عمر بن حبشہ (ابو جہل) اور عمر بن خطاب (خلیفہ دوم) میں سے کسی ایک کے مسلمان ہونے کی ضرورت نہ دیا۔ دونوں اسلام کے خلاف تھے۔ دعا قبول ہوئی۔ عمر بن خطاب مسلمان ہو گئے۔ تو مسلمانوں نے پہلی مرتبہ خلیفہ میں جاؤ ان دی۔ ہمارے زمانے میں بھی دو طاقتیں ہیں یوٹائیٹڈ شیٹس (امریکہ) اور سویت یونین (روس) دونوں اسلام کے خلاف ہیں تبلیغی جماعت کے اکابرین کو معلوم ہو گا

کہ عمر کی طاقت رسول کریم کے اشارے کی منتظر رہتی تھی۔ خیر ہے کہ روس اور امریکہ میں تبلیغی کام ہو رہا ہے۔ اسلام سلامتی کا بیضیہ ہے۔ خطرے اور خوف سے بھرے ہوئے اس زمانے میں سلامتی سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی۔ ”وہائے رسل“ ایک بار پھر کسی بچہ دل والے لکھی زبان والے کی منتظر ہے۔ عمر بن کوئی طاقت جب محبت کی بنا سے نکل بھاگے۔ تو اس کے زوال میں بہت قوی تر دن لگتے ہیں۔ عمر بن بشام (ابو جہل) کا کیا شہر ہوا۔ ایک زمانے میں سلطنت برطانیہ کے جاہد جلال کا کوئی خلیفہ نہ تھا۔ اس کے پاس صرف بی بی سی ہے۔ اور یہ بی بی سی یہودیوں کی داشت ہے۔ پھر آخر روس یا امریکہ (سپہ یاروں) کسی ٹھنڈ میں ہیں۔

غیاث الحق بھلا بھلا ہے جو تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع میں شرکت کے لئے رائے دینا چاہتا۔ اسے بھی وہ خط و تبلیغ کا بڑا شوق ہے۔ بدعتوں کی طرح اس کا طریق کار بھی عاجزانہ ہے۔ اس کے عوام بھی فکل اور انکسار سے انتہائی ہوتی مٹی میں ترپ رہے ہیں۔ شاید ایک غیر سیاسی مذہبی تنظیم تبلیغی جماعت سے وہ کسی بڑے کاروائی کی امید رکھتا ہے۔ اللہ کرے افغانستان اور کشمیر کے علاوہ بھارت روس اور دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے لئے سوئے والا تبلیغ کو تحریک کا درجہ دلانے میں کامیاب ہو۔ تبلیغی جماعت اپنا اصل کردار کب بچانے لگی۔ پہلے زمانے میں جو لوگ مبلغ تھے وہ سیاسی بھی تھے۔ ہماری تاریخ سپہ سالاروں (جرنیلوں) کی تاریخ ہے۔

میلے تولیوں کی قطار

میلے تولیوں کی قطار باہر گلی میں مٹی ہوئی تھی۔ کمرے کے اندر ایک کچی بوڑھی بھتیجی تکی کے علاوہ ایک آدمی گپ لگا رہا تھا۔ کمرے سے نہیں چلتا تھا کہ آگے کیا کہے۔ ہمارے پاکستانی ہونے کا بے بسی ہلکے میں احساس ہو گیا تھا۔ پھر وہ صرف بھارت بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے بارے میں بے ظلم بن گیا بھارتی مسلمان ہم سے کچھ پرچھے تھے تو بہت لے دے تھے۔ ہندو وہاں جس کشادہ رویے سے ہمیں کمرے تھے کوئی اور اس سے آشنا بھی نہ تھا۔ میں نے واڑھی بھائی۔ آج کل بانیوں کو واڑھیاں بنانے کا طیفہ میں آتا واڑھیاں رگڑنے کے ماہر ہو گئے ہیں۔ اور لوگ واڑھیاں رکھنا چھوڑتے جا رہے ہیں۔ واڑھیاں پھوڑنے کا شین ہوا جا رہے ہیں فیشن کا کیا ہے کیا ہے ہو جائے۔ ٹائی بیری دیکھنی میں دیر تک دوڑتی بنا تار ہا۔ اس کے پاس کسی انٹرنیٹ جانتے کرنے کا طریقہ تھا۔ ہم نے جو اسے معاوضہ دیا پاکستان کے حساب سے تھا۔ مگر اس کی جہ انہوں سے بھی زیادہ تھا۔ اس نے بھی کئی دوسروں کی طرح ہمیں بتایا کہ تقسیم ہند کے فسادات کے وقت ہندو مسلمان اس بستی میں پہنچ گیا تھا۔ اس کی بات درست ہوگی مگر اب اس کی حالت تھی اسے دوبارہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس بستی میں آتا ہو گا میں اسے کیا مشورہ دیتا۔ ہمارے مشورے ان کے کسی کام کے نہیں۔ انہیں خود کوئی کام کرنا پڑے گا جو کارنامہ بن جائے۔ بھارت میں اب جو حال ہے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام کے بڑے امکانات ہیں۔

بازار والی گلی تھوڑی دور جا کر ختم ہو رہی تھی اس سے آگے کھانا تھا۔ گاؤں کا ساں۔ مگر شر ختم ہوا تھا۔ ہم کہیں کہیں مکانات کی بیوند کاری میں قائلہ مارہ گیا تھا۔ ان بستیوں میں فقیر کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہوتا۔ اس بستی کے ایک دو سیوہ علاقے میں بے شمار حراوات پھیلے اور تریب سے بہتے ہوئے ہیں۔ مگر غالب سے گزر کر ایک بڑے ہالی میں بے ڈیرے ہیں۔ ہم وہاں گئے اندر قبروں کی حالت بہت ختم تھی۔ ختم ہوئی چاہئے تھی۔ یہ شاید مغل شہزادے اور شہزادیوں تھے

سب کہاں کچھ لائے وہ گلی میں نمایاں ہو گئیں

اب کھانا کہ دلی کے چوراہوں اور باغوں میں پھول بہت کیوں ہیں زخمہ رو جانے والے تو کائنات ہی چن رہے ہیں لیکن ہم غالب کی ہمسائیگی میں ان حراڑوں کے درمیان زیادہ آگے نہ گئے۔ خطرہ تھا کہ ان حراڑوں کی چھت ہمارے سر نہ آ پڑے اور کوئی خفیہ شہزادہ کھن پھاڑ کر جگہ قبر بھاڑ کر ہمارے کپڑے نہ پھاڑے لگے شاید ہم اس سے بھی زیادہ بدسلکی کے مستحق ہیں اس جگہ چھت کے اندر جرنے نے قبر کا زور زیادہ کر رکھا تھا

غالب مغلوب کے ہاں صادقین

مرزا غالب کے پردوس میں ہم غالب اکیڑی کے اندر پہنچے تو ہاں میں صادقین کے لکھے ہوئے غالب کے اشعار نظر پڑے صادقین آئے تو کمرے کمرے سے اشعار لکھ دے۔ اس سے اکیڑی کا حال بہتر ہو گیا ہے۔ اکیڑی کے حالات بہتر کرنے میں نفس نفی کے مطابق حکیم محمد سعید دہلوی کے بھائی حکیم عبد الحمید نے بہت توجہ صرف کی ہے۔ تو جیسے مراد رقم ہے۔ دو مہیاں اتے تو نہیں جتنے حکیم سعید پاکستان میں ہیں۔ ان کا یہاں ہونا نیت ہے یہ لفظ ادھر اگلتا ہے جب تک مال نیت نہ کہا جائے۔ دونوں بھائیوں نے اپنا اپنا علاقہ اپنا لیا ہے میں نے حکیم سعید کو نہیں دیکھا۔ حکیم سعید جیسے ہوں کے ہیں نے تو حکیم سعید کو بھی نہیں دیکھا بھی۔

غالب اکیڑی کے لئے حکومت ہند نے کچھ نہیں کیا بہت کم کیا ہے یہاں جیلے ہوتے ہیں۔ پاکستان سے آنے والے ادیبوں شاعروں فنکاروں کے اعزاز میں دو کتابت کی تربیت کا اہتمام ہے۔ اہتمام صرف اردو کتابت کا ہو سکتا ہے۔ ہندی کتابت کے لئے تو انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ ہندی رسم الخط سے زیادہ رسمی چیز اور کیا ہوگی۔ اردو کتابت (خطاطی) کو بہت کرنے والوں نے مصوری کے پاس پہنچا دیا ہے۔ لاہوری کی یادداشتی کتاب میں کیا لکھا تھا میں نے۔ یاد میں۔ یہ اکیڑی غالب مغلوب کے سے اندازہ کر سکتی ہے۔ مرزا غالب کے دیکھنے کا یہ حق ہے میں ایمان غالب کا سا شاعر ایمان۔ جیسے یہ اکیڑی بھائی اس لئے کھنچتی کہ صادقین اگر غالب کے اشعار لکھے گا۔ صادقین درویش قلندر اور بدو افکار ہے۔ فنکار آدمی ہے لہذا روگاندھی نے صادقین سے پوچھا کونئی خدمت صادقین نے کیا اپنے آپلی گاؤں جانا چاہتا ہوں جہاں میں ڈرائنگ ماسٹر تھا سکول میں۔

پاکستان تو بننا تو بننا ہے بڑے فنکار سے محروم رہتی

اندرا نے وعدہ کر لیا مگر جب صادقین اٹھ کر باہر آئے تو ایک افسر بھاٹا ہوا آپا کہ آپ ابھی اپنے آپلی گاؤں میں جا سکتے۔ صادقین پریشان ہو کر ابھی تو۔ اندرا نے کہا کہ ابھی گاؤں آپ کے استقبال کے لئے تیار ہو گا اور صادقین گاؤں اتنا فیر مقدم ہو کر اسے شک ہو گیا کہ اس کا گاؤں ہے۔ صادقین کو گھر بھری کسی نئی ہوگی کہ دو مہیاں ہو گا تو کیا ہوتا۔

پاکستان تو خدا باد

صادقین نے بگڑتے ہوئے یقینوں اور جراتی ہوئی تمذیبوں اور چھوٹی ہوئی شکلوں کی تصویریں بنائیں۔ اس نے تیرے میز پر خطوط کھینچ کر غور کر کے تصویریں بھی بنائی ہیں۔ ان کے بہت مہیاں ہیں۔ آج کی

آل انڈیا ریڈیو سنٹر شپ

غریب اور مجبور عورت آج کی امیر اور ایڈوانس عورت دو عجیب و غریب امتداد کی طرح صادقانے سامنے آتی دکھائی ہے۔ اس کی تصویروں سے ملتی جلتی عورتیں پوری دلی پور سے بھارت میں پھرتی ہیں۔ محافی ان میں بھی ہیں مگر اور طرح کے۔ بھارت اپنا بڑا سراگرم کر بجا رہا ہے۔ اس کی اندر کی تھمہیر تاباں کی سندھ ناختم ہو رہی ہے۔ یا اسے شمع کیا جا رہا ہے۔ فطرت کے معاملات میں بھی سیاست کا تصنع داخل کیا جا رہا ہے۔

ایک اور طاقت میں صادقانے سے اندرا گاندھی نے منیر احمد شفیق موجودگی میں کہا۔

"پاکستان کے اخبارات میرے خلاف بہت لکھتے ہیں"

تو صادقانے نے بچوں کی سی دلواڑے بازی سے جواب دیا

"لیٹی مجھے کیا پتہ۔ میں تو اخیر پڑھتا ہی نہیں۔"

ایک بڑی سیاست دان ایک بڑے فنکار کے سامنے تصویر عداوت میں آئی اس وقت بھی یہ اچھی تصویر ہی ہوئی۔ خوبصورت عورت کی شرمندگی بھی دل بلا دینے والی اور اسے کس میں نہیں ہوتی اور یہ شرمائے کے انداز سے اتنی مختلف نہیں ہوتی۔ اندرا نے شرمائے اور شرمندہ ہونے کے فرق کو مٹا دیا تھا۔

اس لمحے میں منیر احمد شفیق کا کیا حال ہو گا شفیق موجودگی سے سفارت خانہ پاکستان پورا پاکستان بنا رہا۔ یہاں ایک کپے پاکستانی سفارت کار کی مقبولیت مہمل کی کارروائی یا مہملی شے نہ تھی۔ اس میں منیر کا کوئی نہ کوئی کمال بھی ہے۔ اور بھارتیوں کا بھی کچھ نہ کچھ کمال ہے۔ منیر پاکستان واپس آ چکا ہے۔ مگر اس کی سفارتی کارروائیوں کا چرچا تھا۔ وہاں کے حلقے دونوں ملکوں میں اقبام و تقسیم کے لئے ایسے لوگوں کی سفارش کرتے ہیں جن کی بات یہ ہے کہ کوئی پاکستانی ہو کر بھارتیوں کے دل میں گھر کر لے۔ ورنہ اس کے برعکس صورتحال میں وہاں نہ زیادہ پڑے آئی ہوتی ہے اور بچے لیتے ہیں۔ یہ طبقہ ساری حقیقی افراتفری کا ذمہ دار ہے۔ مام پاکستانی عام بھارتی مام انسان اتفاق پر حلقہ میں ہو سکتا

ہندوستان کا نگر کاؤ فٹری ریاست جتنا ہے ایک مکمل نیکر شہر۔ اخبار پاکستان کا نگر سے مختلف ضلع "یہی حال آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی کا ہے۔ سب سرکار کے ترجمان ہیں۔ پاکستان میں بھی چند لوگوں کی سرگرمیاں بھارت میں بھی چند لوگوں کی سرگرمیاں اور انہی لوگوں کی "گرمیاں" بھی۔ بھارت کا ریڈیو ٹی وی بھی حزب اختلاف کے لوگوں کو لٹ نہیں کراتا۔ دو چار آدمی جو کچھ مہملوں ملاقاتوں میں کہتے ہیں خبریں جانتا ہے۔ بیانات سے بیانات بلکہ ایک ہی بیان خود قول سے خبر بنا ہوا ہے شے خوشخبری کی طرح پیش کیا جاتا ہے کب بڑی خراب اور اچھی خبریں فرق ہی کب رہتے دیا گیا ہے۔ جتنی تنقید بھارتی اخبارات حکومت پر کرتے ہیں پاکستانی اخبارات بھی کر رہے لیتے ہیں۔ یہ کرڈٹ ہماری حکومت سے زیادہ ہماری صحافت کو جانتا ہے ہمارا صحافی بلا شے ہے۔

بزرگ شاعر رفعت سروش کی دعوت پر آل انڈیا ریڈیو پینے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی سامنے تصویریں تھیں۔ تصویریں اور آدمی جہاں بہت ہوں نظر نہیں نکلتے۔ یاد بھی کچھ نہیں رہتا۔ بلکہ پھٹکے اندھیرے میں نہاتی ہوئی عمارت میں بسنے زیادہ سرگرمی کا احساس نہیں تھا۔ پاکستان کے ریڈیو شیڈن والا دور شور نہ تھا۔ سٹوڈیو سے ایک قدم باہر آرام دہ کرسی میں مناسب دیر تک انتظار کر لیا گیا۔ سامنے اندرا جی کی تصویر تھی۔ ہم بڑے تہہ نہ ہوئے۔ اندر وہ کچھ ہوا جو لاہور ریڈیو پر ہوتا ہے۔ لاہور ریڈیو کا موسم تازہ تازہ ہے یہاں ایک پرانے نظارے جیسی حالت تھی۔ موجود ہونے کو محسوس ہونے کے قریب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ دن جگر۔

ہم نے فریش ریکارڈ کر انہیں میرے اس شعر پر رفعت کو اعتراض تھا کہ یہ بھارت میں نشر نہیں ہو سکتا

یوں لگتا ہے میرا دل بھی اک مسجد ہے اڑی ہوئی اپنا جیون ایک نظارہ نامکود نمازوں کا میں یہ شعر لاہور ریڈیو سے ایک مشاعرے میں پڑھ چکا ہوں مگر بھارت ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے اس کی ایک اقلیت مسلمان بھی ہے۔ اس طرح حکومت کی پالیسی کو انہیں پہنچنے کا اندیشہ تھا اور میں نے خود ہمارا بار جنگ کے مقصد کے سامنے باہری مسجد کا دروازہ کھلوا کر کھیلے مسلمانوں کو مظاہرہ کرتے دیکھ تھا۔ کچھ چوراہے کے مسلمان صفیں سیدھی کر کے نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ یہ بھی کوئی بڑا گزیر ہونے کا انداز ہو گا۔

تاجت میں جائے گی

پلوں اور دیوی اور ملیکا کا دعویٰ اور لائق عبادت کے پاس نہ ہو میں تو یہ غریب ملک کتنا غریب ہوتا۔
 لکے کاغذ سے جانتے تھے جب ہم نہ تھے جب ہم نہ ہوں کے لکے کاغذ سے جانتے تھے۔ میں نے اسے
 امر قمریٰ دئی ہے دیکھنا تھانہ پہ شاہ کی وہ دیوی گدی تھی۔ نجانے ابھی تک مندروں میں لادوی کے
 برت کیوں نہیں دکھائے۔ مجھے معلوم ہوا کہ لوگ اسے پوجتے ہیں اور جن دیویوں کے برت ان کے مندروں
 میں ہیں وہ بھی لاکوں لپٹیں قاسم سے پوجتے لپٹیں۔ یاد کرنے اور پوجا کرتے ہیں کیا فرق ہے ایک کاہن کا
 خیال ہے کہ اس ملک پر اب تک عذاب نازل نہیں ہوا تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ابھی لاکھ ہے سب
 چارے مسلمانوں پر تو برق گرتی ہے۔ اچھوتوں اور غریبوں پر کیا کرنا ہے کچھ نہ کچھ نہ کرنا ہے حضرت یونسؑ پر
 ۔ بھارتوں کیلئے اطلاع ہے کہ عذاب سیکڑا ہو تا ہے اسے بعد ملک مسلمانوں میں فرق کرنے کی ضرورت
 نہیں ہوتی۔ بھارت و اوان کیلئے لکے کاغذ فی الحال دعائے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک محفل میں لاکو گاتے ہوئے سن کر ضرور سب سے اتر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو
 تھا اور وہ اپنے قابضین نہ تھا۔ لاکو آواز اس کے اندر کسی اور کو بگاڑ دیا تھا۔

اے سچے سن کر بغیر کیا کیا کہ بندوں کیلئے گناہنا عبادت ہے اس کی آواز کی جتنی عزت ہے
 لہذا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اندر کی آواز ابھی تھی وہ گاتی تھی تو دھرتی و حریم و دھاب اور دھیان
 بھارتی سیاست میں الگ الگ خانے بنا لیتے۔ لاکے اور دوسرے ۱۹۳۷ء میں کاٹھنوں کیلئے کیسے اتفاق
 ہوئے ہیں تاریخ میں۔

ایک دفعہ ہمارے کچھ دوستوں میں بحث چھڑ گئی کہ۔ تاجت میں جاہلیگی کیلئے یہ حق کہ اس نے دتے
 گیتے کاغذ ہیں اور اس نے بغیر بھی لپٹیں لپٹیں لپٹیں لپٹیں اس ملک کیلئے رائے کی بات آخری ہوئی تو
 تاجت میں جاہلیگی تھی مگر جنت اور دوزخ کے ٹکٹ ہائے اور بیک کرنے کا حق کسی کو نہیں ہوگا کچھ فیصلے
 اپنے طور پر سناتے رہتے ہیں۔ جبکہ کسی کو اپنے بارے میں بھی بغیر نہیں کہ وہ جنت میں جاہلیہ الہیت
 دوسروں کیلئے دوزخ کا قادیان دینے والا ضرور دوزخ میں جاہلیہ۔ لاکے اس جہان کے جہنم زار ہیں جنہوں کی
 نشانیاں تحقیق کی ہیں اسے سنتے ہوئے لوگ جنت کی وادیوں میں اتر جاتے ہیں اس نے سبھی زار ہیں اور
 دیران جہان کو آباد کیا ہے۔

لاہوتی آسانی اور سولت سے گاتی ہے کہ آدمی وہ ساری آسائیاں سوسائیں اپنے لوہوں میں تیرتی ہوئی
 پاتا ہے۔ کچھ گوارا گاتے ہوئے اتنی مشکل میں نظر آتے ہیں کہ سننے والے کے سبب میں بھی وہ شروع ہو

جاتا ہے ہیں اس وقت مشکل میں پڑ گیا جب بھارت میں کچھ لوگ لکے کو پروردہ سے ہوتے دیکھے
 نور جہاں ملک ترنم کے بارے میں پوچھتے تھے۔ نور جہاں پاکستان کی بہت بڑی صاحبہ تھیں۔ لکے آواز میں باطن
 کی گہرائیاں شامل ہوتی ہیں نور جہاں کی آواز میں بدن کے رنگ بولتے ہیں اس میں سوز و ساز بھی ہے سوز اور
 ساز علیحدہ علیحدہ راز بھی ہے جسے وہ ظاہر کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ لوگ اس راز کو افشاء ہونے دینے
 کیلئے لکے کہتے ہیں۔ سارے فن کی لکے راز پائے کی گلیں سے پھرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی راز پندہ کرتے
 کی دھن میں سما جاتے ہیں۔ لاکے گاتی ہے تو شرار برپا ہوتا ہے۔ نور کی اعلیٰ ہے تو انوار ہے قابو
 ہونے لگتے ہیں۔ خوبصورت ہوتا ہے انعام سے بغیر طور پر برصورت خوبصورت ہوتی ہے جو کارہ کی
 حیثیت سے نور جہاں کا ایک ڈس کرپٹ ہے کہ وہ خوبصورت اور حیران و حیرت ہے۔ لوگ اسے
 گاتے ہوئے دیکھتے ہیں راز مظہر تھی ہے اسے سنتے ہوئے سارے مظہر ایک مظہر میں گھل جاتے ہیں

اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

بھارت میں اور بھی آواز ہیں برسرِ گوار کی آواز میں پنجاب بڑا کر پھر آباد ہوا محسوس ہوتا
 ہے۔ پاکستان کی ٹیلی ویژن کی آواز سراسر لکے کی توانائی کی دلیل بن گئی ہے اسے خواہ فر۔ لاکے نے کافی
 مالا مال کیا ہے۔ آواز میں راج کرتی ہیں دونوں طرف۔ ہر طرف لاکے ان آوازوں جیسے کیوں نہیں ہو
 جاتے۔ خود گاتے والے اپنے کچھ نہیں کہیں کیوں نہیں ہوتے۔ سنا ہے قلمی سیاست پر لاکے حکومت اس
 طرف ہے جس طرح اندر کی لکے سیاست ہے۔ ہمارے نور جہاں کی چٹائی ہے ان علاقوں میں اور سینکڑوں
 میں۔ وہ تو پورے ملک کو سنبھال رہا ہے پتا ہے۔ لاکہ اور نور کی بارے میں نہیں ہے نہیں مانا۔ ایسا ہے تو بھی
 نہیں مانا پاکستان میں کسی اور گاتے والے ایسا نہیں ظاہر ہوئی ہے نہ نور اور عابدہ پریوں۔ خوش حال
 گوارا کا اس میں تاپنا اور خراہ و مہا پڑا اور سرست نہ تو لکے اور بھارت میں جنہوں نے غلام علی۔ غلام
 علی کی عزت بھارت میں ہوئی کہ پاکستان میں اس کی عزت ہے۔ زیر و زور تو نہیں بنائی۔ اپنے عطاء
 اللہ خان جیسے خیر ساری کی کھلی دھلی گانگی کی ریکارڈ ڈیز جنت کا ڈکڑ کی چلائی دہر صدائیں ہیں
 جنہیں صرف ہوائیں سنتی ہیں۔ وہ نقد میں گھل جاتی ہیں۔ ساعت کا کوئی دور واہ نہ کیلئے نہیں ملتا۔
 دور واہ سے بندہ کھنکے کی رسم اب تک جاہلیں نہیں رہی ابھی بات سن کر ابھی آواز سن کر آدمی کے اندر
 بہت سے دور واہ سے خود بخود گھل جاتے ہیں اگر بھارت والے اپنے توجہ انوں میں گانگی کشادگی اور شائستگی
 کا بلا جادو طریقہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان میں دوسروں میں لکے کاغذ سناتے چاہئیں۔ پاکستان میں
 بھرے خیال کے مطابق ہر طرح کی گانگی کے علاوہ بچوں کے اندر باقاعدہ قرآن سننے کا دینی پیدا کیا جائے۔
 قرآن پڑھنے کے سیکھوں انداز ہیں۔ قرأت کے باطن میں سارے مرموعہ و نیک عظیم امر کی گوارا
 اس لئے مسلمان ہو گیا کہ قرآن میں حیرت انگیز دھنیں محسوس ہوئیں پھر میں حیران ہوں کہ یار لوگ
 موسیقی کے حرام ہونے کا قادیان ابھی تک نہیں افشاء پھرتے ہیں۔

ٹچ بٹن دی جوڑی

دوسرے کی لذتوں کی بھول بھلیوں میں۔ منزل کو عربی والے گھر کھتے ہیں بحر تو وہ دونوں گھر سے پہلے کسی اور گھر میں پہنچ گئے تھے۔ جب وہ ایک دوسرے کے درمیان قاصد لے کے کھڑے ہوئے تھے تو شاید انیس پچھل تھا کہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان میں اقتدار کی منزل تک پہنچنے کیلئے شریعت کی لٹ کتنی ضروری ہے۔ ہمیں یہ بھی فکر تھی کہ کہیں لٹ سے نکل کر بھی وہ منعی نہ رہیں کسی حراسہ فکر منہ یاں۔ جس بھاری۔ ہم اپنی منزل سے بھی اوپر چلے گئے۔ اب آخری منزل سے پہلے نیچے اترنا چھاننا لگا ہوا جا کر دلی کا نظارہ نہ کرنا اور برا تھا۔ اتنی اونچائی سے سولی ہوئی دلی بہت پیاری تھی تیر نظر تک شری شہ تھا اس وقت کون کس حال میں ہو گا جو دو صال کے کیسے کیسے رنگ بول کے یہ کون جان سکتا تھا۔

وہ امریکی تھا۔ اس کے ساتھ ٹینی امریکن ہوئی۔ عطا نے ان کو سگریٹ پیش کیا۔ عطا پاکستانی گولڈ لیف کا مستحق بھر کے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسے بھارتی سگریٹ کاؤ انڈر پنڈ نہیں۔ امریکی اور امریکن کو یہ سگریٹ پنڈ آیا اس طرح شناسائی کا شعل چکا اور پھر وہاں اس کے بعد دھواں دار انگلو۔ بات افغانستان پر دو سیواں کی فنی طغار سے شروع ہوئی اور پاک بھارت تعلقات کے میدان بگڑ میدان جنگ میں پہنچ گئی۔ امریکی خارجہ پالیسیوں کی کمزوریاں اور اپنے دوستوں کی مجبوریاں نہ سمجھنے کی ذہن ستیاں زیر بحث آئیں۔ امریکی نے بغیر کسی تردد کے اتفاق کر لیا مگر وہ صدر امریکہ ہوتا تو کبھی اتفاق نہ کرتا۔ سیاستدانوں کو اتفاق نہ کرنے کی عادت سی ہو جاتی ہے۔ اصل حزب اختلاف تو حکومتی پارٹی کے لوگ ہوتے ہیں۔ امریکی کی سادھن ہوئی کچھ نہیں دو ایک بار مسکرائی ضرور۔ شاید وہ بھی ان باتوں سے متفق تھی۔ غیر متفق تھلا تھی۔ دو دونوں بیرون تھیں کیلئے گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ دنیا جہان کے مسائل حل کرانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ صرف گپ شپ کے موڑ میں تھے۔ شپ کے زیادہ موڑ میں تھے۔ اس وقت ہمارے درمیان میرنہ تھی مگر انگلو مزید اڑھی۔ لہذا فیمل جاکسی سمجھے۔ بات اور مزید اڑنے لگی۔ دو دونوں ایک دوسرے کو پینے کی پیادوں والی نظروں سے دیکھنے لگے ہم اٹھے اور لٹ کی طرف گئے۔ ایک اور جوڑی ایڑی جلدی میں اندر آیا بلکہ انہوں نے ایک دوسرے کو اندر کیا۔ دونوں ایک دوسرے کو چوستے چوستے پیچے۔ فٹ گئے۔ ہم بھی پیچ گئے۔ دونوں ہٹ بے تاب تھے اور بے قابو۔ ایک دوسرے کا خواب دیکھنے کیلئے بڑھائے کیا ہوا کہ وہ بہت کر کھڑے ہو گئے مگر ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے ہٹتی نہ تھیں۔ یہ ایک دوسرے کی حفاظت تھی۔ کشمک کی کاغذ شاپوہ ٹخن جانے کا اندیشہ جس نے انہیں یکے قابو ہو سکی شہ دی تھی۔ شاید ابھی ابھی ان کا تعارف ہوا تھا یہ مغربی لوگ اس معاملے میں حیران کن ہیں۔ ہم نے ان کے بارے میں ٹچ بٹن دی جوڑی میں ساقلار مولانا بنا رکھا ہے صحیح ہے اور غلط بھی ہے۔ وہ اس لحاظ سے ایک دوسرے کیلئے آسان ہیں کہ فیصلہ یہ طرفہ نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں عورت نے ہر طرح کے فیصلوں میں ابھی پوری طرح شریک ہونا نہیں سیکھا۔ رچہ کام اس کا بھی کم نہیں کسی کام میں اور مغربی عورتیں ایک وقت میں ایک ہی ہوتی ہیں۔ آپ کی دوستیں چائیں گی مگر ”وہ“ نہیں بیٹیں گی۔ دو جوڑا پانچویں منزل پر لٹ سے لگا ہلا انہوں نے ایک دوسرے کو نکالا۔ یہ فوکر کا تیرہ منزل کس سے کیا ہے۔ دو دونوں کمرے تک پہنچے بھی یا رستے ہی میں اپنی منزل نشاط پالنے کی کوششوں میں جھٹک گئے۔ ایک

کر بھی تعداد کا حفظ ان کیلئے نہیں بولا جاسکتا۔

یاد تری نواس سے چلے جانے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ کسی کانہ چاہتا ہو گا کہ ہم کچھ اور شہروں میں بھی جانا چاہتے تھے مگر یہ چاہت اس پر زور ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی تھی۔ اس کے باوجود اپنے ملک اپنے شہر اپنے گھر کو لوٹنے کی تسکین نوکدار ہوتی جاری تھی۔ حسن و شوق جو اپنے ملک میں ہے یاد تری نواس میں پوری دنیا میں کیا ہو گا۔ یہاں کئی بار ارادہ بن رہا کہ کچھ اور جا رہا تھا کہ کب پاکستان جاتے ہی پاکستان کے سفر پر نکل کھڑا ہوں گا۔ "پوری دنیا" کی آوازیں سے لبریز یاد تری نواس میں جو دلکشی تھی اتنی دلاویزی تو صرف لاہور میں بھری پڑی ہے جھلکی پڑتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم لاہور سے نکلیں ہی نہیں۔ پاکستان سے کہیں جائیں ہی نہیں۔ پاکستان میں کئی ملک ہیں لاہور میں کئی شہر ہیں۔ دنیا بھی جہاں کہہ دینے والی تھی دنیاؤں سے بھر بھر کر متواتر گھر رہی ہے۔

ہم یہاں یاد تری نواس میں رات دیر ویر تک جاگتے رہے۔ صبح جلدی جلدی اٹھ بیٹھے باہر نکلے نکلے بھی لیٹ ہو جاتے۔ کبھی چاہیں کمرے میں رو جائیں اور کبھی اس چیز کیلئے کمرے کی طرف جاتے جو ہمارے سامنے میز پر پڑی ہوئی۔ وہاں سامنے کیلئے کو اور دست بجز یہ نہیں۔ ہم کرسیوں پر پڑی چیزوں کو زیادہ دیکھتے تھے ان اللہ۔ انسان (عورت اور مرد) کو طرح طرح کا حسن عطا کر کے کیلئے نفرت نے سب سے زیادہ محنت اور فیاضی برتی ہے مگر نفرت کی مکمل حفاظت کیلئے ہمیں عورت کے اندر دور تک حلاش جاری رکھنا ہوگی۔ عورت اپنی آزادی تلاش کرتی پرتی ہے۔ اسے معلوم نہیں یا اسے معلوم ہوئے نہیں وہاں چاہے کہ اس کے اندر پوری انسانیت کی آزادی کا بیج لکھا ہوا ہے۔ وہ اسے پڑھے اور پڑھ کر سب کو خانے کیلئے کئی بیانات ہم نے دیے ہیں۔ عورت کو پڑھنا بھی ایک اچھا کام ہے اسے سنا اس سے بھی حیران رہے۔ پیغام ہمیں کچھ کچھ یاد ہے مگر چیزوں کو یاد کرنے کیلئے بار بار پڑھنا پڑتا ہے۔ ایک بار پڑھ کر یاد کرنے والے سو رہے ہوتے ہیں۔ پہلی ملاقات بھی یاد رہ جانے والی واردات ہوتی ہے مگر کچھ تعلق کے لئے کسی نہ کسی تسلسل کی ضرورت ہے۔

ہم وہ کچھ بھی روٹیوں میں تاشا تھے پرتے ہیں جو اندر جڑوں کے سوا کہیں نہیں ملے گا۔ حسن اور حقیقت کی کچھ حقیقت اور کچھ حسن اندر جڑوں میں چبکا اٹھتا ہے۔ گھپ اندر جڑوں کا لانا ایک حسن ہے۔ پتلا پتلا سلا جب ایک دوسرے کا لمس ہی سب کچھ ہوتا ہے انہیں بھی غلام ہو بھی۔

یاد تری نواس میں صبح کے وقت آج بھی ناچتی پھرتی تھیں کوئی آواز ہوا کئی جا رہا تھا۔ میں کمرے سے لانی باہر نکل آیا تھا۔ ہر طرف مٹھری مٹھر اک سوہنا تھوڑا سا اٹھایا (ایک توہین اس پر سو کر اٹھا) زہر نہیں ہو سکتا اس "بولی" کا۔ جہیں حرم ہو جانا ہے تھلاں کا ترجمہ پرتی تھیں "بولی" نے جسم کو لکھا تھا۔ "بولیاں ہی بولیاں" صہیں ہی صہیں

اگر سولہ نہ آتے تو صبح کافی تھی

یاد تری نواس میں حسن فراواں

یاد تری نواس کا مطلب شاید مسافر نواز ہے مسافر نواز بہتر ہے۔ سفر پر شرط بقل آتش۔ ایسا ایسا آدمی تھا یاد تری نواس میں کہ گفتا خورشید لگا لگا کے آئے ہوں۔ سیر کرنے کے علاوہ یاد تری نواس میں رہنے آئے ہوں وہی میں کوئی سیاح آئے اور یاد تری نواس میں نہ رہے تو مجھے وہ کہیں نہیں رہا کہیں کا نہیں رہا۔ یہ بات میں نے اتنی بھی محاورا نہیں کہی۔ لوگ یہاں یوں رہ رہے تھے جیسے کہیں رہے ہوں ایسی ایسی قسم کے حسین چہرے یہاں دیکھنے کو میسر تھے جنہیں دیکھنے کیلئے پوری دنیا کا کئی بار چکر لگانا پڑتا۔ اس کیلئے بھی ہم پر دو گرام ہمارے ہیں کہتے ہیں شکر خود کو خدا شکر دے دیتا ہے۔ بالعموم دجائیں کو بے جن کے پاس کیلئے سے بہت شکر ہوتی ہے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ان کا بھی شکر یہ جنہوں نے ہمیں بھارت میں بلایا۔ اپنے ان افسروں کا بھی جنہوں نے ہر حال ہمیں پاکستان چھوڑنے کی اجازت دے دی۔ پاکستان کی "حیثیت" میں بہت چیز ہے جس نے ہمارے افسران "اچھا بر طرح کی ضرورت کو قافان اور آرٹسٹس کا "تحفظ" دے رکھا ہے۔ مجھے حسین کا شکر یہ جس نے اس "عالمی سرمائے خانہ" میں ہمارے قیام کا اہتمام کیا اور اندرا گاندھی کا بھی جس نے جب یہ عمارت بنوائی ہوگی تو اس کے وجود میں عورت زندہ ہوگی۔ میں اس اندر کیلئے اپنے دل میں اتنی جگہ رکھتا ہوں کہ وہاں کئی یاد تری نواس بنائے جا سکتے ہیں۔ وہ سیاحانہ ہوتی تو عورت نہیں ہوتی یہی خرابی میں سے شروع ہوتی ہے۔ کئی کام اندرائی کے ذاتی حسن کا ٹکس ہیں۔ یاد تری نواس میں رہتے ہوئے ہم نے کئی بار محسوس کیا جیسے اندرا گاندھی نے یہ عمارت خاص طور پر ہمارے لئے بنوائی ہو۔ یہاں رہنے والا ہر آدمی ہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ سامنے ہو لکی ہے نیچے سرنگے پاؤں۔ اس کے سر اپنے پر جو کھڑے رنگ کی راحت اور شرفی ہے وہ بھی یہی کوئی دے رہی ہے وہ جس لوکے کتا کتا باتیں کر رہی ہے وہ بھی نیچے سرنگے پاؤں ہے جیسے اس کی لڑائی کیلئے بنا گیا۔ سو دو دوں ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے تھے۔ پاس کہیں سے کیش کی آواز آ رہی تھی کہ جیسے تجھ کو بنا گیا جیسے میرے لئے "جیسے زندگی میں یہ گانا میں نے ابھی ابھی سنا ہو جیسے کیش نے ابھی گایا ہو "کیش جیسے پسند ہے" آج بہت پسند آیا۔ بڑی بات یہ تھی کہ اس لڑکی لوکے نے ایک دوسرے کو دھمکا دیکس طرح۔ دنیا میں بہت لوگ ایک دوسرے کیلئے ہوتے ہیں مگر وہ ایک دوسرے کو دھمکا نہیں پاتے دھمکا دے دیے نہیں جاتے۔ دھمکا دے لے جائیں تو کسی طرح تم کو گم کر کے چالنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اکثر کامیاب ہوتی ہیں۔ دنیا بھر کے "یاد تری" یاد تری نواس میں رہنے والے کچھ تو دھمکا دے لگے ہوئے تھے۔ کچھ دھمکا دے دھمکا دے گم ہو جاتے والوں کی تعداد تو یاد ہے دوسرے لوگ اتنے کہیں کہیں!

بھارت کا اسپوٹین

میں نے بہت دھوم مچائی تھی کہ برہم چاری جی کی۔ یہاں اندرا گاندھی کیساتھ اس کے تعلقات کا بھی شور تھا۔ برہم چاری کے لوگوں کی عجیب نفیست ہے کہ جوہر کیساتھ تعلقات کا مطلب صرف باہر تہ تعلقات لینے ہیں۔ برہم چاری جی کو بھارت کا اسپوٹین کہا جاتا ہے۔ اسپوٹین کا جو عمل دخل ایک زمانے میں روس کے حکمرانوں اور ان کے خاندانوں کے اندر تھا۔ وہ حملات کے باہر سب لوگوں کو معلوم ہے۔ لیکن برہم چاری جی۔ مدارانی تھی۔ اپنے خاندان کی حکمرانی چکی کر چکی تھی۔ روس کے حکمرانوں سے اس کی بڑی آشنائی تھی۔ آشنائی کی عشقیہ کارروائیاں ہم اخباروں میں پڑھ پڑھ چکے ہیں۔ برہم چاری جی کے ہاں خبریں لگتا ہے وہی پرانی خبر ہے۔ کچھ سیاسی دانشوروں کا خیال ہے کہ برہم چاری جی روس کا بندہ ہے۔ پھر تو اندر اس کی دوستی واقعی چل چکی ہوئی۔ کبھی برہم چاری اندرا حکومت یعنی انڈیا حکومت کے تمام فیصلوں میں با اختیار داخلہ کار کتاب کرتا تھا اس نے اندرا جی کے گھر اور دفتر کو ایک مقام بنانے کی کوششوں میں کامیاب ہوئی۔ جب بھارتی سیاست کے ناجائز بیٹوں نے بھی ان "خفیہ اور خفیہ" کارروائیوں پر اعتراض شروع کر دیا تو راجیو گاندھی کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ مغرب میں ملا رہا ہے بلکہ پڑھا رہا ہے۔ اس کی بیوی بھی باہر کی ہے مغربی معاشرت میں آزادی رائے سے بھی آزادی تعلقات زیادہ ہے اور آزادی ناجائز تعلقات اس سے بھی زیادہ ہے مگر لیڈروں کی جنسی حرکتوں پر بہت نظر رکھی جاتی ہے برطانیہ کے کئی وزیروں کی اس حال میں اس حالت میں چھٹی ہو چکی ہے مشرقی جمہوری تھائیں وزیروں کی بجائے فریق ملی کی آدمی چھٹی کرادی جاتی ہے۔

یہاں فریق ملی چونکہ مرد تھا اس لئے اس کی آدمی چھٹی کر دی گئی۔ راجیو نے ظالم سماج کا ساتھ دیتے ہوئے وہ دونوں کے درمیان دیوار میں کھڑی کر دیں مگر عورت دیواروں اور دروازوں کو ایک کرنا جانتی ہے۔ اندرا برہم چاری ملاقاتیں ہوتا ہیں اور فیصلے بھی سناچتے ہوئے رہے۔ اندرا اس ضمن میں ہمارے بھی بہادر تھے تو وہ بھی ان کے سامنے سر ہوا اور گاندھی بچتے تھے۔ فیروز بھی نہ ٹھہرا۔ راجیو تو اس کا بچہ ہے وہ اندر سے راجیو کے خلاف ہو گیا اندر سے تو وہ ضرور گاندھی کے بھی خلاف تھی وہ سنجیو کے بھی خلاف تھی وہ تو خیر ہوئی کہ سنجیو کو مروا دیا گیا۔ وہ نہ وہ اپنی ماں اندرا کو مروا دیتا وہ سر سے لیکر پاؤں تک بندھتا تھا اندر اس سے ڈرتی تھی۔ راجیو اندر اسے ڈرتا تھا۔ وہاں بھی محفلوں میں بات تھی کہ سنجیو کو اندر اسے مروا دیا ہے جس جنازہ کو خود اڑاتے ہوئے وہ مارا لے کر گئے کاٹھارہ گھر سے ہوا تھا۔ پائلٹ تو راجیو تھا حادثہ سنجیو کو پیش آیا۔ سنا ہے راجیو بھیجن میں خود سرور ضدی تھا۔

یہاں اس قبول حق کا یہ مسلمان تھانہ اور حسن میں کچھ فرق نہیں ہے بھی تو صبح کے وقت نہیں ہوتا۔ خیال ہے کہ صبح کے وقت آدمی برائی نہیں کر سکتا ہے تو بھی ایسا چاہتا نہیں۔ اس وقت شاید برائی بھی برائی نہیں رہتی دن رات کے اوقات میں صبح کا وقت بچپن کی طرح ہے۔ قبول حق کیلئے بھری وہ پیروں سانولی شامیں کالیاں لیاں راتوں بھی کچھ نہ کچھ کر دے رہتی ہیں۔ شکر وہ پیہری آباد و برائی کسی آدمی گاؤں میں گزاریں، سانولی شام کے رنگوں کو اکیلے دریا کے سینے میں غلطے دیکھیں اور کالیاں لیاں راتوں ناراض محبوب کی صحبت میں جاگ کر گات دیں تو۔ ایسا کر تو بیل پیٹے۔ پھر صبح کاذب اور صبح صادق ایک دوسرے کے گٹھے مل کر ہمارے گٹھے سے لگ جائیں گی۔ اس وقت ہم حق کو قبول کر لیں گے یا حق نہیں قبول کر لے گا۔

مغرب والے یہ گھمسان اسرار ملالاش کر کر کے مرے جارہے ہیں۔ ہندو بالخصوص ہندو لوگوں سے زیادہ مغرب زادے اور مغرب زادیاں نظر آرہی ہیں۔ نظر آنے کیلئے تو وہ میاں آئی ہیں یہاں تک آئی ہیں۔ مورت جہاں کی ہو چاہتی ہے کہ وہ ہر طرف نظر آئے ہر طرف سے نظر آنے کی خواہش میں صاحب نظر ہونے کی آرزو میں کہیں ہوگی۔ اس منکشف ہوتے ہوئے عہد میں آدمی کھلے رازوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ جو راز ہمیں اسے بھی راز سمجھ اور نہ مانے پر ملا ہوا ہے۔ طاقتور اور زندہ مرنے والے کیلئے لوگوں کی کیا کمینیں کیا۔ اندر سیاست و حکومت میں کامریوں کے بعد اپنے وجود کی ساری دلچسپیوں کیساتھ یوگا کی طرف راغب ہوئی۔ اس نے وہ بھی سمجھ سیکھ لیا جو ہم چاہتے ہیں اسی تک نہیں سمجھا ہوا۔ سیاست و حکومت میں وہ اپنے باپ کی بھی استاد ثابت ہوئی اپنے استاد کی بھی استاد بنی استاد کو ن سیاست اور یوگا کو ہر گھم کرنے سے اسے روک رہا تھا اس کے دوستوں میں ہی اس کے دشمن تھے۔ یوگا اس کا باپ نہرو بھی کر آ تھا مگر اندر ایک غیر معمولی کردار کی طرح خود پر مسلط ہو گئی۔ یہ تسلط اپنے ملک پر بھی قائم کر لیا اس طرح وہ اپنے وجود کو لاکھود کے دائرے میں لے آتا تھا یہی جی کر لاکھود کو اپنے وجود میں قید نہ کر سکی۔ یوگائی محنتوں کو آخری حد تک پہنچاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں کو لاکھوں نقطوں میں بکھر بکھر دیا۔ پھر اس سادہ اور جوان جسم پر حیوانے پنا پر اسرار پائی آنکھوں کے حوالے کر دیا۔ وہ دیکھتی تو اس کے تن صحن کی ساری حرارتیں اور حریمیں اس کی نظروں میں سمٹ آتیں۔ وہ اپنے سامنے موجود تمام لوگوں کے لہو میں زہروں زاریوں کے ذریعے تک وقت کھینچ چلی جاتی۔ لیکن یہ فیصلہ مشکل ہے کہ وہ ہر ہم چاہی کی آنکھوں میں ذہن کی یاد دہی کیلئے یہ دریا پار کر گیا۔

برہمچاری جی کا ایک تائب ہم سے گفتگو کے دوران بھی کوئی ہاتھ کر رہا تھا۔ ہم تیس تھے بلکہ حلقہ ہوتے جارہے تھے۔ ہر ہمیں اتنا شور تھا کہ اس نے اقبال کا شعر قلم لپکا ہوا تھا۔

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شرف تو دہری کیا ہے

اقبال کے ذکر سے ہندوستان (بھارت + پاکستان) کی سرزمین کی آنکھوں میں سونے ہوئے کئی صوفی ہمیں یاد آئے۔ ان کے پاس جو طاقتیں تھیں وہ تو آج کی بڑی طاقتوں کے پاس بھی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس کا بے محابا اعتبار نہ کرتے تھے اور اسے جانتی کے لئے اور اپنے تکبر کے لئے استعمال نہ کرتے تھے۔ طاقت عیش و ہر وقت ہر کسی کے پاس نہیں رہتی نہ یہ آسانی سے منتقل کی جاسکتی ہے۔ (صوفی سادہ رحمت سوانی سینٹ آج بھی بھوں کے مگر ہیں کمال۔)

مغرب میں ترقی اور طاقت کے دوائے کے باوجود آدمی کے اندر کی تیار یوں کا علاج نہیں ہو یا رہا نہ باہر کی تیار یوں کا۔ ہر نئے علاج اور نئی دوا کے ساتھ ایک نئی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے ”ڈاڑھے“ علاج کے لئے اُدھر جاتے ہیں۔ ان کے ”چھوٹے“ ”بڑھے“ ”اُدھر آتے ہیں۔ اب مغرب کو اپنی دروزش کے انداز پر اُٹنے لگتے ہیں۔ وہ ہر اپنی باتوں میں نئے طریقے آزمائشی کو شش میں ہیں۔ چاند پر جانا ایک

اب نرم خور و صما ہے لہر کی یہ عادت اس کے لہو میں چھپی ہوئی چمکن ہے راجہ کو بھی نظر نہ آتی ہو سیمو جو تھا نظر آتا تھا اس نے بھارتی سیاست میں فتنہ گرد کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ سیاست کو تو جوناںوں کے میدان میں لے آیا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے غارت نہ کرتے تھے تو کھیت بھی نہ کرتے تھے راجہ اپنے تپا تپے بھائی اور اپنی میاں کی چٹا کر آگ لگائی اسے آگ لگانے کا مرتبہ تجربہ ہو گیا ہے وہ اس طرح آگ لگا جان کیا ہے کہ لوگ سمجھیں کہ پھول کھل اٹھے ہیں راکھ ہو تو ہو گئی ہے اور یہ کام عبادت سے بھی بڑا ہے۔ عبادت کو تو سیاست چھین گیا کیا ہے۔ بادشاہتیں اپنے بھائیوں اور دوسرے عزیزوں کے خون میں حیرتے تخت پر واقع ہو سکتی ہیں تو جمہوری بادشاہت کے قیام کیلئے کچھ نہ کچھ تو ہو گھٹیں لے اس کا مافی کو تسلیم نہ کیا میرے تسلیم کرنے سے بھی کیا ہو جائیگا۔ ہر حال سیمو کی موت حادثے سے کچھ بڑا واقعہ تھا۔ امیکا چارہا ہے کہ اندر کو بھی مروا دیا گیا ہے ورنہ حکومت نہرو خاندان میں کیسے رہتی۔ روی بھی جانتے تھے کہ جو کچھ مردہ اندر کرے گی زندہ اندر آکر کسے گی تو خود اپنے لوگوں میں اور زندہ ہو گئی۔

بھل جی اتنا قائل نہ تھا برہمچاری جی کا۔ میرے خیال میں یہ لوگ اس کے علاوہ بھی ہوتے ہیں جو ہوتے ہیں۔ برہمچاری بھی کچھ نہ کچھ ضرور۔ کچھ نہ کچھ اس کے پاس ہے ضرور اب تو وہ بین الاقوامی شہرت کا کردار ہے ہم یہاں ملتے ہوئے اس کی طرف گئے۔ ایک کھلی کھلی عمارت ہے کسی بڑے سکول کی طرح یہاں یوگا وار دوسرے کر تپ سکھاتے جاتے ہیں جسم کو اس جام بنانے کے طریقے بتاتے جاتے ہیں۔ یوگا بھارت کی خاص شے ہے یہ ایک فلسفہ ورزش کا مفید ہے اس میں صحتانور قائم کرنا ضروری ہوتا ہے اس طرح روح کو بھی توانائی ملتی ہے۔ جسم و جان ایک نقطے پر مقام پاتے ہیں جس طرح صوفیوں کے مراۓ کے ذریعے روح کو راحت و بحری طاقت ملتی ہے۔ روح و بدن ایک مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ یوگائی وہ ہیں جو بھارت والے دنیا والوں کو دے سکتے ہیں مگر بھارت میں اردو کے شاعر اعظم انجمنی نراق گورکھ پوری نے ہنس مرگ پر ”اما کانت ساو“ کو جوا لٹو پور یا بلکہ وصیت دی اس کے ساتھ اختلاف یا اتفاق کیسے کیا جائے۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ بھارت و دنیا کی تہذیب اور سنسار کے تھن کو کچھ گراں قدر تحفہ دے سکتے۔ دنیا کی بدترین زبان ہندی ہے اور غلیظ ترین رسم الخط نیگاری ہے آج سائنس کا عہد ہے کیمسٹری فزکس یا ایٹمی ذوالوجی وغیرہ کو تذبذب کیادے سکتا ہے۔ محض ہندو ازم کے زور پر کچھ نہ ہو گا ہندو ازم اس وقت کو تاناو گا جب اسلام اور انگریزیت کی تہذیبی ترقی سے فائدہ اٹھائے۔“

فراق صاحب بھی اسلام کو صرف مذہب نہیں سمجھتے تھے اور یہ کہ بھارت میں ہندو اسلامی تہذیبی اشتراک سے کوئی بڑائی یا پھلائی چھوٹے کی گمر یہ کب ہو گا ہندو سیاست ایسا ہونے لگی۔ فراق صاحب نے یہ بھی کہا ”میں خوشنیک مشعل ڈھوڑھڑا ہوں جو تم لوگوں کے ساتھ ہیں میں دے سکوں“ یہ مشعل بھی ایک تحفہ ہو سکتی ہے۔ مگر یہ تحفہ پہلے ہندوؤں اور بھارتیوں کو تو پہلے کھینچ کر گاندھی جی کے اہنک کی طرح دنیا والوں کیلئے ایک بھی ہو سکتی کی طرح نہ ہو جائے۔

خلافت کرنے آئی ہوئی تھیں۔ ہندو عورت میں بے آباد و حرقی جیسی بہت نشانیاں بسی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے ازل و ابدی دھن سے خالی ہو رہی ہے۔ عورت کو ہندی میں استری کہتے ہیں۔ منہ کھتا تھا کہ جب تک استری کو ابھی طرح گرم نہ کر لیا جائے۔ وہ ٹھیک طرح سے حر میں بھاتی۔ انڈین فلم انڈسٹری کو جو دوچار دئے میرا آتے ہیں وہ شاید اسی ترکیب پر عمل کرنے کی بدولت ہیں۔ کروڑوں کے ملک میں کوئی نہ کوئی خطا پڑا رہتا ہے۔ حسن زن نہیں ہے جس نکلن تو بالکل نہیں۔ جبکہ وہاں افراط زور اور افراط زن کی شرح ایک جیسی ہے۔ بھارتی عورت کبھی جیسی ہے۔ دنیا بھر کی عورتوں کی طرح ہر کام کرنے کی اہل ہر صورت حال میں گزر کرنے کی صلاحیت سے لبریز ہے۔ بھارت میں دو بارہ مادر سری نکلام لانے کے مطالبے بڑھ رہے ہیں، پارلیمنٹ کے کچھ ممبران اس طرح کا بل پیش کرنے والے ہیں۔

برہمنچاری مادر سری نکلام کے حامی ہیں اندر اس کے خلاف تھی۔

واقعہ ہر برسوں تک دریا میں ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا کوئی کہات میں ہے۔ اس طرح اس نے کچھ پایا ہوگا۔ چاند پر جو کچھ ہے سب کو معلوم ہو رہا ہے۔ دریا میں کھڑے آدمی کے لوہیں عورت اتاری وہ کوئی اور نہ دیکھ سکا۔ فرق ہے ان تجربوں میں 'میرا خیال ہے اتفرق نہیں۔ یہ راز جب سب پر منکشف ہو گا تو اس بات کا بھی پتہ چل جائے گا آدمی کو۔ صوفی سوامی مادھو ست سیت اور سائنس دان میں بہت کچھ ایک ہی شے ہے۔ سوامی کے معنی خادم کے ہیں۔ تو کیا سائنس دان کو خادم ہیں۔ یا صوفی کم ہیں۔

یوگ کے مقابلے میں جاپان یوں ہے جو دے کر اپنے اختیار کیا۔ آدمی بہت بڑی طاقت ہے۔ انٹرکمراس نے بنائے وہ خود اس سے زیادہ طاقتور اور مسلک ہے۔ وہ آسمانوں کی رفعتوں میں پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آسمان اس کے اندر بھی جیسی ہے۔ بولے کہ اس نے اپنے اندر کی مشکلات سے بچنے کیلئے بڑی طرف زیادہ زور لگایا۔ اب وہ بکھر رہا ہے۔ مارا مارا پھیر رہا ہے۔ مغرب کو صوفیوں کی ضرورت ہے اور مشرق کو سائنس۔ تو یہ۔ اپنے اپنے دائرے میں یہ ہیں ایک ہی چیز۔ غور و فکر کا شامک اور ار کا حاصل چیز ہے۔ اپنے اندر ہو یا بیہر۔ صوفی نے اس وصف کو اپنے لئے خاص رکھا۔ سائنس دان نے عام کر دیا۔

برہمنچاری جی کی فتوحات کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ اس دن کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میں وہاں بکھرے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ برہمنچاری جی کی قطع کا آڑی بکھراؤ ہے۔ اس کے بعد جو جتن ہو گیا۔ جیت گیا۔ اپنے آپ سے قلت کھائے ہوئے لوگ کسی کا بھی شکرا بن سکتے ہیں۔ برہمنچاری اپنا شکرا بنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی ذات میں کچھ خزانہ رکھتا ہوگا۔ یہاں بہت لوگ اس کے خلاف تھے۔ حق میں بھی ہوں گے۔ سچا ہونے کی یہی نشانی ہے۔ گناہ ثواب تو آدمی سے ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری عادت ہے کہ ہم گناہوں پر تعجب کرنے سے باز نہیں آتے۔ گناہ ثواب کا خلف خاصا پیچیدہ ہے۔ بس آدمی کو ہر عمل نیک و بد سے کرنا چاہئے۔ بچوں کی یہ نیک و بدی ہے۔ بھارت میں بچے مر رہے ہیں۔ ان میں مرے دیا جا رہا ہے۔ لوگ اپنے آپ کو بڑا آدمی بنانے کیلئے کہتے ہیں مجھ سے مجھ نے کام کرتے ہیں۔ مگر بچوں جیسا ایک کام بھی نہیں کرتے۔ بچوں کی سادگی اور بے نیازی پیدا نہیں کر سکتے۔ حالانکہ وہاں کے سارے اچھے اور بڑے کام بچوں کی ہدایت اور حفاظت کے لئے ہیں۔ در دشمن سے ہو گئے آدمی کا ہم انتظام نہیں ہو جاتا۔ بچہ کا بوسا ہے۔ عبادت اور صوفیوں کے معمولات کے ذریعے آدمی کی روح انسانی معصوم نہیں ہوتی جتنی بچہ کی ہوتی ہے۔

عورت میں جو شرما سکی ادا ہے وہ اسے بچپن کے قریب کرتی ہے۔ بچہ جب شرما تا ہے تو زندگی ایک عجیب لطف سے سج جاتی ہے۔ عورت آج شرما نے کے خلاف ہو گئی ہے۔ وہ اصل میں اپنے خلاف ہو گئی ہے۔ اس مخالفت کے مناظر کا بوجھ مغرب کی زمین اٹھانے سے قاصر ہوتی جا رہی ہے۔ عورت اور دھرتی میں بہت ساری مشابہتیں ہیں۔ عورت اگر چاہے تو اپنے وجود میں پوری دھرتی حواش کر سکتی ہے۔ پوری زندگی حواش کر سکتی ہے۔ مگر وہ خود کچھ حواش کرنے میں مہم ہوئی جا رہی ہے جو اسے مل بھی جائے تو بھی اسے کچھ نہیں ملے گا۔ برہمنچاری جی کے سفر میں عورتیں اپنے اندر ہم شدہ دھرتی اور زندگی

جائے۔ میں بھی ایک پرانے رنگ کی روایت کا محرک کاہے۔ ہندو رتھ میں دور دور تک آگ بجھلی ہوئی ہے۔ ان کا سفر آخرت بھی آگ کے دریا میں سے گزرنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جلنے کا سحر انہیں اچھا لگتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ فطرت اور ہونا چاہئے۔

اس ظالمانہ فعل کو کچھ عورتوں نے ہمارا نام مل ہٹادیا۔ وہ چٹائی کی طرف اس طرح جاتی ہوں گی جیسے جائے والے تختہ دار کی طرف جاتے ہیں۔ ظالموں نے اور ظلم یہ کیا کہ زندگی کو چٹا بنا رہے دیار پر یہ رسم ختم کر دی۔ آج کے بھارت میں بھی یہ وہ ہونے کے بعد کی لڑکیاں ختم کرتی ہیں اور کئی ایسے آپ کو جانا بھی واقف ہیں۔ عورت پر رحم کرنا یہی ہے جو ان بد لیا کر سماج کو آتش فشاں بننے سے کون روکے گا۔ عورت اگر اپنے اندر کے سوز کو سوز و ساز کو پالے تو وہ اپنی ہم گیر محبت سے ایک ایسا معاشرہ ترتیب دے سکتی ہے جسے قدیم یا جدید میں کہا جاسکے گا۔ یہ معاشرہ بھی کبھی۔ کبھی ہوگا۔ جہاں انسان (مرد + عورت) اچھی طرح رہ سکیں۔ سچی طرح رہ سکیں۔ ایک ایسا معاشرہ آج صبح کے وقت انڈیا گریٹ میں تھا۔

تینوں فصول کی یہاں نمائندگی بہر وقت رہتی ہے۔ پہل جی نے بتایا کہ یہاں دیوار کی تینوں فصول کے ان لوگوں کے نام ہیں جو دار و مل کے لئے جان کی بازی لگاتے ہیں۔ وہ لوگ ہیں۔ جو بڑی ٹکوں کے ساتھ جنگوں میں کام آئے مگر ان کے لئے میرے لوہے و خشن کا کوئی ذائقہ نہ چاہا۔ یہ لوگ عظیم ہیں۔ زندہ ہیں۔ انہیں کیا فرحی کہ وہ اپنے وطن کے لئے لڑ رہے ہیں یا ایک سیاست دان کے لئے۔ ان کی بے خبری نے انہیں امر کر دیا ہے۔ جسے سرنے کا شوق ہو، جس طرح سرنے شہید ہوتا ہے۔ اس کے لئے میدان جنگ کے علاوہ بھی کئی میدان ہیں۔ ان شہیدوں کا صلہ یہ ہے کہ یہاں کھڑے ہوئے دل میں گھر گھر رکھ لیا ہے۔ میں بھرتی ہوئی مشعل کے پاس گیا۔ اب یہ روشنی کچھ دور و درشتی بن گئی تھی۔ میں شعلے کا رقص دیکھ رہا۔ میں نے سر ہری نہ ہونے کے باوجود اس آگ پر اپنے ہاتھ سینکے۔ پھر میں نے دیواروں پر لگنے والوں پر ہاتھ جمیرے۔ میرے ہاتھوں نے ایک جیسی اکاسٹھ محسوس کی۔ میں نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے پر ملے اور اپنے منہ پر چھیر لے۔ میرے اس عمل کا کوئی تاثر نہ تھا۔ بل جی نے مجھ سے پوچھا کہ یہاں کس کیلئے دعا کر رہے ہو۔ کسی مسلمان سپاہی کیلئے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ہندی رسم لکھ میں لکھے مسلم اور ہندو نام میں فرق نہیں کر سکتا۔ اس طرح میں ایک میدان میں سرنے والے مسلمان اور ہندو میں امتیاز نہیں کرنا چاہتا۔ راوہ میں سرنے والے ہم مرتبہ ہوتے ہیں۔ اور حق آپ کے اندر ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ صرف اپنے دل کی گواہی سے ممکن ہے۔ اور ہم کسی کے دلی جذبات پر اپنا فیصلہ لگانے کے مجاز ہرگز نہیں۔ سرنے والے کو اس سے غرض نہیں ہوتی۔ کہ اس کے کسوے کو کس طرح کی آرزو پوری کرنا ہے۔ اختلاف ہو بھی تو اس خواب میں سے ہو سکتا ہے۔ جتنے ہوئے اچھے لوے میں ہو سکتا۔ بھارت کی طرف سے لڑنے والا مسلمان میرا بھی دشمن ہے جتنا ہندو۔ مگر میری دشمنی اس کے جذبہ

ولینڈینڈین سوٹ لینڈ

پہلے لوگ دروازوں سے گزرا کرتے تھے اب انہیں دیکھتے جاتے ہیں۔ دروازے لوگوں کے ایک دوسرے سے خوف کا اعلان ہیں۔ دروازے نہیں ہوا کرتے تھے ایک زمانے میں۔ اب بھی میں ہوتے جہاں لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ کچھ دروازے حفاظت کے علاوہ قربت اور شہان و شوکت کی علامت ہوتے ہیں۔ دروازے گزرنے کا راستہ ہوتے ہیں۔ رستہ سب کے لئے ہوتا ہے۔ یہ کچھ دروازوں پر کیوں لکھا ہوتا ہے۔ بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔ ایسے دروازے فخر دینے چاہئیں۔ کچھ چروں پر ایسے ہی دروازے لگے ہوتے ہیں جنہیں بغیر اجازت کھول کے بڑا حرا آتا ہے۔ خواہ اس کے بعد جتنا بھی بے حرا ہو جائے۔

انڈیا کی اچھی فرائض کشاں کشاں ہے۔ ایک متوازن اور دلچسپ اور تپانی اور چڑائی سے بھرا ہوا رستہ دور سے نظر آئے والا۔ اس دروازے سے داخل ہونا اور باہر نکلنا کوئی مشکل نہیں۔ آدمی وہاں کا وہاں ہوتا ہے۔ نہ کوئی چار دیواری نہ احاطہ۔ ذرا بہت کر دروازے میں سے دیکھیں تو ظہر صبر نظر بننے لگتی ہے۔ بے شمار سڑکوں کا دائرہ اس کے گرد گرد رہتا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ رستے یہاں سے لگتے ہوں یا یہاں پہنچتے ہوں۔ بس حصار سامنے ہونے چلے جاتے ہیں۔ یہاں اس وقت ہمارے قدموں کی آہٹ و خشک کا کام دے رہی تھی۔ صبح کا دروازہ پھر اکل پکا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر دستک کا حرا ہی کچھ اور ہے۔ دور دور تک آدمی نہ تھا۔ افسانے انکھانے میں حسن رنگ کی طرح آوارہ ہوئی چار دیواری تھی۔ ہم سڑکیں بدل بدل کر غریبی چلتے چلتے دور نکل کر واپس آتے رہے۔ پھولوں اور پھولوں کے پاس بیٹھ بیٹھ کر اٹھتے رہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ ایک خوبصورت لینڈ سکیپ ہے۔ ایک اچھی تفریح گاہ ہے۔ یہ شاہد و سعادت کہیں کہیں جتنا پاکستان کی بحری بحری کشتادگیوں کے قریب رہتی ہے۔ یہاں پھول زیادہ ہوتے۔ رستے بھی زیادہ تھا۔ اور اور پھول ہوتے ہوئے۔ مینار پاکستان کے نئے منظر نامے میں خواب اپنی تعمیر و زحمت بنا پھر آتا ہے۔ انڈیا کی رستہ و مستحق میں تعمیر میں اپنے خواب پہنچاتی پھر رہتی ہیں۔ گیٹ کے کچھ کھڑے ہوئے تو رستہ سے دائروں میں مونہ کار ہیں آتی جاتی یا جاتی آتی نگاہ کو ابھی لگیں۔ ایک ایک کاروبار دیر تک نظر آتی رہتی۔ سسٹروں کے درمیان پھولوں کی سڑکیں تھیں۔ اس حکم کھلا عمارت کے وسط میں یعنی دروازے کے درمیان میں ایک جوتی (مشعل) بہر وقت چلتی رہتی ہے۔ اسے بجھنے نہیں دیا جاتا۔ آگ کے شعلے سے پھوٹنے والی روشنی کا رویہ ہی نہالا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جوتی بجھنے کو ترس گئی ہے۔ یہ بجھ کر جلے تو کچھ اور چلے۔ یہاں سمجھا جاتا ہے کہ یہ جوتی بجھ گئی تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ اس ہنسیا ہو

یہ مری سرزمین
چرسکوں شہر میں ایک سویا ہوا شہر ہے تاب ہے
خطہ خاک پر دور تک لٹھیا ہوا خطہ خواب ہے
یہ مری سرزمین خطہ خواب ہے

یہ مری سرزمین
منزلوں پر پہنچ کر سڑکے تجیر کا آغاز ہے
ایک آئندہ غیب کے راستے میں کوئی خطہ راز ہے
یہ مری سرزمین خطہ راز ہے

شاہد کی نفی نہیں کر سکتی۔ عام لوگ ایک دوسرے سے نہیں لڑنا چاہتے ایک دوسرے سے انجمن آدمی
ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوتے دوست ہو سکتے ہیں۔ دوستی ایک فطری وصف ہے۔ دشمنی کے لئے کچھ
نہ کچھ وجوہات ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک کشمیر و پنجاب فلسطین افریقہ افغانستان لبنان آسام عراق ایران
کسب بھی حق کیلئے لڑنے والوں کا خون جہاں بھی گرتا ہے وہ زمین وہ خاک بھی محترم اور محبوب ہو جاتی
ہے۔ میں سب مرنے والوں مرکز زندہ رہنے والوں شہیدوں کے لئے دعا کا نذرانہ پیش کرتا ہوں۔
میرے عقیدے کے مطابق کسی ایک شہید کے لئے کسی ایک مرنے والے کے لئے دعا سب کیلئے ہوتی
ہے۔ ایسے لوگ اگرچہ میرے جیسے ہی دعا بردار سے بالاتر ہیں۔ البتہ ہمارے جیوں اور پاکستان میں ذرا سا فرق
ہے۔ وہ زمین کے لئے لڑتے ہیں ہم سرزمین کے لئے لڑتے ہیں۔ یہی مسئلہ نے اصفانی انداز میں پوچھا۔
زمین اور سرزمین میں کچھ فرق ہے۔ میں نے کہا مکمل جی تم شاعر ہو۔ تم سے حقیقی انداز میں بات کرنے
کوئی چاہتا ہے۔ فی ایس ایلٹ کی ایک بڑی نظم کے عنوان ”دینٹ لینڈ“ کے کے بالفاظ کوئی نظم لکھی
جائے گا اس کتابم ”سوئٹ لینڈ“ ہونا چاہئے۔ اسے اردو میں سرزمین کہیں گے۔ میں یہ نظم لکھتا چاہتا
ہوں ابھی تم قائد اعظم کیلئے لکھی ہوئی میری نظم کا ایک شعر سنو۔

یہ ارض خاک ارض پاک کے رہنے پہ پہنچی

مری اجڑی زمین کو سرزمین تو نے کیا ہے

آزادی اس ساری زمین کو نصیب ہوئی۔ جو زمین ہمیں ملی سرزمین بن گئی۔ محراب ہمارے کچھ سیاستدان
اور دانشور ہم اس کا سواڑے کی خواہش میں فرق ہوئے چارے ہیں۔ بل کو ایذا کی گت کی دستخطیوں کی
چادر پہینے کر میں نے اپنی نظم ”آئندہ زمانوں کی سرزمین“ کے دو تین بند سنائے۔

یہ مری سرزمین

ایک صبح دو عالم کے منظر سے پہلے کوئی فجر ہے

ذہنگی کو محو کو ہراز کرنے میں اک خطہ اجر ہے

یہ مری سرزمین خطہ اجر ہے

یہ مری سرزمین

سرخرو اور سرسبز ریحوں میں لپٹا ہوا گلشن ”زرد“ ہے

خون میں تیرتے آسودوں کے کنارے پہ اک خطہ درد ہے

یہ مری سرزمین خطہ درد ہے

آنکھ مچولی کیسے ہندو باغ

یہاں بہت سی جگہیں ہیں جہاں آدمی اپنے آپ کو چھپا سکتا ہے۔ آنکھ مچولی کھینے کی بہت اچھی جگہ ہے۔ اس کے باوجود کئی لوگ وہ کچھ سامنے کر رہے تھے جو چھپ کے کیا جاتا تو اور خوبصورت ہوتا اور حیرت انگیز ہوتا۔ ہر بات ہر عمل کو سامنے جان پر ظاہر کرنا یا ضروری ہے۔ یہ بات خود بخود بھی پتہ چل جاتی ہے۔ یہ باتیں خود بخود ہی معلوم ہوں تو اچھی لگتی ہیں۔ اسی وجہ سے محفل شگ کی حقیقت ایک بتائی گئی ہے۔ محبت وہ راز ہے جو اعلان سے ختم ہو جاتا ہے۔ راز کا افشا ہونا اور بات سے ختم ہونا اور بات ہے۔

ایک کوئے پر بہت کھانسی بننا ہوا ہے، چوترا نما اور جانے کیلئے جو بیڑھیاں ہیں جیسے ہم اوپر نہ جا رہے ہوں نیچے جا رہے ہوں۔ ہرگز اسرار چھپ کر کشش ہوتی ہے۔ ایسی چیز پر قدیم ہونے کا گمان مگر زنا ہے۔

جیسے جیسے ہم اس باغ سے مانوس ہو رہے تھے۔ بہت سی کیفیتیں ”جیسے“ کی زد میں آ رہی تھیں۔ ایک تعجب سامنے آتا ہوا رہتا تھا۔ بیچ پر کششیں بھی تھیں۔ چاہنے والے کے بعد ہم اور حادہ رکھنے کوئے تو بیچ کے اوپر بھی کچھ تھا۔ اس پار کچھ اور جگہ تھا۔ جگہ کے پار ایک جگہ۔ نہالے یہ جگہ تھا یا جگہ بنانا ہوا تھا۔ بعض اوقات مصنوعی چیزیں بھی کتنی فطری لگتی ہیں۔ اور فطری چیزوں پر کسی کی بنائی ہوئی کا گمان ہوتا ہے، یقین ہوتا ہے۔

یہ وسیع و عریض باغ پورے کا پورا ایک ہندو باغ ہے۔ جیسے لاہور کا شالامار باغ ایک مسلمان باغ ہے۔ اور یہ میں کسی تعصب سے نہیں کر رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا ہے۔ سارے ہندوؤں نے آج بڑے اصرار کے ساتھ یہاں موجود ہیں۔ ہندوؤں نے جو کچھ بنایا ہے اس میں ہندوؤں کو رکھا تو کھائیں نہ کھیں رکھا ہوا تھا ہے۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی چیزیں یہاں اجاڑی جا رہی ہیں یا بگاڑی جا رہی ہیں۔ مگر وہ اپنے شان و شکوہ کی شہادت ضرور پیش کرتی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو اپنے شہید ہونے کی داستان ضرور بیان کرتی ہیں۔ اس باغ کی رکھوالی کرنے والے دور و نزدیک کام میں مصروف تھے۔ جبکہ کئی مسلم عمارت بالخصوص کئی مساجد کی رکھوالی کیلئے حکومت نے پولیس کو مقرر کر رکھا ہے۔ جو کسی کو خاص طور سے مسلمانوں کو مزید خاص طور سے بھارتی مسلمانوں کو ان کے قریب ہی نہیں چھٹکنے دیتی۔ وہ کوشش کریں تو سخت کارروائی کر کے انہیں ترپنے کیلئے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آخر آزادی اور جمہوریت بھی کوئی چیز ہے اور ہر کسی کے اپنے اپنے حقوق ہیں جو اسے بہر حال ملنے چاہیے۔ خیریت ہے تو پتا چلتی ہی ہوگا۔

میر محبوب ہیں کرمیے ملاکر

بھارتی حکومت صرف اسی ایک عمارت سے لاکھوں روپے کھاتی ہے۔ یہ عمارت برصغیر کی پوری دھرتی کے نو پر تاج کی طرح بھی ہوئی ہے۔ بھارتی حکمرانوں کو یہ تاج پسند نہیں کہ مسلمانوں کے دور حکومت کی یاد دلاتا ہے۔ اسے نہ صرف موسموں کے چکر میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی حفاظت و مرمت کا بھی ہندو مت نہیں۔ یہاں کئی کارخانے لگا دیئے گئے ہیں جن کا دھواں اس عمارت کی طرف اس طرح پھٹتا ہے جیسے گا لاکھ کسی مسافر کی طرف۔

ہم نے کئی بار تاج محل جانے کا پروگرام بنایا۔ مگر ”طلی وادلی“ مصروفیات نے اجازت ہی نہ دی۔ عطا بھارت کے پہلے سفر میں تاج محل نہ جاتا تھا۔ میں اور وہ بھی ارادے باندھ رہا تو زاربا بلکہ باندھ کے پھوڑتا رہا۔ جس طرح آدمی غباروں میں بھونچا رہ کر چھوڑتا ہے۔ اور وہ تھوڑی دیر میں غباروں سے اوٹ چل ہو جاتے ہیں۔ خواہ کتنے ہی رنگین کیوں نہ ہوں۔

تاج محل کے بارے میں اتنا لکھا گیا ہے۔ ایسے ایسے انداز میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اتنی جزئیات اتنی تفصیلات کے ساتھ اس کا منظر نامہ بنایا گیا ہے۔ اس کی تصویریں آناری چینل میں کر دیکھے بغیر اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ سنا ہے اس کو دیکھ لیا جائے تو بار بار دیکھنے کوئی زور کرتا ہے۔ پھر وہ سنے لگا چکا کہ اسے دیکھنے نہ پاسکے۔ زور نہ جواب دیا کہ میں جا رہا تھا۔ بھارت میں لوگ اس عمارت کے ماڈل بنانا کے تصویریں بنانا کے بیچے ہیں اور امیر کیہ رین گئے ہیں۔ بھارت میں فلی میٹروں کی اتنی تصویریں نہ بھی ہوئی ہیں۔ محبوب کے مرقد پر بنے ہوئے اس مقبرے کی بہت صفات مجھ میں جیسی ہیں۔ نہ دیکھیں تو نہ دیکھیں۔ دیکھ لیں پھر بار بار دیکھ لیں بغیر کسی تفریق نہ رہے۔ میں اپنی کتنی جاننے والی لوگوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ تاج محل کی طرح ہیں۔ دیکھنے میں دلہانی کی آخری حد پر۔ مگر اس سے ایک قبر۔ جس پر بروقت تازہ قبر کا گمان لگے۔ میں نے ان میں سے کچھ کے ساتھ دفن بھی ہونا چاہا۔ اس طرح ہم

دونوں زندہ ہو جاتے مگر..... اس مگر کے بعد میں کچھ نہ کہوں گا کہ پھر ایک اور ”مگر“ کا سامنا ہوگا۔ اور یہ ”مگر“ مگر مجھے سے کم نہیں۔ اب جبکہ میں تاج محل دیکھے بغیر آیا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ تاج محل دیکھنے کیلئے بار بار آکر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک میں دل میں کئی زندہ قبروں پر میرے خیالوں نے تاج محل خیر ہوتے دیکھا ہے۔ تاج محل بھی تو انجینئر یا شاہ جہاں اور عظیم معماروں کے خیال کی تجسیم ہے۔ مزدوروں نے بھی بقیہ بنائے شوق سے کام کیا ہوگا۔ یہ فن اور محنت مجسم ہے۔ اس کے نظارے سے بھی دیر تفریق ملتا ہے جو کسی خوبصورت رسم کو دیکھ کر ملتا ہے۔ ہم جس میں دیر بھی ہو۔ جس طرح تاج

عمل کے سینے میں ایک عجیب قبر ہے۔ قبر میں دو جن دور اصل ایک ہی قبر ہے۔ یہ قبر تاج محل کی رون ہے۔ صاحبِ قبر کی لافانی اور لافانی محبت اس زندہ شاہیہ عمارت کا سبب بنی۔ یہ محبت جس طرح لافانی ہوتی ہے لافانی بھی ہوتی ہے۔ اس کی کیفیات اور اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ جس طرح آدمی دوسروں جیسا ہو سکتا ہے ان سے بیکر مختلف ہے۔ یہ شاہجہاں کی محبت کا کرشمہ بھی ہے۔ صرف یہ نہیں کہ اسے عمارتیں بنانے کی دھن ملتی ہوئی تھی، بلکہ حیات کی موت زندگی کی غلامی میں آئے ہوئے لوگوں کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دوسری سیر کی چوٹی شاہی بلکہ شاہیوں کے محل سراؤں میں رانیں کی کمی نہ ہوتی تھی۔ جوانی اور عیاشیوں سے بدتر زندگی بسر کرتی تھیں۔ حکمرانوں کے لئے خوبصورت عورتوں کی کمی نہ تھی۔ پھر کوئی ایک چہرہ یا شاہی زندگی پر کیسے محیط ہو گیا۔ محبت جو کچھ بھی ہے۔ بہت طاقتور ہے۔ بہت عمارتوں کے ایک انتہائی شاعر تاج محل کو محبت کرنے والوں سے مذاق قرار دیتے ہیں۔ محاسن الا زوال محبت کا خیال نہیں کرتے جس کی مثال کم از کم یہ ہے۔ کیا محبت اور وفا کوئی غیر انتہائی اور ہے۔

تاج محل کو دیکھنے کے بعد لوگ اور فنکار اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی تہیں میں سمجھ نہیں سکتے۔ تاج محل کو دیکھنے سے وہ جذبات سے جو عجیب کے لئے سے ملتا ہے۔ بڑی شاعری پڑھ کر ملتا ہے۔ تاج محل فن کی عمارت ہے کی مکمل شکل ہے۔ اس کے ہرے مشاہدے کے لئے آدمی کے اندر محبت کوئی نہ کوئی کیفیت زندہ ہوتی چاہے۔ کوئی قبر ہواس کے اندر کم از کم۔

ساحرِ حیات نے جو نظم کلمی سے ترقی پسند لفظوں نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ اس نظم کی آڑ میں وہ کسی اور تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ تاج محل کو تفسیر اپنی جگہ ہے جہاں دنیا بھر کے محبت کرنے والے اکٹھے ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہاں سے ایک غریب کیا اور تماخو پر ایک درخت کی چھان بھی ساحری اس نظم سے کہیں بڑی گلی ہے، جہاں محبت کرنے والے آدمی زندگی میں ایک بار ملے ہوں۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک تاج محل اور یہ مقام مرتبہ ہیں۔ محبت جیت کرنے والے لوگ زیادہ ساحری۔ تاج محل کی ہر سائیل لوگوں کو ہمارا ہونے میں مدد دیتی ہے۔ اس کو تھیں اور کئی نظمیں تاج محل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ وہ صرف نمونہِ قیصر نہیں سرمایہ۔ تاریخ بھی ہے۔ اسے کر دیا جائے تو زمانہ اسے بھلا نہیں سکے گا۔ قوموں سے عظمت چھینی جاسکتی ہے۔ تاریخی عظمت میں چھینی جاسکتی۔ قومیں اپنے تہذیبی رنگ میں حمار ہوتی ہیں۔ طرزِ زیست کے لئے طرزِ تعمیر کا مطالعہ ضروری ہے۔ گھنڈہ رو کیے کر بھی عمارت کے کمال کا پتہ چل جاتا ہے۔ خوبصورت آدمی کا پتہ چاہا پاس کی جوانی کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ عمارت ہوا آئینہ سی۔ عظمت زیادہ تر ماضی کا سبق ہے۔ ماضی لپکا کر کات کر مستقبل میں بھی نمودار ہو کر آتا ہے۔ تاریخ کو دہرانے والی ضربِ انصاف میں سے نہیں بھائی۔ تاج محل کے جلال، جمال کے کہیں منظر میں محبت کی چائیریں بلکہ "شاہجہانیت" جلیلہ قرار ہے۔ سرخ و سفید سامراج کی پتہ میں بادشاہوں سے بڑھ کر جوہری امریکا اپنے لئے غریبوں کی ہڈیوں پر بٹائے رکھتے ہیں۔ اور وہ جن جدید میاشینوں سے بنی ہوئی بلڈنگوں

میں رہتے ہیں کیا یہ زمین پر ہونے والوں سے دوستانہ تکلفی کا اظہار ہے۔ ساحر نے جن کے سیاسی مفادات کی خاطر اپنی شاعری کو قربان کیا۔ جو پرانے حکمرانوں پر کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرنے کے حوالے سے تختہ پر کرتے ہیں وہ خود انسانوں کی لاشوں کے لئے کے پانچ اپنا رنگے میں سبت لے جانے کی سرور کو شش کر رہے ہیں۔ یہ بادشاہوں سے بدتر ہیں مگر بد سے بدنام برا۔ اس ضمن میں عوامی جمہوریت اور بادشاہت کا موازنہ کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ تاج محل کی تعمیر کیا انعام، میرپنٹے والے کارخانے سے بھی خراب ہے۔ ان لوگوں کو یہ بھی حیرانی ہے بلکہ پریشانی ہے کہ یہ عمارت امریکا یا روسی امداد کے بغیر بن کیسے تھی۔ ان دونوں ملکوں نے اتنا کچھ لپکا کر لیا ہے کہ زیادہ روغن و فدا تیار ہو سکتی ہے۔ جو کچھ اس تیار کن اسٹیل پر خرچ ہو رہا ہے۔ وہ براہِ برابر تقسیم کر دیا جائے تو دنیا کے ہر آدمی کو ایک ایک لاکھ روپیہ مل جائے۔ جس جذبہ کی زویش اگر ساحر نے یہ نظم کلمی شاد جہاں نے اس جذبہ کو اپنی زبان میں لے کر تاج محل بنوایا۔ تاج محل پر ہی دنیا کے محبت کرنے والوں سے جملہام ہوتا ہے۔ تاج محل کو اپنی نگاہوں سے پڑھ کر غلطی پر قزم برٹسل پر جگہ بڑھ سب ہر زبان کے لوگ یکساں لذت پاتے ہیں۔ اسے دیکھنے کیلئے کسی ترقی یافتہ کی ضرورت نہیں۔ ساحری نظم کتبوں نے پڑھی ہوئی۔ یہ نظم کلمی نہ گئی ہوئی تو اتنی اہمیت بھی نہ پاتی۔ سب لوگ تاج محل میں جاتے۔ یہ نظم اردو زبان کی بھی تو تین ہے کہ اردو زبان بھی مکمل تہذیب کا علیہ اور ہندو مسلم مشترک تہذیبی صورت حال کا عقد ہے۔

ساحر نے اپنی نظم میں اپنے عجیب سے خطاب ہونے کی کشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے جو کوئی بھی وہ جی اور ہے۔ وہ ساحر کا مشہور قول میں کرے گی۔

میرے عجیب کہیں اور ملا کر مجھ کو

یعنی وہ دونوں پہلے کئی بار میاں مل چکے ہیں۔ میرے اور میری عجب ہے کے لئے ممکن ہو تو تاج محل جا کر ملا کریں۔ بھارت میں میری کئی عجب ہوئی تو ہم تاج محل کو ملنا ضرورت طاعت کریں گے۔ لاہور میں محبت کرنے والوں کو غریبوں کو مقبرہ جہانگیر اور جہاں کے حوزہ پر پناہ ملتی ہے۔ یا وہ آج خلق کے دربار میں حاضر ہو کر انصاف دے رہا ہوتے ہیں۔

مشہور پنجابی شاعر امرتیا پتہ نے ساحر سے ٹوٹ کر محبت کی۔ جس کی تفصیل اس کی آٹھیا گرافی "ریوی کٹ" میں ملتی ہے۔ فرخستہ سنگھ نے یہ کلمی اشاعت سے پہلے سر کرنا "میرا یہ زندگی ہے۔ یہ تو میری کٹ پر کلمی جاسکتی ہے۔" امرتا نے ریوی کٹ لکھ کر یہ چٹک بھی وصول کر لیا ہے۔ کیونکہ ساحر کے ساتھ تاج محل نہ گئی ہوگی۔ امرود کے ساتھ بھی نہ گئی ہوگی۔ وہ دل پر پاتھ رکھ کر تیار ہے کہ اسے اس سے زیادہ سامنے سرخوشی نہیں اور ملے۔ امرتا خوشی اور سرخوشی کا فانی یقینا جانتی ہوگی۔ پہلے ہمیں بتا دیتے ہیں۔ تقریباً بیسیویں ہزار اور سترہویں ہوتا ہے۔ ساحر سے محبت میں امرتا کا کاردار فانی دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح تاج محل اپنے دیکھنے والوں پر طاری ہو جاتا ہے۔ امرتا بھی ہے کہ ساحر تیار تھا۔ یعنی

اردو دوست بن کر ایک منافی فضاغیر کر رہے ہیں تو آئندہ بھی کسی بڑے شاعر کے ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ بھارت میں اردو کو زندہ رکھنے میں ہندوؤں سے زیادہ غلوں کا حصہ ہے۔ ذرا سی مجلس ہندی پولی جاسے تو وہ اردو کے قریب ملک عترت پر بھی جاتی ہے۔ اب ہندوؤں کے اردو غلوں کو ہندی فلمیں کما شروء کر دیئے۔ دلپ کمار کی اداکاری اور لڑکی گاگن اس حوالے سے کمال کی چیز ہیں۔ ان دونوں کے فن میں اردو کی مقبولیت کے سارے راز کشف ہو کر پھر راز بن گئے ہیں۔ مشکل ہندی بلکہ ہندوانہ ہندی سن کر ضرورے کما تھا کہ "یہ زبان نہیں تو ہم اپنے گھروں میں بولتے ہیں" ہندو اسے وہ زبان بنانا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کے گھروں میں نہ بولی جائے۔

تاج محل کے انوار و اسرار کے سامنے ایک لکھنے کی بے اختیار محبت و سادگی کو ہر کی شاعری سے بڑی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت ہی زانی ہے۔ محبوب کے سامنے عام آدمی بھی شاعر ہوتا ہے۔ تاج محل کے ایک ساتھ دور دور ہو کر شاعر اور محبوب ایک ہوتے ہیں۔ یہی کنج کی جاسکتی ہے۔ ہندو لغت میں یہ لفظ بھی قابل اعتراض ہو گا کہ یہ بھی ایک مغل تحران کا لقب ہے۔ مغلوں نے اپنے القاب کی لاج رکھی۔ آج کے اکثر حکمران کسی ایسے لقب کے اہل ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغلوں کا لقب بھی لکھن کا معنی نہ ہو تو معانی میں بننے شاعری میں۔ میر غالب اقبال فیض اور ندیم صرف تجلّس ہی میں ہیں۔

یہ فقط میرا تجلّس ہی نہیں ہے کہ ندیم میرے کردار کا کردار ہے اور نام کا نام

تاج محل کہنے کے اردوؤں کی طرح امرتا پر ہم سے ہماری لٹنے کی خواہش بھی خوابوں میں کھ گئی۔ مجھے خشونت تنگدلی اس بات سے اتفاق ہے کہ وہ بھائی کا دیب ہونے کے لئے امرتا پر عاشق ہو ضروری ہے۔ عطیہ فیض اپنے دور کی امرتا تھی۔ یا امرتا اپنے دور کی عطیہ فیض ہے میں ایک ایسی عورت کو جانتا ہوں جس میں وہ دونوں ہیں۔ محراب کا نام نہیں بتاؤں گا۔ "ان اکھلا وارث شاد نوں کہیں قرآن و حق بول" مجھے نظم کہنے والی سے میں پوچھتا جانتا ہوں کہ اس کے پیچا پ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایسی ہی ایک اور نظم کا متقاضی نہیں۔ اس کی زمین پر زمانہ لاوارث ہو رہا ہے اور اس کے کہاں کسی نظم کی تحقیق کی تیار نہیں ہو رہی۔ وہ اپنی دنیا کی قبر سے کب آواز دے گی۔ ایسا نہ ہو پھر اس کی آواز سننے والا کوئی نہ ہو۔

ایک بڑے شاعر ایذا یا پائندہ نے کہا ہے کہ "بڑا ناست اسانس کے اعتبار سے تاج محل کو کچھ کر تعین آجاتا ہے۔ کہ یہ عمارت ایک ایسی قوم نے بنائی ہے جو سو نہ نہیں گئی"۔ اب عبد حاضر میں قیہ ہونے والی عمارتیں دیکھیں تو ایذا یا پائندہ کی بات دوسری طرح بچ معلوم ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی حیرات پر خطاطی کے نکات دیکھ کر لگتا ہے کہ مسلمانوں نے عمارتوں پر کتابیں لکھ دی ہیں۔ تاج محل ایک خوبصورت الماب ہے۔

عورت امرتا جیسی عورت ایک نامزد سے اس طرح ٹوٹ کر چار کر سکتی ہے۔ عورت بہت انوکھی مخلوق ہے۔ اور چار عجیب چیز ہے۔ امرتا کے حسن و عشق کے گداز اور لڑکی آواز کے سوز و سائے سحر کو سارے دنیا میں شاعر بنایا۔ مگر خود وہ ایک فلمی شاعر بن کر رہ گیا۔ اس کی شاعری میں ایک صحتی صحتی روحی روحی کیفیت ہے۔ یہ وہ ہے کہ وہ ایک بڑا شاعر بن سکتا مگر وہ شاید بڑا شاعر بننا چاہتا۔ بھارت میں اردو کا شاعر بڑا شاعر نہیں بننا چاہتا۔ فراق کی شاعری کی وہ عین نہ تھیں تو بھارت میں اردو شاعری کے پرائیویٹ اور دم صم ہوتی۔ جس کی روشنی میں خود شاعر کا چہرہ بچپانہ جاتا۔

غزل کے حوالے سے کچھ ثقافت فراق کے بارے میں مشکوک ہیں۔ ایک بھارتی دانشور جس الرض فاروقی نے فراق سے بہت جو نیز شاعرانہ مشتاق کو فراق سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ اور یہ کوئی ایسا لفظ بھی نہیں تھا جسے ہم حسن عسکری کو فراق میں کس وصل کی خبریں ہی تھیں۔ کہ وہ قاسم کے عاشق معلوم ہوتے ہیں۔ غزل بر صغیر کے مسلمانوں کی تہذیب زندگی کی تر جمان ہے۔ یہ مسلم مشرق کا لفظ ہے "نوحہ" بھی ہے۔ ہندو شاعروں میں سے فراق کی غزل کسی حد تک مسلم حراج کو چھو کر گزرتی ہے۔ ایک مغل میں فراق کی غزل کو ہندو کا پکا یا ہوا گوشت کہا گیا۔ جو کچھ زیادہ ہو تو یہ گوشت کھانے میں بھی مزار ہے۔ وہ نہ ہندو شاعروں کی نگہیں ہوتی غزل تو صرف دال بیری کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہندی زبان میں ہوں گے بڑے شاعر۔

بھائی میں بھی ہوں گے۔ اردو شاعری کے افق پر کئی ناموں کے حصر میں سارے کا نام بھی غمناک ہے۔ پھر آفاق ہی سکڑ جائے تو نام کا ستارہ کیا کرے۔ سارے ہندو ہونا تو اس شاعر میں نہ ہوتا۔ یہاں مسلمان ہونا اس کے کام آیا۔ اب مسلمان ہونا وہاں اسی طرح کے کام آ رہا ہے۔ بھارت میں اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ اور پاکستان کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ اردو دلی اور لکھنؤ والوں کی زبان تھی۔ اسی نسبت سے ہم نے انما کے علاوہ دلی اور لکھنؤ کا رہنا بھی لیا تھا۔ اب ریاست دلی اور ریاست لکھنؤ تاریخ اردو کی کتابوں میں بند ہیں۔ بھارت میں یہ فکری زبان فکھر گزر جانے کے بعد گرد و غبار کی طرح کی کوئی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ یہ گرد و غبار پر سے ہندی فضا میں بکھر جا رہا ہے۔ اردو خواں ہندو بیٹے سن کئی لوگ اس زبان سے محبت رکھتے ہیں۔ مگر حکومت کی سیاسی مصلحتیں اور سانس فتنیں اس کی کم ایسی کا سبب بنتی جا رہی ہیں۔ اب وہاں یہ زبان دربار کی ایک اور روایت کو اپنا رہی ہے۔ پاکستان میں لکھی بولی جانے والی زبان اس سے مختلف ہے اور عمل بھی ہے۔ اس میں پاکستان کے سارے تہذیبی اور سارے علاقائی لہجوں کی تاثیر کھل رہی ہے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ پاکستان کی بھائی بھی بھارتی بھائی سے واضح طور پر الگ ہے۔ سراسر ایک اور ہندو کو غیرہ تو جیسے بالکل اور زبانیں ہیں۔ ایک گلزار سم لفظ کا ہے۔ زبانوں کے حراج پر رسم الخدیج اثر انداز سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایسا اردو کی ترقی کی بات بھارتی حکومت کی سیاسی ضرورت بن گئی ہے۔ سرکاری سرپرستی کے پرمیٹلے اور مظاہرے میں کسی متعصب اور سازشی لوگ

"ج۔"

وہ اور ایبارل ہو گیا تھا۔ پورا ایبارل تو وہ اب ہوا تھا۔ اس نے ان ایبارل اور مطمئن چل دیا۔ بھارت میں لوگ پاکستان سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ شراب فروشوں سے بہت تنگ ہیں۔ کہتے ہیں یہ آکے ہمارے حاکم بن بیٹھے۔ وہ ان لوگوں پر ان کیجئے دفنوں میں ان کی حکومت۔ مہاجرین کے بارے میں پاکستان میں بھی ایسی ہی رائے کہیں کہیں ہے۔ ہم بیٹھ سے مہاجرین کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ لیات علی خان نے ان کے ساتھ خاص رعایتیں کیں۔ ان کا رزغ زیادہ تر کراچی کی طرف رکھا۔ لیات علی خان میں رہتے تھے۔ یہ دارا حکومت میں رہے والے سب کے سب حاکم بنی ہوئے ہیں۔ اب بھی کراچی کا ایسا ہی حال ہے۔ چاس فیصد سے زیادہ روپیہ صرف کراچی میں گردش کر رہا ہے۔ یہاں مہاجرین اور نوٹوں کی تعداد ایک ہی نسبت سے بڑھی چلی جا رہی ہے۔ اب تو مہاجرین یعنی مہاجرستان کا مطالبہ بھی بڑے لگے۔ اس طرح مہاجر بھائیوں کو نقصان ہو گا۔ تب تو مہاجر نہیں رہیں گے۔ نہ یہ جڑے ہوں گے۔ تجاہلے کس کے نظام میں تو قریب آدھی صدی کے بعد بھی وہ مہاجر ہیں۔ مگر مہاجر کوئی قوم نہیں۔ سب سے بڑے مہاجر ہمارے رسول تھے۔ اور وہ کی کے ساتھ مٹی بھی کھاتے ہیں۔ ہمارے بھائیوں کو معلوم نہیں کہ مہاجر کون آدمی ہوتا ہے۔ میں پہلے بھی کہ چکا ہوں کہ کسی نہ کسی حوالے سے ہم مہاجر ہیں۔

تھوڑی دور جا کر وہ بزرگ شخص واپس ہوا اور مجھ سے پوچھا "واپس جاؤ گے"۔ پھر خود ہی کہا۔ ضرور جانا۔ تو میرے شرمگرات جانا۔ وہاں میرا مکان ہے۔ وہاں جانا۔ اور اب میں سوچ رہا تھا کہ کوئی درد مند فرمائش اس کا کیجیجے کہ کھلی کر اس سے پھر پوچھا۔ "کون رہتا ہے وہاں" "اچھا ابھی رہتا ہے۔ اس سے پچھلے بیٹیس برس کا کراہیہ وصول کر لینا۔ پھر میری طرف سے قہر کھ لینا۔"

میں نے اس کی طرف قہقہہ سے دیکھا۔ کوئی بات کوئی مذاق کسی طرح کا ایسا تاثر اس کے چہرے میں پھنسا ہوا نہ تھا۔ وہ بچے منہ سے بات کر رہا تھا۔ "اور اب اس میں سے کچھ کر مو کھار کیسا کو بھی دے دیں۔ اس نے کئی دنوں تک مجھے اور اسے اپنے گھر میں پھنسا دیا رکھا تھا۔" اور وہ مجھے تاکید کے بغیر چلا گیا۔ مجھے اس کے ساتھ وعدے کا بھروسہ نہ تھا۔ جو میں کبھی پورا نہ کر سکوں گا۔ وہ بڑھا ہوا زمانہ کا آدمی تھا۔ ہم جیسا دور میں رہ رہے ہیں۔

عالم کم نہیں ہوئے ان لوگوں پر بھی جو پاکستانی علاقوں سے بھارتی شہروں کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ۴۳ میں کچھ لوگ نہ پاکستان تھے نہ بھارتی۔ ظالم تھے۔ مظالم بھل جاتی تھیں۔ ہمارے ہمسایہ نوازی کی خاطر اپنے شہر کو یاد کیا تھا۔ وہ نہ یہاں کس قدر مطمئن ہے۔ اسے بھل جاتی ہے۔ ابھی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ایک گھڑی عورت ہے۔ اس گھر میں

جو گند بہل کے دل بہلاوے

وہ شاعر ادیب بھی ہے۔ مگر ادبی سیاست میں مملی دلچسپی نہ رکھنے کی یادداشت میں اس کی پرواہ نہیں۔ اسے بھی کسی کی پرواہ نہیں۔ وہ بھارتی ادیبوں کی رہنمائی کا دلچسپ ہوسٹائی کا سیکرٹری ہے۔ ادیبوں کے لئے مکان بنائے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہ معرکہ سر ہوا ہے۔ یہاں بھی رائٹرز گلڈ کی طرف سے پلاٹ دیئے گئے ہیں۔ میں نے مکان بنالیا ہے۔ ایک دوست نے مہار کھادی تو میں نے کھانپلے میں خود کو لا مکاں کا وارث سمجھا تھا۔ اب دس مہلے کے مکان کا مالک ہوں۔ اس مکان میں بھی میرا کرایہ دار رہتا ہے۔ جس کی "لداو" سے قرض اتر رہا ہے جو مختلف ٹھکانوں اور لوگوں سے میں نے لے رکھا ہے۔ جب تک قرض اترے گا ہم قبر میں اتارے جائیں گے۔ ہم شاید کرائے کے مکان میں رہنے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ جنگوں کو نہیں میں صرف کرائے کے پھرتی رہ سکتے ہیں۔ بھل ذاتی طور پر کبھی پھر ہمارا فرم کا مالک بھی ہے۔ تجاہلے اس کے پاس ان پھرتیوں کیوں کو مارنے کا انتظام بھی ہے جو وہاں کچھ ادیبوں اور نقادوں اور سیاست دانوں کے لوہیں چل رہی ہیں۔ یہ کبھی پھر ہمارا کہ لوگ معاشرے کے لئے زیادہ خطرناک ہیں۔ بھل جی اتنے مجھے رویے کا آدمی ہے کہ شک مگر نہ ہے یہ پھرتیوں کیوں کو کیسے مارتا ہو گا۔

ہم جس کمرے میں جا کے بیٹھے۔ کتابوں کے علاوہ سورتیاں بھی وہاں بیٹھی تھیں۔ تانبہ رائٹرنیپ ریکارڈر بھی پڑا تھا۔ ہم یہاں آسان آسان ہو کر بیٹھے۔ ٹھنڈا پانی پیا۔ بھل جی کی جتنی سے طاقت کی۔ دہلی چلی عورت۔ اس نے بتایا کہ وہ پاکستان میں واقع کسی علاقے کی رہنے والی ہے۔ کسی علاقے کا نام بھی اس نے لیا تھا۔ بھول گیا اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کسی جگہ موجود لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی پاکستان کے کسی نہ کسی شہر کا رہنے والا ہوتا۔ لاہور کے زیادہ ہوتے۔ مگر اس اطمینان میں کوئی خاص مگر ٹھنڈی نہ تھی۔ ایک رسمی ذکر اور آنکھوں میں ایک آوارہ چمک کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ دو چار لوگوں کے بعد بات آئی مٹی ہو جاتی۔ بہت ہی کم ایسے تھے جن کی وابستگی اور دلچسپی ان کے اندر بہت دور تک پہنچ ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے چھوڑے ہوئے شہر میں رہ رہے تھے۔

اس بوڑھے کو لوگ ایبارل کہہ رہے تھے۔ اس کی محبوبہ بھارت آتے ہوئے رہنے میں مرگئی تھی۔ وہ اسے اٹھائے اٹھائے چند رہا۔ سرحد پر اسے روک لیا گیا۔ کہ مراد آباد میں چاکلہ۔ وہ ان کے حساب میں نہیں آتا۔ بڑے کو اب تک یہ ٹھہر چکی کہ اسے جلا یا بھی گیا تھا یا نہیں۔

"اسے جلا یا گیا تھا"

سوامیوں نے بھی کیا ہو گا۔ بیل جی نے بتایا کہ رواجی قسم کی عبادت کم کرتا ہوں۔ مندر مسجد اور گردوارے میں جانا کیسی عمل چاہتا ہوں۔

وہ ہندوؤں کی استا پندھتھیوں کے خلاف ہے۔ جن سنگھ 'مہاسائی اور راشٹر سیک سنگھ کو دشمن جماعتیں سمجھتے ہیں۔ وہ فرقہ واریت اور تبار کو پسند کرنے والے مسلمانوں کے بھی خلاف ہے۔ جماعت اسلامی ہند کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کے مطابق یہ ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ جن سنگھ کا سیکرٹری جنرل سکندر بخت نام کا مسلمان ہے مسلمانوں کی تاریخ ایسے بد بختوں سے بھری پڑی ہے اس کے بعد جن سنگھیوں کو نیک بخت کہنے کوئی چاہتا ہے۔ ایسے ایسے غلط رویے اور معاطے والا مسلمان بھی ہے بھارت میں کہ ان سے بی بیزار ہوا۔ کئی ہندو ان سے ہزار درجے بھڑا انسان ہیں مجھے کسی ہندو جماعت میں مسلمانوں کے ہونے پر اعتراض نہیں۔ وہ تو مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے وقت کانگریس میں بھی تھے۔ اب بھی ہیں۔ ہوتے ہیں جمہوری حق ہے ان کا یہ۔ مگر یہ بات کس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ کسی مسلم جماعت میں بھی کوئی ہندو نہیں رہا۔ شاید کوئی ایک آدمہ۔ یہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے سچے کامیاب بھی ہے۔ یہی دلیل ہے بھارت میں مسلمانوں کے ہونے کی کہ کانگریس میں بھی تھے اور ہیں۔ ہندو انھیں پاکستان جانے کا طعنہ کیسے دے سکتے ہیں۔

ہر طرف اس کے ہونے کے اثرات نظر ہے۔ بیل جی اس کے سامنے اس طرح نگ رہا تھا جسے اس کا سب سے بڑا جہیز تھا۔ اس کا کسی قدر سر پرستانہ انداز ہمدردانہ تھا۔ وہ ہمارے ساتھ سمجھانے کے انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کا رویہ پانچواں نہ تھا۔ بیل جی گوشت بہت کھاتا ہے۔ مرغی کا تان و جیرین ہندو ایک لبرل ہندو ہے۔ سیکولر ہندو وہ بھی نہیں۔ بھارت میں ہمیں کوئی سیکولر ہندو نہ ملا۔ بیل جی مذہب میں یکو خاص یقین نہیں رکھتا۔ اس کے کمرے میں قرآن مجید کا نسخہ بائبل اور دوسری مذہبی کتابیں پڑی تھیں۔ اس نے قرآن انھیں جس طرح عام کتاب اٹھائی جاتی ہے۔ مگر سامنے رکھی سوئی کو اٹھانے سے انکار کر دیا کہ اس کے ہاتھ صاف نہ تھے۔ مذہب میں یقین نہ رکھنے والے لوگ کتنے بڑے مذہبی ہوتے ہیں۔ رواجی طور پر بھارت کے شہروں میں مذہب کی کوئی بڑی بندی نظر نہیں آتی۔ ان کے تعصب ذاتی فائدوں کیلئے سراٹھاتے ہیں۔ مسلمانوں کی کسی طرح کی موجودگی میں وہ ضرور ہندو ہوتے ہیں۔ ہندو غیر ہندو پر افتادہ کر رہی ہیں سکتا۔ ساری دنیا میں مذہبی حوالے سے غریب اور امیر کے درمیان فرق موجود ہے۔ رسول کریمؐ نے دعائی جی میری زندگی اور میرا شرفیوں کے ساتھ ہو۔ بھارت میں غریب زندگی آخری رنگوں میں لٹا رہی ہے۔ اب مشرق کا نظاریہ مقدور نہیں رہا۔ یا پھر مشرق سے ملتا جلتا کوئی واقعہ ہو۔

بیل جی ہندو نہیں ہے۔ مگر ہندو ہے۔ ہر اچھا آدمی اندر سے مذہبی ہوتا ہے۔ اندر سے مذہبی ہونا ہی سچائی ہے۔ انسان نے اپنے باہر اچھی سرگرمی دکھائی کہ مگر میری سے لوگوں کا برا حال ہو گیا۔ لوگوں نے تاریخ کو مذہب سمجھا اور مذہب کو رسوم بنادیا۔ باطن ایک نادر اور یافتہ خط بن گیا۔ بیل جی ظاہر و باطن دونوں سے بے نیاز ہے اس کے تجربات سامنے اور نہ سامنے کے درمیان چھنے ہوئے ہیں۔ سوامی دیکھا کرتا کہ کتابیں بھی اس کے پاس ہیں۔ یہ کتابیں کسی ہندو کے پڑھا لکھا ہونے کی دلیل ہے۔ بیل جی ہندوت سے نفرت اور سوامی سے محبت رکھتا ہے۔ ہم مولوی سے دور اور صوفی کے قریب ہیں۔ اپنی زندگی میں اور اس کے بعد زندہ لوگ اولیاء کرام ہیں۔ کسی مولوی کو کم تر قبول دیکھا ہے۔ حیات بعد ممات بھوکہ صرف ظلم دیکھتے ہیں۔ عمل نہیں دیکھتے اس کیلئے گنہ گار تو عمل بہت مودت (مرنے سے پہلے مر جانا) کا تجربہ بھی ضروری ہے۔ بیل جی اپنے کسی سوامی کے قصے سنا رہا تھا۔ جنگل میں اس کے پاس جا کر جو خواہش کی جاتی تھی پوری ہوتی تھی وہاں بے موسم کے پھل بھی فراہم ہو جاتے تھے۔ بے موسم کے پھل حضرت مریمؑ کو بھی مہیا ہو جاتے تھے۔ میں نے بیل جی کو قرآن کریم میں بتا دیا ہے اس واسطے کہ اگر کیا تو بارے حیرت کے اس نے اقرار کر لیا۔ ہم اس طرح ایک دوسرے کی سامنے لگ جائیں تو کسی طرح کے انکار کی قیمت کیوں آئے۔ انکار کو عربی میں ٹکرتے ہیں۔

الدینی کتابیں اپنی مختلف ہیں۔ یہ محبت اور خدمت کا پیغام ہے۔ اصل مقصد راحت جاں ہے۔ امن نہ نہیں ہے۔ یہ دلوں میں وسعت پیدا کرنے بغیر کیسے ممکن ہے۔ یہ کام صوفیوں نے کر کے دکھایا۔

تغصب کا نشانہ مسلمانوں کو بنایا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے رسول انسانوں کے بھی رسول ہیں۔ وہ بڑی وسعتوں، نعمتوں اور رحمتوں والے رسول ہیں۔ انہوں نے اپنے دشمنوں کو بھی دعائیں دیں۔ محمدؐ سے بڑا سیکولر لیڈر تاریخ انسانی نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد سارے مسلم دنیا اور صوفی شہر اسیکولر تھے۔ سارے مذہبی پیشوا سیکولر تھے۔ بدھ، مگر وائیک، چنچو سیکولر سے مراد لادائی نہیں۔ لہذا کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اعتراض انہیں سے چوکے کے دلوں میں چھپی اس عقوت پر ہے کہ وہ بہر حال سیکولر سے مراد ایک بے دین ریاست لینے ہیں۔ بھارت کی ابھی سیکولرزم میں ہے۔ ہندو سیاست دان اس معاملے میں تھکے نہیں۔ انہیں خبر نہیں کہ متحدہ بھارت کا خواب موثر اقلیتوں کے کردار میں ہے۔ ہندو مورخ ہندو لیڈر سے مختلف نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف اکبر اعظم ہی سیکولر ذہن کا حکمران تھا۔ حالانکہ اس نے ہندو ستانوں کو اپنا دین (دین الہی) دے کر اپنی حکومت کی کرنا چاہی تھی۔ جسے نہ ہندوؤں نے قبول کیا نہ مسلمانوں نے۔ اس نے اپنے طور پر قوم سے اس کی شناخت چھین لینا چاہی۔ لیکن چونکہ اس نے اسلام سے انحراف کیا اور کچھ ہندو عقول سے شادی کر کے ان کا داماد بلکہ گھر دار بن گیا۔ وہ جس ہندو سے شادی کرتا۔ اس کا داماد بننا جین کے طور پر عمل میں آجاتا۔ اس لئے اسے پسند کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس نہ انہیال ہے کہ بار بار اور جہانگیر اور دوسرے بادشاہ اکبر سے کہیں سیکولر تھے۔ بلکہ شیر شاہ سوری نے مغل سلطنت میں سے جو تھوڑا سادقت چھینا تھا بہت رفتاری کام لگے۔ وہ کچھ دیر اور رہتا تو اکبر سے بھی اکبر ہوتا۔ بادشاہ (حکمران) سب کیلئے ہوتا ہے۔ سیکولر ہونا چاہئے اس کو۔ ہر فطری چیز سب کیلئے ہوتی ہے۔ ہوا، دھوپ، چاندنی، آسمان زمین سب کیلئے ہے۔ سیکولر ہے۔ انسان نے اب فطرت پر بھی قبضہ کیا۔ چاہئے بقدر شروع کر دیا ہے۔ فطرت سیکولر ہے تو دین فطرت کیوں سیکولر نہیں۔ اسے بھی قائل کرنا چاہیے۔

خبر کے بعد جب وزارت عظمیٰ کی تشکیل کیلئے ایک سیاسی بحران سامنے آیا تو کچھ مسلمان لیڈروں کا نام بھی بحث میں چھڑا کرنا۔ خاص طور سے رفیع احمد قدوسی جو وزیر اعلیٰ اور خوارک تھے وہ اپنی محنت، خلوص، کارکردگی اور کامیابیوں کے طفیل قیام حلقوں میں مقبول تھے۔ مختلف معاملوں میں انہوں نے کئی دشمن و دشمنوں کو آسان کر دکھایا تھا۔ جمروان سے بہت متاثر تھا۔ سیاست میں عام دلچسپی رکھنے والے لوگ ہر قوم کے لوگ ان سے خوش تھے۔ ایک میگزین "ہندو ایشیا" کے ایک ایڈیٹر پر پورے انڈیا میں بہت دلیرانہ اور بے لگے لکھے تھے۔ اس نے اپنے ایک ادارے میں لکھا کہ قدوسی صاحب میں بھارت کے وزیر اعظم ہونے کی ساری خوبیاں اور اہلیتیں ہیں۔ تمہارے میں ایک افسانہ کی طرح کی باتیں (کئی) ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ صرف یہی کئی مولانا ابوالکلام آزاد کو تھی۔ ورنہ کیا کچھ نہیں کا کہرا اور ملک کا سربراہ بن سکتا تھا۔ انہیں وزیر اعظم کو تھوڑا بھارت بھی نہ بنایا گیا جو ایک اگلا ہے۔ کھارے کا منسوب ہے۔

مسلمانوں کی سیکولریت

مسلمان اپنی فطرت اور برکاتیں سیکولر حواج کا ہوتا ہے ہندو کے لوہیں یہ مفت ہی نہیں۔ بھارت کی حکومت بھی کسی مسلمان کو نہیں ملے گی۔ ہندو اپنے تئیں یہ انداز ہی نہیں کر سکتا۔ میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ کسی مسلمان کا کھربا مسلمان کو بھارت کا وزیر اعظم بننا یا جانے تو ایک انڈیا میں سیکولر شینٹ کا منظر آج کی دنیا دیکھ لے گی۔ مسلمان صوفی روحانی طور پر اس خطے میں بادشاہ رہے ہیں۔ ان کا ہر عمل خاص حدود میں سیکولر تھا۔ رہے مسلمان بادشاہ تو وہ سیکولر طبیعت کے نہ ہوتے تو بھارت میں ہندو اکثریت میں نہ ہوتے۔ تخت دہلی کے آس پاس تو مسلمان ہی مسلمان ہوتے۔ بھارتی حکومت اقلیتوں کے بارے میں چاہتی ہے کہ وہ ہندو نہ ہوں غیر ہندو بھی نہ ہوں۔ آج کل سیاست دان سیکولرزم اور اجماع کو گنہگار کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ سیکولرزم کو لادائی نظام قرار دے کر اسے قبول کرنے کو تیار نہیں اور کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک لوگ دین و دھرم سے لائق نہ ہو جائیں سیکولرزم کا نشانہ نہیں ہوتا۔ اندر رسول کہ نہ ماننا اور بات ہے۔ لوگوں کو اپنے مذہب پر رکھنے کا حق دینا اور بات ہے۔ اسلام نے کہا۔ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ کسی کس مذہب اور خدا کا پرانہ کو۔ سب انسان برابر ہیں۔ جس طرح ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق زندہ رہنے کا حق ہے۔ اسی طرح ہر ملک کو اپنے دین کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر اپنا مذہب مسلط کیوں کرے۔ کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر اپنا نظام نافذ کرنے کی زبردستی بھی نہ کرے۔

میں تو کہتا ہوں کہ اسلامی ریاست ہی سیکولر ہوتی ہے۔ ہوتی چاہئے۔ مجھے تو سوشلزم والوں پر اعتراض صرف یہ ہے کہ وہ مذہب خصوصاً دین اسلام کو اپنا ملامتور بنا دینا شروع کر چکے ہیں۔ ورنہ حکیم الامت علامہ اقبال نے خدا + سوشلزم = اسلام کہا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کبھی خدا کو نہ ماننے والوں نے زیادہ تغصب سے زندگی بسر کی۔ خدا سے بڑا سیکولر کون ہو گا۔ خدا کے بندوں کو بھی غیر متغصب ہونا چاہئے۔ خدا ان کو بھی دیتا ہے۔ بہت دیتا ہے جو اسے نہیں ملتے۔ وہ نہ ماننے والوں کا بھی رب ہے۔ وہ صرف ایک قوم کا رب نہیں۔ سارے عالموں کا بھی رب ہے۔ جب خدا کو نہ ماننے والوں نے دوسرے مذہب والوں سے خود کو برتر سمجھ لیا تو خیر ہو گئی۔ یہ نہ خدا کا نشانہ نہ خدا کا پیغام پہنچانے والوں کا۔ اس پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا اپنا اپنا طریقہ ہے۔ اپنا اپنا راستہ ہے۔ رہنے مختلف ہو سکتے ہیں۔ منزل ایک ہے۔ دنیا دار بھی سیکولر نہیں ہو سکتا۔ جب دین دار (مسلمان) ہی سیکولر نہ رہا تو کھردرا کو حقیقت کہاں سے ملے گی یہ سچے مسلمان کی پہچان ہے کہ وہ غیر متغصب اور کشادہ دل ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ

کھوٹے سکتے

عبداللہ جس میں بھارت کے قومی سطح کے لیڈر کے اوصاف تھے۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض کی بات بہت باعنی ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت کو کشمیر کے راجہ کی بجائے شیخ عبداللہ سے بات کرنی چاہئے تھی۔ قائد اعظم کے ساتھ فہمک طرح سے شیخ صاحب کی بات ہونے نہ دی گئی۔ بلکہ بات پھلنے نہ دی گئی۔ پہلے غلام عباس نے پھر دولت نے۔ پھر صدر المسلمین ساناگ نے اپنے شاگرد شیخ عبداللہ کیلئے ذمہ داری سنبھالی۔ مکران کے گھر پر آئی ڈی لگا دی گئی۔ قائد اعظم نے کہا کہ کشمیر میری جیب میں ہے۔ پھر اس جیب سے بقتل خوان کے کھوکھے نکلے گئے۔ لیاقت علی خان "دولتانہ" خان عبدالعظیم اور غیرت بہت لمبی ہے۔ وزارتوں کیلئے ماتحتوں کو برادری کر دیا گیا۔ سڑک کھرنے لگے اب تک چل رہے ہیں۔ عبدالرب نیشنل کونرا کیا گیا کہ اسے قائد اعظم بہت پسند کرتے تھے۔ لیاقت علی خان کو اپنی وزارت عظمیٰ کی فکر پر بھی تھی۔ اس نے اپنے اقتدار کیلئے مسلم لیگ کو واٹر کر دیا۔ اب تک مسلم لیگ اسی کام کیلئے استعمال ہو رہی ہے۔ عبدالرب نیشنل ہونا قائد اعظم کے ساتھ مسلم لیگ میں تو۔۔۔ تو اب نیشنل شریں ہمارے سینے میں۔ قائد اعظم کہیں شیخ عبداللہ کو کشمیر کا وزیر اعلیٰ نہ بنادے۔ کشمیر ہی گنوا دی سیاست دانوں نے۔ کشمیر کی بارے ہوئے عمل کی طرح پاکستانیوں کی جھولی میں آج۔ ہزار جھولی میں سوار کر دیا کسی نے۔ کسی نے۔ نام کیلئے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ شیخ عبداللہ کو بھارت کی لیڈر شپ تو کیا ملتی۔ کشمیر کی قیادت بھی کیلئے پر لی۔ البتہ بوس میں اندر کا مشتق ملا۔ کشمیر کا محبوب لیڈر اساتذہ کا تھا۔ اس کے بازو پر سے لیے تھے مگر اندر کی نفسان دونوں زباں دیو تھیں۔

نمرو کی دوستی شیخ صاحب علی سب سے بڑی دشمن بن گیا
دیکھیں راجپوت کی دوستی غارتوں، غارتوں کا لکڑی کرتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ شیخ مجیب کا شیخ مجیب شیخ عبداللہ سے
مختلف نہ ہوا۔ شیخ مجیب بھی نمرو کی بیٹی کا دوست تھا۔ یہ صغیر پاک و سنی کی تاریخ میں سیاسی شیخوں کے ساتھ
کچھ اچھا نہیں ہوا۔ نہ ان سے کچھ اچھا ہو سکا۔ دکھ تو یہ ہے کہ اصل نقصان کشمیری مسلمانوں اور شہرٹی
پاکستانیوں کا ہوا۔ کشمیر کا یہ حال ہوا کہ دونوں کشمیر "مقبوض" سمجھے جاتے ہیں۔ پاکستانی کشمیر کا نام تو
کمزور "آزاد" ہے۔ جیسے اب الحکام نے اپنا نقص رکھ لیا تھا۔

آزادی کے بعد اُن کے خیالات میں کچھ تبدیلی آئی تھی مگر اب زمانہ بدل چکا تھا۔

مسلم انڈیا اور مسلم روس کی یکجہتی

عجیب کے ہاتھوں جو شرقی پاکستانوں کے ساتھ ہوا۔ وہ اب سائے ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں کر سکتے۔ اس انداز سے میں ان کا ہاتھ پاکستانی ہی پکڑیں گے۔ بعض اوقات کسی تحریک کے فیصلے کو تاریخ بھی رد کر دیا کرتی ہے۔ بلجئیم ایک مستور فیصلے کے تحت زور دے کر دھنک کر دیے ہیں۔ شرقی پاکستان کو بلجئیم میں جانا ایک فیصلہ ہے کہ ایسے کئی فیصلے بھارت میں بھی ہونے والے ہیں ہو کر دیے گئے۔ بھارتی سکران پاکستان میں وہ آگ جلا رہے ہیں جو ان کے اپنے ملک میں دھواں پھیلا دے گی۔ ہندوؤں کے سامنے کھڑا بھارت کا قیام ایک پیچھے ہے تو مسلمانوں کے پاس بھی مسلم انڈیا کا تصور ہے۔ پاکستان تو اس منزل کیلئے ایک براڈ ہے کہیں بھی مسلمانوں کی تعداد دوس کر ڈے زیادہ ہوتی تو سمجھنے کے کچھ ہونے والا ہے۔ ہندوستان ایک اور قائد اعظم کا مختصر ہے۔ پاکستان ایک شرمس سنا تو بھی پاکستان ہی رہے گا۔ یہ آرام میں بھی بن سکتا ہے۔ حیدر آباد میں "مختصر" میں دہلی کے کسی محلے میں بھی بن سکتا ہے۔ بلجئیم میں شرقی پاکستانی ہیں تو پاکستان وہاں ہے۔ اور تو اور یہ فرقہ "امریکہ" برطانیہ فرانس ہر ملک میں بن سکتا ہے۔ روس میں بھی بن سکتا ہے۔ مسلم روس میں ایسی تحریکوں کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ روسی پاکستان پر حملہ کر کے اس پر قابض ہو سکتے ہیں۔ مگر پاکستان ان کی آنکھوں میں آباد ہونے والا ہے۔ پھر وہاں کئی بھاری پاکستان کا نقشہ بناتے چلے جائیں گے۔ پاکستان کا قیام دنیا بھر کے مسلمانوں کی مضبوط اور موثر قیادت کیلئے ہوا ہے۔ اب اگر برصغیر کے مسلمان اس نعمت اور ذمہ داری کے اہل نہیں تو کسی اور کسے کے مسلمان سہی۔ اب روس ہمارا بھائی ہے۔ روس اگر یہاں قبضہ کرنے کے ارادے میں ہے تو پھر وہ بھی غلط ہو جائے گا۔ "میر عرب کو آئی معذرت ہو جاہل سے"۔ آگے آگے دیکھئے ہونا ہے کیا"۔

اس بات کا اشارہ الہامی کتابوں اور قرآن وحدیث میں ملتا ہے کہ روس کی طرف سے یغادر ہو گی جو انسانیت کو مسمار کرتی ہوئی چل جائے گی۔ مسلم دنیا "تیسری دنیا" سماری دنیا تیار ہو رہی ہو گی۔ پھر ان کا اور ریت کے انباروں سے روشنی چھوٹے گی۔ روشنی جو یہ جان ایک لاکھ چوبیس ہزار بار دیکھ چکا ہے۔ مسلم انڈیا اور مسلم روس کے قیام کے لئے کو دشمن تحریک پاکستان کا ٹکس ہیں۔ مسلم دنیا کا ظلم و مقرر پاکستان علامہ اقبال کی شاعری میں چمک رہا ہے۔ یہ اصل میں ایک آزاد اور محبت بھری دنیا کی آواز ہے۔

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلمان آج تو اسی خواب کی تعمیر دیکھ

ذرا جلدی

شام ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے۔ زندگی یومی تمام ہوتی ہے۔ لگتا ہے۔ جیسے وہی شام ہے۔ صدیاں گزر گئی ہیں۔ وقت کا پتھر وہی گاوی ہے۔ ایک ہی دائرہ۔ ہم سب دائرے میں چل رہے ہیں۔ سارا دن چلتے ہو۔ شام کو پھر دیں۔ دلی کی شام لاہور کی شام سے مختلف نہ تھی۔ ہر کسی پر شام کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔ ہمیں اس کا پتہ چلتے چلتے کمال کی کس شام کی بات ہے۔ ایسا کس ہی شامان ویلے چپ چنے ہو گئے لوگ۔ شام کا کس سڑکوں پر اپنا اصل سماجی دھونڈا مارتا ہے۔ اداس شام اور حسین ہوتی ہے۔ روتی ہوئی لڑکی کی طرح شام وہاں دلی میں پریشان سی دکھائی دی۔ ایک بھی چروہ نہ تھا شام جیسا کہیں۔ خاص خاص دیدہ معمولی بھگی شام جیسا کوئی نہ کوڑا کچھو کہیں کس کس بھی، ہم نے بھی دیکھ لیا تھا۔

مجھے اپنے بزرگ دوست کا پیغام یاد آیا جو اس نے اپنی "اس" کیلئے دیا تھا۔ بالکل ہی نقشہ کھینچا تھا کس نے۔ بالکل وی سی بھائی ہے اس نے قریب کیا تو مجھے پیغام بھول گیا۔ اس کو دیکھ بھی نہ سکا بھی طرح۔ میرے دوست کو مت بگے ہیں مجھ سے۔ کے کا تو دم غرض ہو۔ ابھی کچھ عموالے ولولوں سے نہیں نکلے۔ بچوں لاہور لوگوں کی طرح ہر روز ہی چڑی کی طرف لپک پڑتے ہو۔ وہ کچھ عموالے لایبرادوسٹ مجھ سے کم تو تھیں مگر میں اس کا قصہ وار ہوں۔ یہ اگلی قرآن کئی بھی جو کسی کی طرف سے ہوتی تھی اور وہ چاہتی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ اس سے بصورت لال کر گزارہ کر لوں گا۔ لیکن ایک داس معاملے میں بصورت کمناہست مشکل ہے۔ پھر وہ دوست ایسا کا یاں ہے کہ اس ضمن میں بصورت کچ سے فوراً پتہ چل جاتا ہے۔

ہم چلتے رہے اور کوئی ایسا چروہ کوئی چروہ نہ ملا۔ جیسے لوگوں نے کسی اور کے چروے اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے ہوں۔ ہماری طرف کوئی دیکھتا بھی نہ دیکھتا بھی تو ایسے جیسے کوئی اور دیکھ رہا ہو۔ چروں پر آنکھیں بھی کسی اور کی تھیں۔ ان جسموں میں لینا کیا تھا۔ ہم باری تو اس پیچھے قیام کس شرمیں لگتی تھیں۔ یہاں شاید ہمارے بزرگ یار کی "عجیب الیہ" ہو۔ مگر نہیں۔ وہ تو کئی ہندو عورت کا گرویدہ ہوا تھا پاکستان بننے سے پہلے۔ اتنے عورتوں کے باوجود پاکستان بننے پر کبھی محض نہ ہوا۔ بہت غمور نرم لہجے میں کہتا۔

"میں ذرا جلدی میں بن گیا۔ ایک سال اور نہ بھتاؤ۔"

تو وہ یقیناً چپ ہو جاتا۔ یہ بات یہاں بھی ایک پڑے نہ کی۔ جس میں میرے اس دوست کی

عادتیں چمک چمک پڑیں۔

”ہم بہت حسیت میں رہ رہے ہیں بہت۔“

میں نے سوچا کہ ابھی وہ پاکستان کے خلاف تقریر کرے گا مگر اس نے کہا۔

”بس ذرا جلدی میں نہ مگھلور نہ در نہ۔“ اور وہ چپ ہو گیا۔

قائد اعظم نے ایسا کچھ تو نہ کہا تھا۔ مگر وہ آخر عمر خواہش اور غرضیوں کے درمیان فرق کو زیادہ سمجھ کر سکے تھے ان کی نگاہ میں کچھ اور نکش تھا۔ جو مگر نظروں کے سامنے آیا وہ اور تھا۔ آبادی کی نقل مکانی اور نقل و حرکت کی ناممکنی آفت اسلام مذاہب کی طرح ملی کے وجود میں ارتقائی تھی۔ دوستوں ہمسایوں کے اندر قاتل پیدا ہو گیا۔ جو قاتل نہ ہوا مقتول ہو گیا۔ یہ برصغیر کے لوگوں کیلئے تحریک آزادی کے ”جرم“ کی پاداش میں ایک انتقامی کارروائی تھی جو اچانک میلے کی طرح خطرناک ہو گئی۔ اس ذرا سی جلدی کا کچھ خمیازہ بندہ بھی بھگت رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ رستہ کئی رستوں سے جا ملنے والا ہے۔ پرانے رستے نئے قدموں کو خود دلا دیتے ہیں۔ بھارت میں کون ایسی جگہ ہے جہاں کوئی نہ کوئی شخص کف پا چھپا ہوا نہ پڑا ہو۔ اور اس میں خون کی مسکند ہو۔

بیسیوں صدی کی ادبی خدمات

”بیسیوں صدی“ ایک مشہور رسالے کا نام ہے جو ایک زمانے میں بھارت کے علاوہ پاکستان میں بھی مقبول تھا۔ اس رسالے میں پہلا نمبر ہے۔ خوش گرامی جب اس کے مدیر گرامی تھے تو بھارت کا بڑا بڑا ادب اس ذریعے سے لوگوں کے ذوق و شوق کا سامان بنتا تھا۔ خاص طور سے افسانے اور ان پر لکھا ہوا افسانہ نگار کا کھلے پتہ۔ اس طرح قلمی دوستی کا سلسلہ دونوں ملکوں کے نکلنے اور پڑنے والوں کے درمیان چلا۔ قلمی دوستی بعض اوقات قلمی دوستی میں بھی بدل جاتی ہے۔ یہ بات تب اور اب سب سمجھتے ہیں کہ پاک بھارت میں اس کے بغیر سارے تعلقات ناجائز حد تک منافقت کا شکار ہیں۔ بعض اوقات ناجائز تعلقات بھی بہت کچھ ہوتے ہیں۔ قلمی رابطے اور قلمی رابطے میں بہت سی کم فرق ہوتا ہے۔ مراسلے کے ذریعے جو مکالمہ ہوتا ہے۔ کشادہ بننا ہوتا ہے۔ خطوط کے ذریعے تعلق کی منزلیں آہستگی سے اور پائیداری سے طے ہوتی ہیں۔ میری خط و کتابت برساہر سے کئی محبوب لوگوں کے ساتھ ہے مگر ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ملنے ملائے کی لائقوں سے آشنا ہوں۔ مگر نہ ملنے کی سرشاریوں سے بھی واقف ہوں۔ ایک کیفیت میں دوسری کے حوصلے لینا مشکل ہے اور اصل حوا مشکل عمل میں ہوتا ہے۔ خدا کو غلیل جبران نے آدمی ملاقات کہا ہے۔ خطوط غالب ہوں۔ یا کسی جذبے سے مغلوب شخص کے ماتے ہوں۔ کسی باذوق آدمی کا نامہ اعمال ان سے خالی نہ ہو گا۔

کھوتیں تو معاہدے کرتی ہیں۔ روس کے ساتھ میرے ملک کے جو بھی معاملات ہوں میرا مکالمہ اس زمین کے ساتھ انسانی تجویز اور سوئے نیشیں کی تقریروں کے آئینے میں ہوتا ہے۔ میرا دوسرا شخص کیا مگر کئی بار چاچا کا ہوں۔ عظیم سوئے نیشیں ملک بدر ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ملک بدر ہوں۔ کسی حکومت کی سخت عملیوں کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے لکھنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ مجھے کیا غرض ہے کہ فرانس میں کس کس کی کھوتیں آئیں اور تمہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس پال سارتر نے کیا کہا کہ

”میں فرانس ہوں۔“

میں اس فرانس کا باشندہ ہوں۔ صدر ڈیگال کے ایک مقرب نے حکومت کے کان بھرنا چاہا ہے مگر سارتر نے اس جیسے کو پورے فرانس کا اعزاز اقصیٰ کیا گیا۔ جس کے ایک عام سے ہونے میں بیٹھے اس عظیم دانشور فلسفی کا یہ جملہ دنیا کے تمام ملکوں کے ہونٹوں میں ڈھنکس ہوا جہاں سر پھرے اور مضطرب سوچنے والے لوگ چائے کی پیال میں آتے زمانوں اور گزر چاتے طوفانوں کے ٹکس منتقل کرتے رہتے ہیں۔

رہا۔ وہ ایسے بھی بندہ نہ بلکہ گھونڈ شخصیت کا مالک ہے۔ رفعت سروش ہر شاعر کا تعارف کر رہا تھا۔ مخمور سیدی نے کہا میری تعریف نہ کرو لوگ مجھے جانتے ہیں۔ رفعت نے کہا لیکن یہ خود اپنے آپ کو نہیں جانتے۔ یہ مخمور کی اور تعریف ہو گئی۔ مخمور جب اچھا شاعر تھا تو پھول کی جیساں شاعر تھا اور کرنا شروع کر دیتا۔ جس طرح وہیں دی جاتی ہیں۔ یہ سبے ساختہ سا آدمی اپنا سا رنگ۔ ساتھ نکلی "انوار انجم" اخیر سیدہ "خلش دہلی" ساحرہ قرینہ "شادان بارہ بکلی" محسن الرحمن فاروقی "عطا الحق" قادیانی اور میرے علاوہ محفل میں موجود شاید سب لوگوں نے کلام سنایا انتظار رہے اپنی نثر سنائی۔

ایک چھ برس اپنی بندوبست سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ اس نے کلام سناتے ہوئے کچھ شاعروں پر بندوبست کیا اور باقاعدہ نشانہ باندھ لیا۔ شاید اس نے کیوبے لفظ شعروں پر پڑا مانی تھا۔ داد دینے والوں کا بھی نشانہ لیا۔ "سداو" کرنے والے بڑے شاعر سے کہہ رہے تھے۔ یہ چھ فراموشی راؤشور کاغذ پر لکنا تھا۔ چنگ ہم غلام پڑیہ نوکری۔ وہ اسے تختہ دار کاغذ پر بھی نہ دیتا تھا۔ شہت ہم غلام پڑیہ نوکری۔ احمد فراز اور پروین سید قادیانی سے پہچنے۔ میرے آجے درست آجے والی ضرب الملش کا کیا بنے گا۔

جب پاک بھارت جنگ ہو رہی تھی تو کچھ پاکستان کے لوگوں نے قرۃ العین "کرشن" بیدی "فراق" امرتا کو پڑھنا نہیں چھوڑ دیا تھا اور بھارت میں انہماں "منو" فیض "ندیم کو" پڑھنا ترک نہیں کر دیا گیا تھا۔ دونوں طرف لوگ لڑا اور جہاں کو سنتے رہے۔

"بیسویں صدی" میں چھپنے والے دونوں ملکوں کے لٹاکندے ہوتے تھے۔ "بیسویں صدی" نے کئی مشکل سوالات کا حل بھی پیش کیا۔ اگرچہ "بیسویں صدی" سوالات کی صدی ہے۔ سوال کا جواب تلاش کر لیا جاتا ہے مگر یہ جواب خود ایک اور سوال بن کر سامنے آکر رہتا ہے۔ جواب یہ ہوتا ہے کہ پوچھنے والا مطمئن نہ ہو جائے اور اس کا سوال بھی زندہ رہے۔ اب دیکھیں کہ اس سوال کی کوئی جگہ ہے جو میرے ذہن میں نہ پھینک گیا ہے کہ اکیسویں صدی آگئی تو ایساں رسالے کا نام تبدیل کر دیا جائے گا۔ سیاست دان اور انہوی ہمیں اس سوال سے ڈراتے رہتے ہیں کہ کیا اکیسویں صدی آئے گی بھی؟ ان لوگوں نے ایسے سوالوں کے ذریعے ڈر اڑا کرے لوگوں کو ادھ مار کر رکھا ہے۔ شاعر اور ادیب گھو گھو اور ڈنکار نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ کیسے کیا ہو جاتا۔ سوال میں حیرت ہوتی ہے اور خوف بھی۔ کبھی بھی حیرت اور خوف میں فرق نہیں رہتا۔

رحمان نیز کی طرف سے اس محفل میں حیران ہونے کے بہت موقع تھے۔ کوئی ڈر نہ چاہتا تو اس کی بھی گنجائش تھی۔ نیز صحت مند خوش دل جوان ہے۔ ایک بڑے سے کمرے میں سب لوگ بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ خواہن و خواہناں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ گنتی کرنے کو میرا ہی نہ چاہا۔ حلقہ ارباب ذوق کے چیلے سے زیادہ بند تھے۔ سارا انتظام مردوں کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ صدارت کے اعلان کے ساتھ جب ساتھ نکلی جہاں چھپے سے مزید بیٹھ گئے۔ تو خواہن نے بندوبست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رحمان نیز سے پھولوں کے ہار لے لے کر ہمارے گنگے میں ڈالنا شروع کر دیے۔ پھر محفل میں موجود سب لوگوں نے ہمیں اپنے ہاتھ سے ایک آدھ بار پھانسیا۔ بار ختم ہو گئے تو ہمارے گنگے سے اتار اتار کر پھر پھانسیا گئے۔ پھول کی ہتھیریں پر کتنی ہی لمس جوت ہو گئے تھے۔ وہ اور مک اٹھے تھے۔ دلی میں پھولوں کے بیسے بہت ہیں۔ آج دل والوں نے ہمیں باغیچہ بنا دیا تھا۔ جب باروں سے ہم نے اپنی گردن چھڑائی تو کمرے میں ہر طرف پھول ہی پھول بکھر گئے۔ چھچھے کی ہوا ہتھیروں کو پورے کمرے میں اڑائے پھرنے کی ذمہ داری ابھی طرح پوری کر رہی تھی۔ ہوا اور خوشبو نظر نہ آنے والی چیزیں ہیں۔ آج نظر بھی آ رہی تھیں۔

مشاعرہ شروع ہو گیا۔ ساتھ والے کمرے سے فطرتی قمار تو ہمیں آنے لگ گئیں۔ کوک اور شراب کے گنگے میں خاص فرق تھیں۔ خاص طور سے جہاں کو گڑا دیا جائے۔ معاملہ دل میں مچتا تھا۔ کچھ پتہ نہ تھا کہ کس کے سامنے کسی کی بوقت پڑی ہے۔ انتظار ہمیں نے جسے کوک کچھ کے منہ سے لگا یا تو ہم اسے منہ نہ لگا یا۔ انتظار جانتا ہے کہ ہندی میں کوک کے کتنے ہیں۔ کھلی بوقت کے آگے انتظار بند بند بیٹھے

محمود اور پرزیز کی دلدلیاں

ہر سوچ رہے تھے کہ

دوہے تک کیا کریں گے۔ بس ہر سوچ رہے تھے وہ یہ نہ بھی سوچے تو بھی پشت کرنے کیلئے اترتے تو ہمارے
گمے میں نے کافور ہمارے پاس نہ ہوتا۔ دروازے پر دستک ہوئی محمود باغی اندر آ گیا وہ ایک سے
ہوئے جسے یہ طرح مجھو اپنے نام سے علاوہ بھی کچھ بولتا تھا اسے پچکان لینے میں کیا شادی آتی۔ آمل انڈیا
ریڈیو کی اردو سروس کے ادبی پروگراموں میں محمود باغی سے زیادہ کس کو سنا گیا ہے۔ اندھیرے میں جب
آوی آئیکہ دوسرے کو کچھ مسکتا آواز ہی پچکان کی تصویر بناتی ہے۔ آوازیں دیکھتی ہیں اور اپنا آپ
دکھاتی ہیں۔ دیار غیر میں شعر و ادب کا ایک ایسا علاقہ ہے محمود باغی کے پاس جہاں ہم اکٹھے ہو سکتے ہیں۔
محمود باغی پاکستانی ادب کے بارے میں وہ کچھ جانتا ہے جو اکثر پاکستانی ادیب نہیں جانتے۔ پاکستان سے
ایک۔ ست اٹنی لوگوں کی ولی کی طرف بھی جاتا ہے۔ علم آدمی کا دوست کس طرح بن جاتا ہے وہ نہ ہونے
لوگوں کو شعری و شش کا کفار بھی سمجھتے ہیں اور اس شعری کئی شبکیں ہیں بکری ہیں۔

علم ابرہہ تہی ذی بارے ہو

علم ابرہہ من ذی بارے ہو

جس آدمی کی گفتگو میں آزادی کی تپ نہ ہو تو اس کے لفظوں میں اسے کون تلاش کرے گا کہاں
تلاش کرے گا۔ جب محمود آل انڈیا ریڈیو سے ادبی موضوعات پر بولتا ہے تو کسی کی آواز تکے تلاش کر لیتا
مشکل نہیں ہوتا۔ دروازہ ادبی اور وسیع و ادبی تھل مل کر ایک رہیں۔ وہ جانتے تو شعر و ادب کا سچا طالب
ایسے اچھے انداز تخلیق کردیا کرتا ہے۔ ہمارے پاس ادب کے تخلیق کاروں کا جو حال ہے وہ کس سے چھپا ہوا ہے
میں نے معتذر ارباب ذوق لاہور کے پوچھا لیوں سالانہ جلسے میں سیکرٹری کی حیثیت سے بھارت پڑھتے
ہوئے کیا تھا

”خیر خورشید روشن اور معنی تقسیم کرنے والے اپنے ارد گرد تاریکی اور بد صورتی کی دھاری
کیوں ماند کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باگ نہیں کہ وہ لوگ جو ہماری کلیات پڑھتے ہیں ہماری
کلی نہ دیکھیں تو وقت ہو جائیں تو ہماری ہی کتابیں جاکر ان کی رائے ہماری آنکھوں میں بھر دیں۔ یہ بھی
والا اپنے آپ کو فخر آفرادہ متکر کل کہتے ہو سیرت کا پرچار کرنے والے لاپرواہی ذات میں بشار اور ہوا
سے بڑھ کر منت و حرم ہیں۔ بنیادی حقوق کیلئے آواز اٹھانے والے کسی طور اپنے مختلف نظریے والے
اور اپنے گرد پ سے باہر لینے والے کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس وقت میرے سامنے بیٹھی

تاریخ کا ایک بڑا اجتماع تھا اور آج صرف محمود باغی بیٹھ تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے اس سے پہچاننا یا
اس کو بتایا تھا کہ تھوڑا مدت پہلے کہ لوگ شکر کے حصد پر اپنے آپ کو فائز کہہ لیتے ہیں آدمی منکر ہو
مگر صرف شکر کے سامنے قلیل منکر ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے سامنے لذت کی ساری منزلوں کو مار لیتے
ہیں جس طرح بڑوں آدمی ظالم ہوتا ہے اس طرح منکر بہر حال ذوق نہیں ہوتا ہے۔ ان دونوں طرف کے
لوگوں کی ہمارے پڑھنے لکھنے والے قلیل ہیں کہ کسی۔ تو یہ اس علاقے میں بھی بھلائی بخش پیدا
کر سکیں کہ مرگ کو خوشیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ تھے وہ علم کو بیش علم پڑھتے تھے لوگ ہیں کہ علم
کو بھی علم نہاد نہ چاہتے ہیں۔

یار و تصوف کرو پھر تصور

کرو تو باغی اپنا گچ پتہ دیں گے۔

لکھنے والا تصوف کو ماننے والا نہ ہو تو بھی صوفی ہوتا ہے میں ہوتا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے اکثر
ادیب بہت کچھ ہیں مگر کچھ بھی نہیں شکر + منافق شخص کا ایک اور مضطرب حد بھی ہے اپنے آپ کو کچھ
دگرے نیست بلکہ دگرے نیست لکھنے والا کسی اور کچھ کو کہے پر داشت کر سکتا ہے۔ اس کا قبل داشت
صورتحال میں سوائے حسد کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ کسی سے بڑا سلوک نہ ہو سکتے تو اپنے پر تو ہیں چلتا
ہے۔ بھارت میں ان دونوں یار لوگ اپنے ساتھ یہ بد سلوکی محمود باغی کے حوالے سے کر رہے ہیں اس کے
ساتھ حسد پڑھنے لکھنے والا میں اس کی مجھوت کی وجہ سے ہے اور اس لئے بھی کہ اچھی لڑکیاں اس کے
ساتھ کیں انھیں تھیں اور پائی پائی ہیں۔ آن کل اس کے ساتھ یہ یو کی پروگرام انگریزوں کی وسیع کا عشق
بذروں نہ ہے۔ ان لوگوں کے پاس ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ محمود شادی شدہ ہے پہلے ایک کو بیوا کر لایا
اب کئی دوسروں کو بھارت لے جاتا چاہتا ہے ان کا کچھ یہ بھی ہے کہ ان کے پاس ایسا کوئی سلاب نہیں ایسی لہر
بھی نہیں اور وہ بے مذہب مرنے کا نہ شکر ہے۔ یہ بھی ان کے کوسوں کی لیاں کھاتا رہتا ہے۔

بات نہ جانے کس طرح صلاح الدین پریز کی شاعری کی ہوئے تھی۔ محمود باغی نے اس کی تعریف کی تو
مجھے یاد آیا کہ سراج منیر بھی اس شخص کی شادی کا قائل ہے سراج نے صلاح الدین کے شعری مجموعے
”احباب سرائے“ کا پڑھا تھا لکھا ہے محمود نے اس کے ہاں ”قمرآ“ کا کھانا کھا لکھا ہے اس وجہ سے کچھ
ادیب پاکستان میں سراج سے اور بھارت میں محمود سے نفرت ہیں۔ صلاح الدین پریز کو صرف اس لئے شاعر
نہا کہ وہ امیر آدمی ہے، بد دینی ہے یہ ایسی ہی زیادتی ہے جیسے کسی کو غریب کچھ کر نظر انداز کر دیا
جائے کہ پریز کی بات کرتے ہوئے گھبرا گئے ہیں کہ جو اس کے حق میں بات کرے اس کیلئے مشہور
ہو جائے کہ وہ پریز سے پیسے لیتا ہے۔ یہ سب جیس محمود باغی حسد نہیں۔ وہ باغی اس کے حسد ضرور
تینہ ہو سکتی ہیں یا سب سے عورت سے کی جائیں۔ مخاطب ہوئے کیلئے یہ متبادل ہوئے کیلئے دونوں
فریقوں میں یہ دونوں خصوصیات ہونی چاہئیں۔ باغی سہمی ہوں یا دیکھ کر نہ والا والی سو بھی ہو ایک توبہ۔

جمہوری بونگیاں

ہم اس برس میں ملے تھے جہاں راجہ جھاکے مہم این قیام کرتے ہیں۔ حیات اللہ انصاری کے کمرے میں ان کے جیسے وادیز بڑھاپے والی ان کی تیکر تھی اور ان کی میڈیٹیب ممبر پارلیمنٹ قاضی سلیم ایک خاتون سیاسی کارکن محمود بیگ موجود تھیں۔ بغیر کسی قاعدہ کو کشل سے سیاسی گفتگو شروع ہو گئی گفتگو محمود بیگ نے اپنے سامنے سے شخصیت نہ دینی خطا سے میں سامنے بیٹھا تھا۔ اس گفتگو میں انصاری صاحب نے ایک بار بھی شریک ہونا مناسب خیال نہ کیا۔ بیگ صاحب مسئلہ فلسطین میں پاکستانی حکومت کے کردار کی وضاحت چاہتی تھیں۔ یہ نہ بتاتی تھیں کہ بھارتی حکومت نے اس معاملے میں کیا کارنامہ سرانجام دے لیا ہے۔ روں سے کیا تیر بار لیا ہے اور کسی دوسرے ملک نے کیا کر لیا ہے۔ مسئلہ فلسطین امریکہ اور روس کی عالمی ملی بھگت کا نوٹا ہوا آئینہ ہے۔ ہم بیگ صاحب کو بتاتا کر تھک گئے کہ ہم پاکستان کے فائدے کو بوسکتے ہیں۔ پاکستانی حکومت کے ترجمان نہیں لیکن وہ کسی اور کی منتی ہی تھیں۔ میں نے کہا کہ پاکستان کی ادنیٰ انجمنوں نے فلسطینیوں کیلئے اعلان کئے۔ قراردادیں کیں۔ اس پر بھتیجی حسین نے کہا کہ حیرت ہے کہ اس کے باوجود فلسطینیوں کا کچھ نہیں بنا۔ ایک قصبہ کمرے کے حجم کے برابر پھول گیا اور بحث کا لبادہ پھٹ گیا۔ ہم منتظر رہے کہ ابھی مسئلہ افغانستان پر بات شروع ہو گی مگر یہ شاید بیگ صاحب کی پسند کے مظلوم تھے۔ آسمانی 'انجانی' کشمیری تو ان کی حکومت کی رعایا ہیں۔ انہیں موضوع بحث بنانا جمہوریت دشمنی کے مترادف ہے۔ کسی جمہوری ملک میں کتنے ہی غیر جمہوری کام ہوتے رہیں 'جانچیں۔ ہم اپنے ملک میں بھی جمہوریت کے طلب گاروں میں سے ہیں اور بھارت میں جمہوریت کے زور شور پر انہیں مبارکباد کا حق سمجھتے ہیں مگر جو کچھ ہم نے بھارت میں دیکھ لیا ہمارے خیال میں وہاں کے لوگوں کی اکثریت کے مسائل کا حل کسی معاشی نظام میں ہے۔ سیاسی نظام میں نہیں۔ جمہوریت انسانیت کی دوست ہے۔ انسانوں کی دشمن بھی ہے۔ جمہوریت سے دلی علیقہ چاہئے اس کا مقابلہ بھی کرنا چاہئے تاکہ یہ طاقتور نظام قائم نہ ہو سکے۔ یہ نقصان بھی کر سکتا ہے لیڈروں نے اسے وعدے بھارتی حوام کی آنکھوں میں ڈال دیئے ہیں کہ انہیں کچھ کھائی ہی نہیں دیتا۔ یہ انہیں جھپٹیں تو بار کی اور پھیلے گی۔

محمود بیگ کی موجودگی میں انصاری صاحب سے کسی ادنیٰ موضوع پر بات نہ ہو سکی۔ اس ماحول میں صرف بحث ہو سکتی تھی اور وہ ہم کر چکے تھے۔

ایک ممبر پارلیمنٹ کا سلوب شعر

عام طور سے کوئی نوٹا پھوٹا شاعر ہی اسمبلی میں پہنچتا ہے۔ ایک صاحب دیوان شاعر اندرا کا گھر گیس کے ٹنک پر اپنے متبادل میں بندو امیدواروں کی ضمانتیں ضبط کر کے ختم ہوا۔ "نجات سے پہلے" ان کا شعری مجموعہ ہے جس کا ریاچہ اخرا ایمان نے لکھا ہے۔ قاضی سلیم سے مل کر ترقی خوش ہو گیا میں اندرا کا گھر گیس میں لیٹے لوگ بھی ہیں۔ اچھے اور بچے لوگ ہر گیس بوتے ہیں۔ غیر سیاسی حد تک سادہ آدمی۔ ان کا چال چلن بھی غریب تھا۔ اگر بتایا جاتا تو انہیں انصاری صاحب کا کوئی نوٹ کر سمجھ لیا جاتا۔ کسی عمل کے قرینے سے ظاہر نہ ہونے دے رہے تھے۔ وہ کہ وہ کوئی بڑا آدمی ہیں۔ بس قاضی صاحب نے ہمارے ہاں کے ممبر صاحبان میں دیکھے ہوئے۔

وہ ہمیں اپنے ساتھ اپنے ڈیرے پر لے گئے پارلیمنٹ ڈاؤس سے ہو کر گئے۔ یہ بہت بڑی عمارت ہے جو چادوہ جلال لاہوری کی ہانگورت میں ہے۔ ویسا تو ہمیں اب تو پارلیمنٹ کا چال چل بھی بس دور سے نظر آتا ہے۔ دم بخور کر دینے والی کیفیت اب آدمیوں اور عمارتوں میں ختم ہوتی جا رہی ہے۔ پارلیمنٹ کے دفاتروں میں قاضی صاحب سے غیر معمولی سلوک نہ کیا گیا۔ کرسی تک نہ چلی کی ٹیٹا ان کو ان کے دوستوں کو کہتی ہیں ایسے لوگ والے منہ میں گئے۔ لفت والے نے بھی انہیں کوئی لفت نہیں کرائی۔ ہم ان کے فلیٹ پر پہنچے۔ یہ بھی کوئی خاص جگہ نہیں قاضی صاحب کا رہن سن اوسط درجے کے آدمی والا تھا مگر یہ طور پر حکومت کی ساری سولہوں کے باوجود گزارا مشکل سے ہو رہا تھوڑی سی تکلفی سے اس شخص نے نہ جانے والی باتیں بھی بتادیں قاضی صاحب بھارت کے مسلمانوں کے مستقبل سے پر امید تھے ان کے بھارتی مسلمان اب پائینٹلٹ ہے۔ پارلیمنٹ کے مسلمان ممبران نے ایک بار واشت مسلمانوں کے مسائل و معاملات کے بارے میں پوچھی دھ حکومت کو پیش کی ہے۔ ایک ممبر پارلیمنٹ سید شتاب الدین ہیں جو بھارتی مسلمانوں کے مفروضہ امتحان اور صمان قاعدہ کے طور پر ابھر رہے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں ہندوستان میں قائد اعظم مٹانی کہتے گئے ہیں۔ حکومت ان سے کچھ خوفزدہ ہے۔ خوفزدہ آدمی سے ظالم کوئی شے نہیں ہوتی۔

شباب الدین 'امیر' بیگ سیمٹھ اور قاروق عبداللہ قدرت و سیاست کی ایک ٹھکان بنائیں تو یہ ایک نئی مسلم ریاست کا نقشہ ہو۔ نقشہ تو بنا ہے نقشے میں منظر پر کاروبار بن جاتا ہے۔ انہی منظروں سے کوئی آدمی نکلا گیا آدمی۔ بھارت کے اندر اس ریاست میں قاضی صاحب کا کیا کردار ہو گا۔ اس کیلئے ہمیں ان کی گلی

کتاب "مختار کرنا ہو گا" تمہات کے بعد "انہوں نے ہمیں بہت نظمیں سنائیں یہ کمال کی چیزیں ہیں۔ کسی میں شعرے بازی بلکہ کوئی بازی مگر نہیں۔ ایک شاعرانہ احساس میں پروئے ہوئے لفظ جو سیاسی قصائیں سنائیں لیتے ہیں۔ سیاسی تاثر کو اپنے جہان میں سنائیں نہیں لینے دیتے۔ ہندو مسلم مساوات پر ایک نظم میں شاعر یہ پتہ ہی نہیں چلے دیتا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ ایک بھارتی مسلمان سیاست دان شاعر کا یہ غیر متعصب سیکولر تھقی اعجاز کسی بڑے نتیجہ کو نوٹیں سامنے لانے والا کیا یہ تعجب نہیں کہ آپ اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ غیر متعصب ثابت کرنے میں لگے رہیں۔ قاضی صاحب کی شاعری اس زیادتی سے بھی بچی ہوئی ہے الگ۔

عطا کی عطائیں

ہم کئی قصائیں تھے دلی کی کچھ آبادیوں میں یہ عطائیں بہت ہے۔ بھتی حسین نے بتایا کہ ابھی اندر گاؤں میں یہاں تھیں زیم دور سے بھی اس سندھ اور مہمان ہندو عورت کے درشن نہ کر سکے۔ اس سے ملنا یہ مشکل نہ تھی۔ اس کے بعد پاکستانی انٹیلی جنس والے ہمارا یہاں ضرور مشکل بنا دیتے۔ اس سے نہ مل سکے کا ذکر ہے۔ بھتی اور عطائیں جانا چاہتے تھے بھتی کے سکون پر ایک ہی آدمی جیسے سکتا تھا میری وجہ سے بھتی کا سکون ہمارے رکشے کے ساتھ دوڑ لگا تھا ہمارے لیے کہیں منتظر یعنی بیکار کھڑا کرنا نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میری وجہ سے عطا اور بھتی کی پروگرام چھوڑ بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر کبھی کبھی ایک ہی جگہ پر پریشان ہوئے۔ بعض اوقات ان کا سفر مرے رستے پر رُک گیا۔ کئی دفعہ انہیں اس لئے بھی رکنا پڑا کہ میں ان کے ساتھ آلوں۔ ایک سست دوسرا بھی دوسروں کی جھلک بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔

مجھے بھی ساتھ ہی لے لو مگر نہیں یا رو
میں سست رہوں تمہاری جھلک بڑھا دوں گا

اکٹھا سڑک کرنے میں طاقتور ہیں نقصان بھی ہیں۔ میرے لئے فائدہ ہے ہی فائدہ ہے۔ عطا کا نقصان بھی ہوا۔ یہاں بھی عطائی دوستان اور مخالفتیں خود بخود مرے نام ہو گئیں۔ میں اس لحاظ سے بھارت کے اندر بھی پاکستان ہی میں تھا۔ پاکستان میں بھی ہم بہت سے رستوں کے ساتھ ہیں۔ عطائیں کیلئے جہتیں جہتیں آسانی سے میرے آئے والی ہوتی ہیں میں رستوں سے چار کر لے والا اگر دو غبار میں اترتا رہے والا آدمی ہوں۔ میرے لئے منزلیں بھی رستوں کی طرح ہیں۔ عطائیں کیلئے رستے بھی منزلوں جیسے ہیں ہم کہیں اپنا اپنا سفر بھی اختیار کرتے رہے۔ میں نے عطائی شہرتوں سے استفادہ کیا عطائے میری گمانیوں کی قدر نہ دھائی۔ زیادہ وقت مشہور لوگوں کی محفلوں میں گزر رہیں گمان آدمیوں کی تلاش کی خوابشوں میں بھی سرگرداں رہا۔ میں نے زیادہ لوگوں سے عطائی معرفت مل لیا۔ وہ میری وساطت سے کسی سے نہ مل سکا۔ میں نے اس کی آنکھوں سے بہت سخیوں کو دیکھا۔ مرے منظر اس کی نظروں سے محروم رہے۔ میرے کئی منظر میری اپنی آنکھوں سے اچھل جاتے ہیں عطائیں کیلئے رستے کی دشاریوں کے سوا کچھ نہ تھا میں ان کیلئے اس دھم کی طرح تھا کہ کہیں میں دل شکست نہ ہو جائیں اس دھم کو مجھ میں نے بھی ہوا دی۔ آخر وہ عطائے کا دست ہے۔ محبت اور مروت کی رسی سے بندھا ہوا آدمی جہاں تک رہی دروازہ کرنے کا معاملہ ہے تو وہ ابھی ایک حد

کفونت رائے کی محفل ذکر

چند قندھوں کے فاصلے پر ایک بڑا سا چھوٹا دار گول پکڑے اس کا نصف پکڑا کر میں کھڑائی تھا کہ سائے کفونت رائے کا کھنڈ نظر پڑا جہاں عقیدت مند اور ضرورت مند ان سے ملاقات کرتے ہیں۔ میل جی کے دو تاجا دوو مانے ہوئے ہیں۔ وہ ان کا بہت عقیدہ تھا اور معترف بھی۔ اعتراف اعتقاد کے بعد بو تو بڑا کھانا پڑے۔ رٹنے کے بعد چائنا آسان ہو آئے یہ سیمان خانے میں دو چار ہندو اور سکھ پہلے سے بیٹھے تھے ایک مسلمان بھی تھا جس کے ساتھ خاص طور پر میرا تعارف کر آیا کیا پھر اس مسلمان شخص نے کفونت جی کا تعارف اور تعریف شروع کر دی شروع رکھی۔ میں بہت متاثر ہوا متوجہ بھی ہوا۔ متاثر ہونے سے پہلے متوجہ ہونا بھی بات ہے شاید۔ یہاں مجھے عورتیں نظر نہیں آئیں۔ یہ بھی تعجب کی بات تھی پھر وہ فقیروں کے آس پاس غور میں نہ ہوں تو وہ پھر فقیر کیا ہوئے۔

کفونت جی دوسرے کمرے میں کسی کیساتھ مصروف تھے۔ واقعی مصروف تھے کہ ان کی باتیں کرنے کی آواز نہیں آرہی تھی تھوڑی دیر بعد وہ آئے تو بہت متوجہ ہوئے۔ دیکھنے سے لگے 'مجھے میں مالا' کندھوں پر چادر ڈالی ہوئی انھوں سے اوپر دھرتی 'جہیز بھی سفید چنی دووہ' جو ان کے ساتھ لے گئے اور چنی ہو رہی تھی۔ لباس کے لحاظ سے کفونت جی مسلمان لگے طہارت اور سادگی برابری۔ انہوں نے باتیں بھی مسلمانوں کے انداز میں آغاز کیں۔ ایک دو دو دفعہ مجھے ڈر لگا کہ ابھی وہ مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دے ڈالیں گے۔ کہنے لگے 'مذہب ایک ہے مقصد الگ الگ ہیں' ذکر غلطی بات کرتے کرتے حرا تے کتہ پہنچ گئے۔ حرا تے کی حالت میں پہنچ گئے ایمان کیا کہ ابھی وہ ایک کھنڈ کر بھی گے اور یہ کہ ذکر کا مقصد باطن کو چمکانا ہے۔ صحت سکون عرفان اسی عمل سے حاصل ہو گا۔ دل کی صفائی گھر کے آرام اور سانس کے امن کیلئے ہے حد ضروری ہے۔

لوگ بڑھتے جا رہے تھے کفونت جی کے سامنے والوں میں ہندو سکھ اور مسلمان بھی مذاہب کے لوگ ہیں۔ ان کے بغل صوفی سوامی اور سادھو لوگوں کو خود بخود منزل پہ پہنچا دیتے ہیں بس ان کے ساتھ راہیل پکا ہوتا چلنے اور اعتماد ہوتا چلنے۔ کم از کم اتنا اعتماد جو زمانہ پر ہوتا ہے کہ وہ منزل مقصود پہ پہنچائے گا جیسی تو ہم کر رہے ہیں اور چپ کر کے سوار ہیں بن جاتے ہیں مگر بہم رو جاتی گرد و آلودگی اجاڑ نہیں کرتے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں اپنی آنکھوں میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے رائے جی کہہ رہے تھے۔ مسافر کا کام سفر ہے آپ دیکھیں جودہ جہاں ملتا ہے نہ چلا سکتا ہے نہ اس کی فنی بات کیوں کو چھوڑے مگر اس میں بیٹھ جاتا ہے اور جہاں جاتا ہے پہنچا دیا جاتا ہے۔ آپ ہمارے جہاز پر بیٹھتے تو کسی پکار دیکھتے کیا ہوتا ہے۔

تک و چیل دیتا ہے۔ کوئی اور اس معاملے میں کتنا فاض ہو سکتا ہے۔ عطا میرے لئے بہت سی جگہوں پر جا سکا۔ میں اسے کیا بتاؤں کہ میں بھی بہت سی جگہوں پر نہیں گیا۔ خالی جگہوں پر پروان آبادیوں میں کھنڈ ہم بستریوں میں اور کئی ایسے لوگوں سے نہیں مل سکا جو خالی جگہوں گناہم بستریوں جیسے ہوتے ہیں مگر یہ بھی ہوا کہ عطا کی جگہوں پر صرف مجھے لے کر گیا میرے ساتھ گیا میرے ساتھ گیا جہاں دو پہلے بھی جا چکا تھا۔ یہ اس کی دوست داری تھی شاید یہ دوسری تیسری ملاقات اس کیلئے ضروری بھی ہو۔ کئی آدمیوں سے انسان بار بار ملتا ہے ملنا چاہتا ہے کچھ جگہیں اچھے دوستوں اور ضروری آدمیوں کی طرح ہوتی ہیں۔

ہے۔ ایک آدمی جو مسلمان یا ہندو نہیں اور بھگت ہے کہ وہ ہے تو آپ اس کا کیا کریں گے؟
"اس کیلئے ذکر سے بڑا علاج کوئی نہیں"

"وہ ذکر ہی نہ کرے تو بچہ"

"چچہ آپ خود تو ذکر کرتے ہیں کتنے ہیں کتنے جاپے اس پر اضر ضرور ہو گا"

اس بات کا ترجمہ ہو گیا پہلے میں نے جب کہ شروع کیا تھا تو اسی طرح کیا تھا کیونکہ جی ذکر اور سنت کو ایک شکل میں پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے ذکر یعنی سنت کے ذریعے طاعن معالجے کے کچھ واقعات سنائے جنہیں دوسرے لفظوں میں کرامات کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک مینیکل کا بی بی طالب علموں کی دعوت پر صرف ذکر اور توجہ کے زور پر کئی مہینوں کے بلڈ پریشر میں واقع کر دی فلاح دور کر دیا۔

مجھے بھی ایک نسخہ دیا کہ رات کو پانی سے غریبوں کو اپنے سرانے رکھیں اور اسے لی میں سے کسی ایک کا ذکر کرتے کرتے سو جائیں پھر صبح کر وہ پانی پیئیں شفا پٹنی ہے۔

میں اس آدمی پر کیے اعتبار نہ کر لیتا کہ وہ اپنا ہندو ہونا مجھ پر ٹھوس نہیں رہا تھا حالانکہ میری خواہش تھی کہ وہ ہندو مت کے پر اسرار روحانی مجددوں سے بھی کچھ پروا نہ اٹھائیں۔ میں ان سے اسلام سیکھنے نہیں کیا تھا یہ بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ پر چھا جانے کے زعم میں تھے مجھے اتنا پتہ مل گیا ہے کہ ہر آدمی کے پاس کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ وہ اس کی نگاہ گلیوں میں بکھر جاتا ہے بالیکسی رنگ میں دنگ جاتا ہے۔

ذکر شروع ہوا ساتھ کے کمرے میں سب لوگ بیٹھ گئے۔ کمرہ گھبرا گیا۔ ہندو سکھ اور مسلمان۔ اور بھی بندہ ہوں والے ہوں مجھے خود کو ڈیوٹیلٹر نہیں کیا تھا انہوں نے۔ سب لوگ بندہ کمرے میں آنکھیں بند کر کے بیٹھے۔ ایک سرایت کرتی ہوئی خوشی کے کعدہ ٹھونکنے کی آواز جھونکی

بے حس و حرکت بیٹھے دل پر

میں منتر سننے کا خضر تھا خواہش مند بھی تھا۔ اور جس بات ہم اللہ سے شروع ہوئی تیرہ واقعہ کے بعد تو کئی ایسی باتیں پڑیں۔ کھوت جی نے "مجھے بھی نہ آتی تھیں۔ وہاں موجود کسی مسلمان کو زبانی یاد نہ ہوں گی پھر اللہ کے نام کی شرب پڑی پر پرامنوں اللہ اللہ اللہ اللہ کی آواز کے شفاف راز سے چٹک تھا یہ بالکل ایسا ہی ذکر تھا جو میں چکا راہ "منارہ اور چکا راہ میں جا کر مسلمان صوفیوں کی مجلس میں کیا کر تھا۔ اب انیسویں میں بھی کبھی کر رہا ہوں۔ میرے لئے آج بھی توجہ کا گم نہ کھنا مشکل ہے بڑھ مشکل پڑا بیسی میری مشکل ہے۔ اس گرجے میں ہر طرف سے خرچے پر ناز ہو کر خود سے بھی غافل ہو کر جیسا پڑتا ہے اور میرا ذہن میرا دل بھی غافل ہو جاتا تھا۔ مجھے ذکر سے کچھ خاص مرتبہ مقام حاصل نہ ہوا تھا۔ اب کیا ہوتا۔ شاید کچھ ہوا ہو اور مجھے معلوم نہ ہوا اصل خیریں بے خبری میں پائی جاتی ہیں بے خبری سب سے بڑی خبر ہے۔

میں نے دل ہی دل میں کہا ہمارے پاس تو بس کے سفر کا کرایہ بھی مشکل ہے ہوتا ہے اور پھر بس ڈرائیور کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ سیوے جنت میں جائیں گے۔ جب ایک ڈرائیور اور ایک پاپ صاحب کا حاملہ جنت دوزخ کے فیصلے کیلئے فرشتے کے سامنے پیش ہوا تو اس نے پاپ کو دوزخ اور ڈرائیور کو جنت میں بھیجے کا حکم صادر کر دیا۔ اس فیصلے پر پادری کو مت غصہ آجاسے نہ کہا کہ جناب! فرشتہ صاحب! میں نے ساری عمر اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا بس ڈرائیور نے سوائے گناہوں کے کچھ کیا ہی نہ ہو گا پھر کچھ یہ ڈرائیور ان اپنے عزیزین کنڈلوں کے ساتھ کرتے ہیں اس حساب سے کنڈلوں کو جنت میں بھیجا جاسکتا ہے کہ کچھ تکلیف قانونوں نے برداشت کی ان ڈرائیوروں کیساتھ تو یہ زیادتی ہے کہ انہیں جنت میں بھیجا جائے۔ غصہ ہے کہ وہ مارے حیرت کے پھر نہ مر جائیں فرشتے نے ساری تقریریں سن کر جھلی لی اور کہا کہ

تم سو لوگوں کی تقریریں سن کر تم لوگوں کا بھی یہ حال ہوتا ہو گا وہ زیادہ سے زیادہ جہلیاں لینے ہوں گے یا فرما لیتے ہوں گے اور یہ ڈرائیور صاحبان! اگرچہ اور خطرناک ڈرائیور تک کہ میں تو بس میں بیٹھے ہوں لوگ نہ صرف انہوں سے تو یہ کر لیتے ہیں بلکہ زور زور سے خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں مثلاً خدا کی یاد ہے سو یہ کام ان گناہ گاروں نے تم کیلئے کاروں سے زیادہ کیا ہے۔

تو کھوت جی نے کہا کہ نظر مت پڑ کر رہتی چاہئے جیسے میں جتنا ہوں اور پاکستان جا کر بھی جتنا چاہتا ہوں کہ انہیں توبیح طریقے سے ذکر کرنے کا طریقہ بھی کسی نے نہیں سکھا یا۔ راستہ ہی کی یہ بات سن کر میں بہت گزبوا دیا کہ میں ایک زمانے میں ذکر کرشم بہت جبار ہوں تھے بہت بے تاب ہو گیا کہ کھوت جی کیسے ذکر کرتے ہیں مجھے پھر شک ہوا کہ یہ شخص اندر سے ضرور مسلمان ہے۔ ہندو بنو یا بے خدا کی یادوں میں جگانے کیلئے ڈرائیور بن جاتے ہیں کیا ترجیح ہے انہوں نے کہا

"دنیا میں چار بڑے مذہب ہیں اور سب سے پہلے اسلام کا لیا پھر ہندو مت" بدھ مت اور عیسائیت کا"

پھر بھی کہا

"یقیناً وہ امت کے حوالے سے مسلمان پہلے نمبر پر آتے ہیں پھر سکھ پھر ہندو پھر عیسائی"
میں متاثر ہو کر متحجب ہو کر ہاتھ کو ہول پڑے

"اس حساب سے پہلے نمبر پر بچے سحر میں پھر جو ان اور اس کے بعد پڑے"

اب مجھے متحجب ہونے سے وہ خود بھی نہیں روک سکتے تھے وہی عبادت کی عادت آدمی کی فطرت میں موجود ہے اس کے لہریں سے فطرت کو فطرت اور لوگوں کو لوگوں کا مقصود ہے۔ یہ فلسفیانہ بات تھی لہذا اب سوال بلکہ اعتراض کرنے سے میں خود بھی اپنے آپ کو روک نہ سکا۔

"مدارج سی سی بات تو مشکل ہے مسلمان کو مسلمان کرنا اور ہندو کو ہندو بنانا تو جان بوجھوں کا کام

گھر میں رہتا ہے۔ ایک بھی سمت میرے آگے لٹ جتی تھی ہم ارادے باندھ باندھ کر نہایت کیا سوچ سوچ کر کیسے کیسے پاؤں نکل کر حقیقتوں کے شرک پہنچانا چاہتے ہیں اور میں کچھ سمجھتا ہوں اس طرح جانا آسان اور ممکن ہے جس طرح کہ تار منگھو بغیر اعلان کئے میں جیستہ ہے اور گھر پہنچ جاتا ہے حقیقت گھر۔ ہے دل سے گھر پہنچائی اصل حقیقت ہے ہم اپنے گھر جا کر بھی گھر نہیں پہنچتے۔ اپنے گھر میں بے گھر۔ حقیقت معلوم کر کے بھی ہے حقیقت۔

گھر کی جانب جانے والے راستوں جیسے وہ

منزلوں سے پیشتر ہی منزلوں جیسے وہ

منزل بھی گھر ہی ہوتا ہے۔ ہر شخص کا پناہ گاہ ہے۔ ایک چابی کماؤت ہے کہ دوست کے گھر کی طرف چلتے رہو ورنہ خود رو گھاس سے سناٹا اٹھے گی۔ بھارت میں میرے ساتھ ساتھ انٹیلیجنٹ و سوسائٹی خاندانوں کی گھاس سڑ کر رہی تھی۔ مجھے لگا کہ میں گھاس میں راست بنانا کر چل رہا ہوں میرے بھارتی دوست بھی ایسے ہی، ستوں پر ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی طرف جا رہے ہیں اور گھاس بڑھتی جا رہی ہے۔ کہیں کہیں یہ خار دار بھی ہو رہی ہے۔ کچھ اسے پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں بھارت میں اس گھاس سے گھاس کا کام بھی لیا جائے گا۔

مجھے بس پر نہایت بونے سردار کر تار منگھو بندہ کنڈلڑے اچھے ہڈا اور کنڈلڑے فعدہ مجھ پر نکالنے کے موزوں آگیا ہیں میں خوش تھی لوگ بہت پر سکون ہو کر بیٹھے ہوئے تھے نہ حکم پیل نہ جینے جھانڈ میں دھم پیل اور چھینے جھانڈ کے خلاف میں مگر ہمارے شروں میں تو یہ نری فضاء گردنی اور بد معاشی ہے۔ ہمیں اعتراض ہے اس پر عورتوں اور لڑکیوں کو بھی اعتراض ہے اسی پر۔ اس میں جو حال تھا تو نہایت گھاس روم میں کیا حال ہوتا ہو گا۔ بندہ لوگ اسے شریف ہو گئے ہیں انشا شریف ہونا تو بھی علامت نہیں۔ کوئی کسی سے بات تک نہیں کر رہا تھا یہ بے تکلفی کی حد ہے شاید۔ کنڈلڑے اتنا تعلقات خراب کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کر رہا تھا۔ میں بھارت کے دو تیرہوں کے علاوہ کنڈلڑوں کا بھی معترف ہو چکا تھا۔ گھر پر کوئی پاکستان سے منسلک کیا ہوا کنڈلڑ لگا تھا۔ میں نے سب سے نکت لیتے ہوئے یاد دلایا کہ مجھے ساؤتھری سینا جانا ہے قاس نے مجھ سے دیکھا جیسے کہ رہا ہوا تھی نکلاؤں ہم اور دو کام نہیں کر سکتے۔ اب تو تنخواہ کا ذکر گالی سے کم نہیں سمجھا جاتا تو یہ کی آہنی کے چرے ہوتے ہیں ہر طرف۔

تیسرے سناپ پر ایک عورت میرے ساتھ کی سینٹ پر آگئی وہ اپنے کندھوں کی طرف منہ کی تھی۔ اس حال میں بھی وہ ان عورتوں میں سے تھی جو بری نہیں لگتیں۔ وہ اپنے پیٹ پر اپنے کندھوں جیسی جگہ جگہ سے چلتی ہوئی اس کی سلازمی۔ اگر وہ اب سلازمی تھی تو بڑے سوار اس میں دروازوں اور کنڈلڑوں کا کام دے رہے تھے۔ ان میں سے اس کا کنڈلڑ (جسم) کسی دور دراز کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے پنڈ (گھوڑوں) کی جھنک مار رہا تھا۔ صفائی ستھرائی ہو جاتی تو یہ بستی ابھی تھی۔ اس نے ایک بچہ اٹھا یا ہوا تھا اس

ہم عمری اور ہم سفری کے منے

مستی ہوئی شام میرے پاس کڑی تھی 'سانے گول پکر کے گلشن میں قید چھول خوشبو کو آزاد کرنے کیلئے قفس کر رہے تھے۔ جیسے ذکر کر رہے ہوں۔ ذکر سے خوشبو نہ پیدا ہو چیلے نہیں تو پھر اس تکلیف کا کھنسی کیا ذکر اور قفس میں کیافق ہے۔ مختصر اور سلیقہ سلیقہ بھی ہوتی ہے۔ صوفی ذکر کی مشق پاؤں کرتے ہیں کہ وہ وجود میں کل روح میں سرایت کر جائے۔ آدمی جیسے دھمال والے والے تھک کر چر رہا ہو جاتا ہے جیسے آدمی سانس لیتا ہے جیسے اس کی رگوں میں لودوڑا ہے۔ بس ذکر ہو جیسے آدمی روز مرد کے کام کر رہا ہے۔ بغیر ارادے کے بغیر کوشش کے۔ ایسے کام کیلئے بہت محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ ایسی کوشش کہ وہ کوشش لگے بھی نہیں عذر اور یاد میں فرق مٹا جائے ذکر تو کتنے ہی یاد گو ہیں

میں دو در زخمی تھی یاد آوے

میں چڑخ کنڈلڑ تھی یاد آوے

کہتے ہیں ذکر کر نہ والے کھاتے ساری کائنات اور جو کچھ کہ اس میں سب ذکر کرتے ہیں۔

الفاظ چھینے دی ہوئی میرے من وچ مرثیوں کا ہو

فکارت کرتے ہیں آج کل لوگ کہ اس عہد میں مرثیہ نہیں لکھتے۔ میں لکھوں کہ مرثیہ بھی کہاں ملتا ہے بھارت میں بھی مرثیوں جیسا کوئی بندہ ہو گا۔ کیا کسی عورت میں بھی ایسا آدمی ہو سکتا ہے میرا جواب نفی میں نہیں پہلی ملاقات میں ہر ابھینی عورت وہی عورت تھی ہے پھر اس کے اندر بہت سی عورتوں میں وہ عورت تم ہو جاتی ہے۔ میں نے کئی عورتوں کو بھی اس عورت کی تلاش میں دیکھا۔ ابھی ایک کار میں اس عورت کو میں نے دیکھ لیا تھا اور میرے اندر وہ دم چاڑھ کر کہ کاروں میں بھی ایسی عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو اس وہم نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میرے دل میں وہم نہ پیدا ہو تو وہ عورت وہی عورت ہوتی ہے اس کے وہم کے ہاتھوں کئی عورتیں تھیں، بندے گم کر دیتے ہیں۔

سردار کر تار منگھو میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا جس طرح دور ان ذکر وہ میرے ساتھ جیتا تھا میری کشا پکڑ کر ساؤتھری چھیننا چاہتا تھا۔ سزاوری نے مجھے بس پر چالنے کا مشورہ دیا میری چالنی ہے۔ میں لاہور میں بھی کبھی کبھی اس کی سڑ کر رہا ہوں۔ ہم لوگ چار فرانک کے فاصلے پر دوسرے سناپ تک جانے کو بھی سفر بولتے ہیں۔ بس میں سفر کا مزہ یہ ہے جیسے ہم پورے شہر سمیت جا رہے ہوں جیسے ایک پورا مکان (کوٹھڑ) چل رہا ہو۔ سردار میرے ساتھ بس سناپ کی طرف چل پڑا اس نے مجھے بتایا کہ وہ حقیقت

لے رہی ہیں۔ بھارت کے شہروں میں عورت اور مرد کی تخصیص بغیر کسی شعوری کوشش کے ختم ہو رہی ہے۔ تحریک چلا کر تو تقریباً ہی پیدا کی جاسکتی ہے۔ مرد اسے شریک حیات بنانا چاہتا ہے وہ اسے دشمن فریق بنانے پر ترقی ہوئی ہے پاکستان میں چند عورتیں ساری عورتوں کی نمائندہ رہنے کی کوشش میں برادران فحیوں کے خنڈ مردوں میں چند مردوں نے حاصل کر لئے ہیں۔

بہن اس عورت کی بے سانسنگی نے مجھے باقاعدہ کر دیا تھا ایسا لیڈر فرسٹ کا اصول ہے معنی ہوتا تھا عورت کے لئے اپنی سیٹ چھوڑنے پر کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔ جو عورتیں بھی مردوں کے پیچھے تکلفی سے کھڑی تھیں۔ ہماری عورتیں ہوتیں تو چلا چلا کر بس روکا لیٹیں۔ یہ کھڑی عورتیں اس سے بے نیاز تھیں کہ وہ کھڑی ہیں بی بی الحال مردان کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔ عام طور سے یہ بات بڑے مجاہدے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ حیرت ہے کہ بہنوں نے کوئی خاص مشق بھی نہیں کی اس سلسلے میں ہمارے ہاں عورت مرد کا ٹھکانہ بنا کر کچھ نہ ہوتا ممکن سمجھا جاتا ہے ہم اب بھی سمجھتے ہیں کہ عورت مرد ایک ساتھ ہوں تو وہ اور کچھ نہیں کریں گے کچھ نہ ہو ایسا تصور کر لیا جاتا ہے۔ آپ کا ہاتھ عورت کے جسم کے کسی عام سے حصے سے چھو جائے تو بھی دونوں طرف آگ لگ جاتی ہے۔ عورت اس جیدگی سے حریر لطف اندوز ہونے کیلئے آگ لگوا کر گالیاں دینا شروع کر سکتی ہے کہ وہ اس وقت اس کے علاوہ اور کچھ نہ نہیں سکتی۔ حریر حفظ مانتھ کیلئے گالیاں آپ کو کم اور لوگوں کو زیادہ سنائی جاتی ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنے آدھے سے زیادہ کام لوگوں کے ذریعے کرتے ہیں جو کام ہمیں کر سکتے وہ بھی اسی لئے نہیں کرتے۔ یہ کام بھی شہروں میں زیادہ ہے جہاں تعلیم کی شرح زیادہ ہے لوگ اپنے کو مذہب اور روشن خیال سمجھتے ہیں۔ دراصل میں محفوظ معاشرت کے سارے فائدہ ابھی تک زندہ ہیں نقصانات بھی ہیں ہم ہیں۔ شہروں میں صرف نقصانات ہیں۔ فائدہ ان کیلئے صرف وہ ہے جو کسی نہ کسی کیلئے نقصان ہو۔

مجھے بس میں سوائے کنڈکٹر کے سب لوگ اچھے لگے۔ ڈرائیور بھی کہہ اپنے کام میں مگن تھا اور وہ عورت بھی جو میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اس کی اور کچھ نہیں تھی لیکن اس کے ساتھ میری تصویر دیکھ سکتی تھی۔ یہ تصویر کائنات کی آنکھ میں محفوظ ہو گئی ہوگی۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں کتنے ہیں کائنات کی دستوں میں تصویروں کی طرح موجود ہے۔ سائنس دان بھی اس پر بھی قادر ہو جائیں گے کہ یہ سب مٹھ کر الگ الگ کمرے کی آنکھ میں آدھیں تو ہماری زندگیوں کا حال جب آنے والے دیکھیں گے تو ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ ڈرکس کا کہنا کہ تمام میں سب کچھ ہوں گے۔ نگاہوں سے کچھ سے کیا شرمانے لگا۔ میں نے سوچا کہ میں اس بارے میں اور سوچوں بھی تو اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ بہت کم کام بغیر سوچ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ میں ابھی بڑے کام کی بحث میں تھا وقت کٹا نہیں جاتا ہوں البتہ بہت سوچ کچھ کر کے کئے گئے کام بھی کام نہیں ہوتے۔

میں بھارت میں کسی خاص پروگرام کے بغیر آیا تھا اس میں تھا اس لئے مجھے اس کی فکر نہیں کہ میرا یہاں ہونا کسی آنکھ کی گود میں ہے یا نہیں اور اس میں سڑ کر نہ مارے میرے ہم سفر ہیں یا نہیں۔

کیرن کو کچھ کہنا غلط لگا اس نے کچھ کاظم اعظم ہم جتنا تو ہو گا اس میں وہ وقت کہیں سوتی ہوئی تھی جو اعظم کے اندر ہوتی ہے جو اسے ہم بتاتی ہے۔ بھارتی حکومت ایسے بچوں کی کی نسلوں کو بچانے کیلئے کسی اعظم ہم بنانا چاہتی ہے اس نے کچھ کو اس جنگ تک زندہ رہنا ہو گا جو بھارت سارے ہمسایوں سے بیک وقت شروع کرے گا۔ وہ یہ ہم اس بچکی حفاظت کیلئے تیار ہے۔ ورنہ اتنا خرچہ اہوا لیا اور ضائع ہو جائیگا۔ اسی کثیر رقم سے اسی اتنے بچے نہیں بچ سکتے کہ اس بچے کیلئے کا کھانسی کی گولی کا تیسرا حصہ خرچہ کیا جاسکے جو اسے آسانی سے مرے میں نہ دے۔ بچکی کا کھانسی اس کے وجود سے ہماری تھی۔ ایسے میں لے ماں کیلئے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ کنڈکٹر عورت کو کنکٹ کے پیچھے ہاتھ ہونے دیکھ رہا تھا۔ عورت بری طرح چپ تھی دوسرے لوگ بھی چپ تھے کنڈکٹر کی موچیں ڈراہڑی تھیں اور وہ شکل سے جن سسٹم لگتا تھا۔ عورت کی حالت اب اس کے بچے سے مختلف تھی جیسے چور بھارت میں ماں اس بچے کے اوپر آ کر ہو۔ میں نے کنڈکٹر کو اس کے کرائے کے چند پیسے دے دیے تو اسے اور فخر آیا کہ اسے مرداری سے بھڑکتے والا فخر بھی یاد آ گیا تھا اس نے مزید پیسے کے اعلان کے طور پر پیسے نہیں لئے جیسے میری یہ حرکت پورے بھارت کی توجہ تھی جبکہ میرا ایسا کوئی خیال نہ تھا۔ ایک قمر آؤد نظر کے علاوہ اس نے مجھے کچھ نہیں کھد عورت کو بھی صرف یہی سزا دی اور آگے بڑھ گیا اس عورت نے میری طرف میں نے اس کی طرف دیکھا نہ دیکھنے کی طرح۔ دیکھنے اور دیکھنے جانے کی بے پناہ خواہش کیساتھ۔ یہ عمل یاد رکھ لو ایک دوبار ہو کر کنڈکٹر کی نظروں سے جتنا میں چھپ رہا تھا اس سے کہیں وہ نیچے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈرکس کو اس بے بخت عورت کے پاس کوئی ناٹ کوئی سالن نہ تھا۔ اس کی بے سرو سامنائیاں اس کا سامنا تھیں جب کنڈکٹر ایک اور سوار پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا میں نے میں روپے کا نوٹ اس عورت کی طرف کیا اس نے یہ نوٹ بھی اپنے کمرز بچے کی طرح سینے سے لگا لیا۔ میری طرف پہلے سے ڈرا مختلف طرح دیکھا اور اگلے شاپ پر اتر گئی۔ جیسے چوری کا مال اس کے ہاتھ آ جاؤ اور چھین لئے جانے کا ڈر بھی ہو۔ جانا تو سہرا مال آگے تھا یہاں تک تو وہ پیل چل کر بھی آ سکتی تھی نہ یہ شاپ اس کا گھر تھا نہ آگے کہیں اس کا ٹھکانہ تھا۔ سارا بھارت اس کا گھر تھا تصویر لائی جا رہی تھی انہر جاؤں۔ میرے فیصلے سے پہلے ایک اور عورت میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی جیسے میں بیٹھا ہوا ہوں نہ تھا میں گھر آیا کہیں یہ لیڈر سیت تو میں لیکن وہاں کوئی ایسا اشارہ نہ تھا وہ اپنے قیمتی نئے کپڑوں جتنی اچلی نہ تھی جتنی بلی نہ تھی میں نے سوچا کہ پہلے والی جو عورت تھی لیڈر میں پاکستان میں بھی مردوں کیساتھ بیٹھ رہتے ہیں کچھ محسوس نہیں کرتیں یا محسوس نہیں کرتیں غریب ان پر ہنچاؤ عورتیں کسی غیر احساس کی ملاوٹ کے بغیر کام کرتی ہیں وہ اپنے عورت ہونے پر کا نشس نہیں ہوتیں۔ یہ کیپٹنس تو ہماری امیر ماڈرن ایڈوانس وائس لبریشن والی پر بھی کمی لیڈر ترقی یافتہ ترقی پسند عورتوں کو تو ہے۔ وہ بہت سے کام انتہا کرتی ہیں جان پر بھر کر۔ اس طرح اچھا کام بھی غلط کام ہو جاتا ہے۔ جوش و خروش کی بیوشی میں انہیں یہ بھی احساس نہیں رہتا کہ وہ یہ سب کچھ کر کے انتقام کم سے

بال ہاں بھئی یہ لاہور پاکستان میں ہی ہے نا۔"

میں اس اطلاع پر اور حیران ہو گیا۔ مجھے لگے کہ لاہور آج پاکستان میں شامل ہوا ہو۔ یہ پہلی خاتون تھی جس نے اس طرح پاکستان کی بات کی تھی۔ ورنہ ہر کوئی اپنے شہر کو یاد کرتا تھا۔ جس طرح کوئی دلی میں اپنے شہر کو یاد کرے۔ جس طرح میں لاہور میں میٹروپولی کو یاد کرتا ہوں۔ عام طور پر شہری اصل وطن ہوتے ہیں۔ کچھ شہر ب کاوطن ہیں۔ مکہ مکرمہ لاہور کراچی جہاں کہ دلی نکلتے تھیں کابل کرا بلخ انداد قاہرہ جینوا استنبول پکنگ جس لندن نیارک ہانکو۔ شہر اپنے ملک کا نمائندہ ہوتا ہے ہر ملک کا نمائندہ ہوتا ہے۔

وہ بھی میری ہم عمر تھی۔ میں پاکستان کا ہم عمر ہوں تو وہ بھارت کی ہم عمر تھی۔ ایک اور طرح کا تعلق پاک بھارت کے جوان لوگوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ ان کے لئے بھارت وہ بھارت ہے جو ۱۹۴۷ء میں بنا تھا۔ یہ قدیم ہند کی تہذیب اور تاریخی اہمیت کا مستحق ہوں جس طرح پاکستان کے عقب میں مسلمانوں کی پوری تاریخ جلوہ گر ہے۔ میں مسلمانوں کی تاریخ کو تاریخ اسلام نہیں سمجھتا۔ وہ تاریخ عقب در عقب کہیں اور انھیں ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں دور دور تک جو متا ہے اس میں ہندو مسلم دونوں کے حصے ہیں۔ بھارت اور پاکستان پر لحاظ سے ہم میں تہذیبی ثقافت کے لحاظ سے اور سیاسی جدوجہد کے حوالے سے۔ جب اپنے اپنے ملک کے ہم عمر لوگوں کے پاس اختیار ہو گا۔ اور وہ فیصلوں کی پوزیشن میں ہوں گے۔ تو مجھے نہیں رہیں گے۔ کیسے نہیں رہیں گے۔ یہ بھی میں نے سوچا نہیں تھا۔ زاوی کے بھولی اب نہیں رہے دونوں طرف۔ جو تھے وہ زمین کی آزادی کو زمانہ کی آزادی پر ترجیح دینے والے تھے۔ میں نے لیڈر شپ کی کم عمری اور ہم عمری کا یہ فلسفہ اس کے سامنے پیش کیا تو مکمل انھی۔ اس نے فتنہ نہیں لگایا تھا۔ میں اس کے کا معنی نا پسندیدہ رد عمل سے خوش ہوا۔ اس نے مجھے کہا۔

"کوچھرم کسب پاکستان میں ہر اقتدار آ رہے ہو"

جب تم اپنے ملک کی ہر دھان زمین پر جاؤ گی۔"

اس نے فتنہ لگایا تو پوری بس کے اندرون میں مکمل گیس نے آہٹیں لے لیں اس کے کان میں کہا۔ بات کان میں سننے کے لئے خطرناک حد تک قریب قریب ترلے قریب ہو جاتا ہے۔ اس عمل میں بعض اوقات قریب کا لفظ پیچھے ملکہ دور در دور جاتا ہے۔ اس خاتون کا رنگ سرخ نہیں ہو گیا تھا۔ نہ وہ شرمیلی نہ گھبرائی نہ ان دونوں اداؤں کی اداسی کی وجہ سے اس نے پاس پیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے میں خوار ہو کر بس کرنے کے تاثر سے نہ دیکھا تھا۔

"یہ ضرور چلی پاکستان کے سرخ خلاف ہے۔"

یہ بات میں نے کہہ دی مگر مجھے اپنی ٹیکہ بندی اور اس کی ٹیکہ دہی پر محروم سے کے باوجود غصہ سا تھا۔

اس نے زانیہ ناخیر کو میری بات سے آگے بڑھا دیا۔

وہ جو میرے ساتھ چلی تھی اس کے میرے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور مرانا پ قریب آ رہا تھا۔ جگہ کا پتہ نہ تو پورا پورا تھا کہ بعد اپنے شاپ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے اپنے ہم جنس سے پوچھا

مباران میں سے ساتری سنیما جانا ہے

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا میری ہم نشین نے مجھے تسلی کے سے انداز میں کہا میں اس سے اگلے شاپ پر اتروں گی۔ ساتری ابھی دور ہے۔ میں آپ کو تاروں کی۔

ہم جنس نے ہم نشست ہو کر بارش ہے۔ ہم بسز ہو پاس سے بھی بارش ہے۔ اس سے بڑھ کر ہمارا زور ہم سفر ہونے کی کچھ ہے ہر مگر الگ الگ منزلوں اور حقیقتوں تک پہنچنا چاہتے ہیں یہ ہو جائے تو سارے سسٹمی فتنہ ہوں کہ ہم ایک دوسرے کی منزل میں ایک دوسرے کی حقیقت ہیں۔ اتنی سی بات ہمارے مردوں اور عورتوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ دونوں کی حیثیتیں مختلف ہیں مقام ایک ہے۔ وہ اپنے اپنے رستوں پر چلتے ہوئے بھی ایک جگہ پہنچ سکتے ہیں الگ الگ سوجن کی وساطت سے ایک حقیقت کا اردا ک پاسکتے ہیں۔

اس عورت کے بالکل پاس بیٹھے ہوئے بھی اس وقت ابھی مجھے یہ خیال نہ آیا تھا کہ میں مرد ہوں اور وہ عورت ہے۔ اسے بھی یقیناً یہ احساس نہیں ہوا ہو گا اس وقت کہ وہ عورت ہے اور میں مرد ہوں۔ اس کے باوجود اس کے میرے درمیان ایک رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ تنازعہ پیدا ہوتا ہے جب مرد یہ سوچتا ہے کہ اس کی حیثیت ہے اور عورت خیال کرتی ہے کہ اس کے یہ حقوق ہیں (مرد اور عورت) اپنے حقوق اور اپنی حیثیت کا قیام کرتے کرتے جھگڑتا ہے۔ پھر جھگڑا دو جاتا ہے کچھ نہیں رہتا۔ عورت عورت نہ رہی تو کچھ نہ رہے گی۔ مگر یہ وقت عورت ہونے کا وقت نہ ہے نہ رکھا جائے اس کو۔ مرد نامرد ہو کر قہر نہیں ہے کچھ ہر وقت مردانگی کی وردی تو نہ پنے رہے۔ عورت اور مرد زندگی میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ زندگی کو اور زندگی کرنے کے لئے کسی کسی سے کیا کرتا ہے؟ یہ مل کر سوچنے کا کام ہے۔ عورت مرد مل کر جو جو کام کرتے ہیں ختمی میں انتہائی خفیہ اور ٹھکان ہو کر۔ حیرت ہے کہ اس کے بعد وہ مل جل کر دوسرے کام کیوں نہیں کر سکتے۔ مل جل کر کام کرنے میں جودلت ہے۔ اس سے دونوں واقف ہیں۔ پھر بھی ایک دوسرے سے واقف ہونے کو تیار نہیں ہیں نشست خاتون اور میں ایک دوسرے سے واقف ہونے کی کوشش میں مبتلا نہیں تھے۔ ایک دوسرے سے ناواقفیت کے باوجود آدمی ایک دوسرے کو محسوس کر سکتا ہے۔ ایک دوسرے کو محسوس کرنا ایک دوسرے کو جاننے سے زیادہ اہم ہے۔

واقفیت تو ایک مرحلہ ہے۔ وہ برقی

"میں پاکستان سے ہوں"

"پاکستان سے"

اس سفر میں اسے زور اور ایک ضرورت نہیں لیوگ۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ملک یعنی ہندوستان میں آتے ہیں میں بھی وہیں آیا ہوں مگر میں آج کے ملک بھارت میں بھی کچھ دیر رہنا چاہتا ہوں بھارت تم لوگوں کا ملک ہے ہندوستان ہمارا بھی ملک تھا۔ تقسیم ہند کی ہم عمر قیادت اور سیاست میں دونوں میں حقیقی مضمون یا ثابت دے گی۔ پھر یہ دونوں دوست ملک بن جائیں گے۔ یہاں آکر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہمارے تعلقات اچھے ہو سکتے ہیں۔ تم سے مل کر میری طرف سے تو مجھے ہو گئے ہیں تقسیم ہند کو اگر فائل سمجھ لیا جائے تو کوئی گزیر نہ ہوتی۔ اقبال نے کہا تھا ہم ہندو مسلم بھگوار فتح کرنے کے لئے پاکستان بنائے ہیں۔ قائد اعظم نے کہا تھا کہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات تاحقی آئندہ ملے ہوئے جتنے امریکہ اور کینیڈا کے ہیں۔ بھلا ہندو کیا کیا تھا؟ گاندھی کیا کیا تھا۔ اندرا گاندھی بھی۔ اگر بھارتی لیڈر بھی برصغیر کے لیڈر ہوتے تو آج ہندو کے باندی کیوں ہوتی؟ دونوں ملکوں میں جو آپ کے ہمسایہ ملکوں میں نہیں ہے باندی۔ اور وہ اپنے ملک کے شہری ہیں۔ ان لوگوں نے آپ کی تقسیم کو تسلیم کر لیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہر سال بھی پانچ چار سال تک دینا نہ تھا۔ ان دنوں لوگوں نے سرحد پار نہیں کی دراصل خون کے دریا جاری کر کے۔ دینے کی باندی تو ہمارے تحفظ کی علامت بنتی چاندیاں ہمیں ایک دوسرے سے بھارتی ہیں۔ وہ مجھے چپ چاپ دیکھ رہی تھی اور کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ "تو ختم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ دونوں ملکوں کے انٹلیجنڈر اور مستعد دانشور دہشتی چھیلا رہے ہیں۔ حکمرانوں کو تو اپنی حکومت قائم رکھنے کی فکر ہوتی ہے اور یہ صفائی اور دہشت گرد نہیں کیا ہو"

"قیادت اور صحافت بھی تو کمزور نہیں ہیں۔"

دہشت کاؤٹ ڈران چاہتی تھی

"پچھلے مسافروں سیاح میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

"وہی جو تم میں اور اس بس میں بھی دوسری عورتوں میں ہے؟"

"تم کیا کہو؟"

صبر سے اندازہ یہ دونوں ایک ہو گئے ہیں ایسا آدمی جس میں ملک میں ہوا اس کا شہری ہوتا ہے؟

"تم سے اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں جن میں اور بھی"

دو سیاست ہمارے درمیان کچھ ڈائیلاگ نہیں ہونے دیتی۔ ڈائیلاگ بھی نہیں ہونے دیتی"

"تم ڈائیلاگ صرف دوستوں سے کرنے کے حق میں ہو۔"

دشمن سے جب ڈائیلاگ ہو رہا ہو تو اس وقت وہ کچھ نہ دوست ہوتا ہے۔ اور عورت تو ہوتی ہی دوست ہے۔ جب اس سے گفتگو ہو رہی ہو تو بہت دوست ہوتی ہے۔ تم سمجھو لا بورڈ آؤ"

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر یہ سراسر فلسفہ دو گیا کیونکہ راجہ گاندھی چالیس برس کا ہو کر بھی تقسیم ہند کا ہم عمر نہیں۔ بھارتی سیاست میں اندر اپنے ناپ کی ہم عمر تھی اور راجہ دونوں کا۔ اس کا بیانیہوں کا ہم عمر ہو گا"

یہ بات اس نے ابھی سے اور میرے کان میں نہیں کہی تھی۔

بھارت میں موروثی جمہوریت ابھی نہیں گئی۔ وراثت ہمارے پاس مشرق کا اسلوب ہے۔ ہماری دنیا اگلی دنیا ساری دنیاؤں میں اس کے اثرات موجود ہیں۔ ان کی بیڑی ہواں کے بیٹے بھی پیچھے رہتے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک علی اور سین کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ حضرت محمد کے رشتہ دار تھے۔ اولیادوں کے بیٹے اولیا سمجھے گئے۔ حکمرانوں کے بیٹے تو حکمران تھے۔ اب بھی ہیں۔ پھر مسند نشین اور گلدی نشین میں کیا فرق ہو گا اور قیاد اور میرا سبیل کا بیانیہ میرا سبیل ہوتا ہے۔ فنی کا بیانیہ فنی۔ فنی افسر کا بیانیہ فنی افسر۔ موچی بانی کا بیانیہ موچی بانی ہوتا ہے۔ (بہت کم ایسا ہو گا کہ وہ کچھ اور ہو جائے) ملازم کا بیانیہ ملازم اور افسر کا بیانیہ افسر ہوتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے گدے کا بیانیہ گدے کا اور گھوڑے کا بیانیہ گھوڑا ہوتا ہے۔ جیسے بٹے کا بیانیہ بھینسا اور بھینسا کی بیٹی بھینسر۔ (اس معاملے میں بیٹے بیٹوں میں فرق نہیں اور نہ انسانوں اور جانوروں میں کچھ فرق ہے) ہمارے ہاں دوڑ کا بیانیہ دوڑ اور سیاستدان کا بیانیہ سیاستدان ہوتا ہے اور ان کا نظریہ اور موقف بھی باپ والا ہوتا ہے ولی خان غفار خان کا بیانیہ فضل الرحمن مفتی محمود کا بیانیہ نظیر بھٹو بھی بھٹو کی بیٹی بھینا ہے۔ فاروق عبداللہ شیخ عبداللہ کاکڑی کہ مسلمان کا بیانیہ مسلمان اور ہندو کا بیانیہ ہندو اور سکھ کا بیانیہ سکھ۔ یہ سب کسی اور گھر میں ہوتے تو سوچنے کو کیا ہوتے ہما نشین کا یہ معیار ایک بہتان کی طرح ہے۔ یہ بستان کہی بھی ایمان کی طرح پچا اور پکا ہوتا ہے۔ کبھی بھی مت کہی۔

میں نے محسوس کیا کہ کاشی اور میں پہلی ملاقات ہی میں آپ سے تم پر آ گئے تھے۔ ہمارے ہاں برسوں مردوں عورتوں کی گفتگو میں چلتی ہیں اور یہ مقام نہیں آتا کہ صرف انبار مل ہوئے ہوئے حالت دو معاملات کو جب سمجھتے ہیں۔ ہمیں انبار مل ہونا چھوٹا لگتا ہے کچھ معاملوں میں تو واقعی چھوٹا ہے۔ ہماری عورتیں اپنی تحریک کے دور ان انبار مل ہیں۔ وہ دیکھ بھی نہیں دیتی ہیں۔ وہ برسات میں انبار مل متان کی خواہش مند ہیں حالانکہ ہمارے ہاں آپ بکل شیت تانچ کا بیاد اور شوہر ہے۔ برت عورتوں نے ہمارے دوست زاید ملک کی حاضری کتاب شیت تانچ پڑھ رکھی ہو گی بک شیت اور انبار مل میں فرق رہا نہیں شاید اس کے علاوہ ان کا بیانیہ کچھ ہی میں پھلا۔ کوئی آدمی جب تک انبار مل جاہل نہ کر دیا جائے تم اسے بڑا آدمی یا چھوٹا آدمی یا پنا آدمی سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

"تم بھارت میں کس لئے آئے ہو"

"الفاظ تو تم نے" میں نے خدا کا کہا۔

اس کے کسی بھٹے بڑے درمل سے پہلے میں نے پوچھا کہ وہ مسکرا رہی تھی

"میں چوری دنیا کے سفر پہ لکھنا چاہتا ہوں مگر وہاں میں ہیں میرے پاس۔ بھارت میں آیا ہوں کہ

حُسن اتفاق جیسی عورت

سینہاواں تھا۔ اس پر جو لکھا تھا۔ میں بڑھ نہ سکتا تھا میں غور کرنے لگا کہ ساتری بندی میں کیسے لکھا جاتا ہے۔ وہی گمراہی تھی جو ہمارے لاہور کے کشمیری چوک میں ہوتی ہے۔ کبھی حسین نے مجھے کہا تھا کہ جو کندہ پال کا بیٹا میرے لئے سینما کے گیت پر گلوں گا۔ وہ بھی میرے لئے نہ پڑھا جائے والا لفظ تھا۔ مجھے دیر بھی ہو گئی تھی۔ میں دو ایک بار سست تھیں کرنے کی کوشش میں ادھر ادھر گیا۔ رستے میرے ساتھ کوئی آشنائی پیدا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ساتری میں فلم ہی دیکھ لوں اور چلا جاؤں۔ قریب ہی کار میں بیٹھنے ہونے شخص سے پوچھ لینے میں کوئی حرج نہ تھا۔

”مجھے ای۔ ۵۸۷ گریڈ کلاش نمبر دیا جاتا ہے۔ جو کندہ پال مشہور کمپنی بنگلہ کے گھر“۔

”کار میں بیٹھ جائیے“ اس نے گھارو راؤ کو بل دیا۔

میں ڈراما پیشان ہوا۔ کار والا ہے۔ جانے کہاں لے جائے۔ اور میں کبھی اپنے گھر نہ جاسوں۔ کامی کے گھر بھی نہ جاسوں جو پاکستان میں پیدا ہوئی تھی فلمیں چلا جاؤں گا۔ مجھے سمجھ دیجئے۔“

”مجھے سمجھنے ان کے گھر کا نہیں ہے نہ آسانی سے دھونڈ لیں گے“

”میں پاکستان سے ہوں ہی۔“

”مجھ کو آپ ہمارے صہبان ہیں۔ چلی بیٹھے۔“

میں بے فکر ہو کر بیٹھ گیا۔ کار چلا پڑی۔ اس نے باک بھارت تعلقات پر بولتے ہوئے مارشل لا پر اعتراض کیا۔ یہ اعتراض برائے اعتراض میں تھا۔ میں نے اعتراض کر لیا۔ اس نے اپنے ملک کے پاکستان کے ساتھ انداز سیاست پر بھی تنقید کی۔ وہ بھارتی حکومت کے اس واقعے کو نہیں مانتا تھا کہ پاکستان کے بھارت کو خطرہ ہے۔ یہ دیکھنا کہ جمہوریت کو سیاست کی جھینٹ چڑھانے کے لئے کافی ہے ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ڈر میں نہیں۔ گھرانوں کو ڈرانے سے منع نہیں کر سکتے۔“

میں نے اس کی مکرر تاکید کرتے ہوئے بھارت کے مستقبل پر اس کی رائے چاٹنا چاہی۔

”بھارت کا مستقبل اندھیرے میں ہے۔ ہندوؤں نے اپنے اسلوب حیات کو بھلا دیا ہے۔ اندھیرا اس لئے نہیں کہ خطا درستی کے اس صے پر چین بھارت سے بڑا اور طاقتور ملک ہے اور چمکنا ہے۔ بلکہ یہ کہ بھارت ایک نظریہ آنے والے خطرے سے سہوا ملک ہے۔ یہ اندھیرا اس لئے بھی نہیں کہ پاکستان بھارت کے سامنے چٹان کی طرح سینہ سپر ہے اور ہرمیدان میں اس کے مقابلے پر آیا ہوا ہے۔ بلکہ یہ کہ بھارت دھول کا قلعہ بننا چاہا ہے۔ بھارتیوں کے دل میں اپنی معاشرت اپنی تہذیب کے لئے کس مقابلے کی

تھا۔ میں بس سے اتر رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ وہ دو بجی لفظ بولتی وہی لفظ ہوتا۔ اس نے مجھے نمسکار کیا نہیں۔ صرف ہاتھ جوڑے۔ وہ عورت وہی لفظ تھی جس کے اندر معنوں کا جہان ہوتا ہے۔ نمسکار کا یہ قرینہ ہندو عورت کو سہاوتا ہے۔ وہ جیسی بھی ہو اس ادا کے ساتھ بندھ کر اچھی لگنے لگی ہے۔ مردوں کو یہ انداز اچھا نہیں لگتا۔ میں نے جانتے جانتے اس سے پوچھ ہی لیا کہ تم اس منظر میں کتنی جیسی لگتی ہو مگر یہ تمہارے مرد ایسے ہیں تو کیوں نظر آتے ہیں۔ اس نے مشکل اپنے آپ کو ہنسنے سے بچایا۔ ورنہ اس اتفاق یہ جدائی کی منزل پر ادا ہی کی لذت اس کے من میں رو دھ جاتی۔ اس نے میری تاکید نہیں کی۔ تردید بھی نہیں کی۔ اور دونوں باتیں ہو چکی تھیں۔ اس کے اندر ان پڑھ اور پڑھی لکھی عورت کی بی جلی خدیاں سمٹ آئی تھیں۔ وہ شہری عورت تھی مگر اس میں دیہاتی عورت کے اوصاف بھی جمع ہو گئے تھے۔ مگر (یہ ایک اور گھر ہے) کا منی بھی دیہاتی عورت کی بھوریوں میں گھر سے لیں اور غریبوں کی زمین سے دور تھی بھوں کی اس کی بھی مجبوریاں غریبیاں اور طرح کی غریبوں کی۔ اس عورت پہ مجھے رنگ آیا۔ اُن پہ ترس آتا ہے۔ بھارت کی غریب دیہاتی عورت کو بھارتی ہونے کا احساس تو کیا ہو گا۔ اسے آدمی ہونے بلکہ عورت ہونے کا بھی احساس نہیں۔ احساس ہونے ہی نہیں دیا جاتا اس کو۔ اس میں کوئی سافٹ نہیں کہ وہاں ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں لوکیاں چلی ماہواری کے وقت کبھی ہیں کہ شاید وہ زخمی ہو گئی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف شہر کی سیدھی رہاں تک ہے کہ ایک لیڈر نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اس خون کے لئے بھی جلد بنگ کا کمر کئے جائیں تاکہ لاوارث لوگوں کو ہسپتالوں میں زخم نہ ہو۔ شہری مرد اور دیہاتی عورت میں اتنا ہی فرق ہے جو مختلف نسل کے جانوروں میں ہوتا ہے۔ گوزی اور چوہا ایک ہی جنگل میں رہتی ہیں۔ کچھ عورتیں ایسی تھیں ہیں جن کے بغیر جنگل ادا ہوا جاتا ہے۔ مقدس گائے جیسی

عورتیں بھی ہیں۔ اللہ میاں کی گائیں بھی ہیں۔ میرا بی چاہا کہ میں انہیں اپنے دھگل میں لے جاؤں چلتی ہیں میں سے کامی نے ہاتھ ملا کر مجھے الوداعی خند بھیجا۔ میرا دھگل آباہو گیا تھا اور ادا اس بھی۔

صلاحت ختم ہو رہی ہے۔ کسی افتخار اور کسی استقلال کی خواہاں ہندو عہدوں کے ہاتھوں سے نکل جا رہی ہیں۔ اب تو کوئی مجرم ہی سلامت نہیں۔

میں نے اس کی طرف دیکھا پھر سامنے کھینچنے لگا۔ روشنی کی کیریں اندھیرے کو کئی حصوں میں تقسیم کرتی جلدی تھیں۔

”اس صورتحال کا علاج کیا ہے“ میں نے سوال کر روشنی کے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔

”ہم لوگ ابھی مرض کی اصلیت اور اہمیت سے ہی منکر ہیں۔ اندھا دھند علاج کرنے سے مرض اور بڑھتا جا رہا ہے۔“

وہ ایک اچھے بھلے مکان کے سامنے رکا۔

”یہ جو کنڈر پال کا گھر ہے؟“

”میں یہ میرا گھر ہے۔ تم میری جتنی (بیوی) سے ملواتے کہانی کاروں اور کلا کاروں سے بہت تمیز ہے۔ وہ خود لکھتی ہے کہانیاں ہندی میں۔ اردو بھی کچھ جانتی ہے لگے معلوم ہو گا تمہارے پال کا گھر آؤ“

ایک بہت پیارے بچے نے دروازہ کھولا اور لپک کر مجھ سے لپٹ گیا میں نے اسے اٹھا کر چہ باتا سے معلوم ہوا کہ وہ اور آدمی کے ہاتھوں میں بیچے گیا ہے۔ اس نے کوئی خاص رد عمل نہیں دکھایا۔ توڑا سا شربایا۔ جس نے اسے اور پیارا کر دیا

”پاپا اٹکل کا نام کیا ہے“

تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ میں نے بیٹے کو اپنا نام بتایا۔ تو اس نے جھٹ اپنا نام بتایا۔ موہن۔

”اے پاپا کا نام بتاؤ“

”اتل کمار۔“

میں اسے اٹھائے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا تو ایک پتلی چنگ خاتون اپنے تھڑے ہوئے ہاتھوں سمیت باورچی خانے سے سیدھی اصرار آئی۔ اس نے اپنے مصروف ہاتھوں سے نمسکار کیا وہ اپنے بیٹے کو میرے پاس دیکھ کر خوش ہوئی۔

”یہ پاکستان سے ہیں۔ شاعر وادیب ہیں“

اتل نے تعارف کرایا۔ وہ اور خوش ہوئی۔

ماتمی کا نام ملا ہے۔ موہن خوشی سے بولا

”جی بیٹھے۔ میں آپ کے لئے کچھ کھانے پیئے کو لاتی ہوں“

”امی پکڑو ضرور لائیے گا“

”کس کے لئے بیٹے۔“

”اتل کے لئے“

اس نے کمال سا دبی سے جلدی جلدی کہا۔ میرے سمیت سب نہیں دئے۔

”جی مجھے جو کنڈر پال کے گھر جانا ہے۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہے اور میں دیر کر بیٹھا ہوں۔“

”تو آپ ہمارے گھر نہیں آئے۔“

موہن نے اپنے پاپا کی طرف دیکھا۔ یعنی اچھے دوست ہیں آپ کے۔

”بھئی یہ تو اچھی بات نہیں۔ آپ کچھ تو نہیں۔ یوں تو آپ آئے نہ ہوتے۔“

کلا کے مکالمے میں معروف انداز کی اپناہیت نہیں تھی۔ نہ دوستانہ بے تکلفی کی کوئی لہر تھی۔ اس نے تعلق اور بے تعلقی کو برابر برابر فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے کئی گھروں میں ہندو عورت کی اس خوش نصیب خصوصیت کا مظاہرہ دیکھا۔

”میں پھر آؤں گا بھئی“

”میں نے چاہوں گی آپ کو پال جی کے ہاں کچھ نہیں کہیں گے وہ آپ کو“ اور اس نے پال صاحب کی کئی کتابوں کے نام گھنٹا سے شروع کر دیے۔ ”میں کیا سوچوں“ ”اک دن تو لکھی“ ”مٹی کا اور اک“ ”آدھ رشت“ اور بھی ایک دو کتابوں کے نام۔ جیسے گھر کا بڑا بھائی کا بڑا بھائی ہو۔

”یہاں پاس ہی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ کھڑی نظر آئی۔ وہ خود بھی کسی کے افسانوں کی کتاب بھی تھی۔ وہ باورچی خانے میں کئی گورگرم گرم کچڑے اٹھالائی۔ میں نے ایک پکڑا اٹھا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خاموشی سے مجھے دیکھا۔ کما کچھ نہیں وہ سلجھے ہوئے روپوں کی ایک متوازن مزاج کی عورت تھی۔ اتل کمار نے اسے کہا کہ انہیں جو کنڈر پال کے گھر لے جاؤ۔ موہن بھی ماں کے ساتھ آگیا۔ گھر سے نکلتے ہی اس نے اعلان کیا کہ اسے پال کے گھر کا کچھ نہیں۔

”تو پھر“

”تو پھر کیا۔“ دینا اس دو آدمی مل کر کسی چیز کو ڈھونڈنے لگے تو وہ ضرور ملتی ہے میرے بچے (شوہر) نے کہا کہ مجھے جو کنڈر پال کے گھر کا پتہ ہے تو مجھے پتہ ہو جانا ہے۔“

اپنا بچہ اٹھائے ہوئے اس عورت کے سلبے میں یقین دیکھنے کی روشنی جھلکا رہی تھی صادق ارادوں والے میاں بیوی نے مل کر نچائے کیا کیا کہاں کہاں ڈھونڈ لیا ہو گا۔

”مگر لوگ ایک دوسرے کو اکثر نہیں بھی ڈھونڈ سکتے“

”اس لئے کہ وہ یہ کام الگ الگ کرتے ہیں دونوں ایک دوسرے کے علاقے میں ڈھونڈتے رہتے ہیں لیکن کبھی نہیں ملتے۔ کھانا کھا لیا ہے ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں“

”ڈھونڈنے کا حرا بھی تو ایسے ہی علاقے میں آتا ہے جہاں نہ ملنے کا یقین ہو۔ کسی چیز کو ڈھونڈتے

ایک بے شانت افسانہ نگار

ایک فلیٹ تمام مکان کی اپری منزل میں جو گندہ پال کے پاس چھٹی حسین اور عطاء الحق قاسمی جانے کیلئے تیار بیٹھے تھے۔ چھٹی سٹار تھا جس نے پاکستان والے حسن عسکری کے پاس جانے سے پہلے فلوڈسوی سے عطا کو لوٹانا چاہتا تھا لیکن ان دونوں اصحاب کی طرف سے دعوت نہ تھی فکر تو ایسا بندہ ہے کہ اس کے پاس بغیر اطلاع بھی جایا جاسکتا ہے۔ کسی غیر وقت میں بھی جایا جاسکتا ہے مگر چھٹی کو ان کے آرام کے علاوہ میری عزت بھی مقصود تھی کہ بن بلا یا آدمی دکھائی آفت کی طرح ٹاپنہ بندہ ہو آئے۔ شاہ حسن عسکری ایک زمانے میں لکھنے لکھانے کا شغل بھی کرکھتا تھا تو زمانے ادب میں ایک سی حسن عسکری کو جانتے ہیں جس آدمی کا یہ نام ہووڈو شعر و ادب سے متعلق ہو، ہمیں لفٹ نہ بھی کرائے تو کیا ہے حسن عسکری صاحب مرحوم نے ہمیں کب لفٹ کرائی تھی، تنقید کا وقت ہمیں ان کی کتابیں پڑھ کر ملا۔ ایک سرسری ملاقات ان کی خوشی سے ہماری خوشی کی ہوئی تھی اس وقت یہ ایک مکمل ملاقات تھی۔

عسکری صاحب کا کھانا اچھا ہو گا۔ پال بی سے بیٹو کرگپ لگانے میں زیادہ مزاح تھا۔ البتہ فکر تو سوسے سے نہ مل سکے کارنامے بہ فکر مندی جیسا کہ فکر بھارت کا یہ اعجاز نویس اور کالم نگار ہے۔ ممتاز مفتی نے اس شخص کی بہت بددلی کی ہے ایک بہت، لچپ لچپ بات لکھی ہے اس نے "بندہ تارا" میں۔

"تیسرے ہند کے وقت فکر شہسٹ ہو گیا اور میں مسلمان بن گیا"

یہ بہت فکر کن بات ہے کہ ہمارے نزدیک فکر کا ایک ہی مطلب ہے پریشانی، ہم سوچنے اور پریشان ہونے کو ایک چیز سمجھتے ہیں۔ بندہ فکر تو سوسے اپنے شر سے ولی کامل خواجہ سلیمان ٹوسوی کا مرید ہو گا۔ ان کے مرید تو تھے کہ نہ ہوں تو سوسے کو کھانا کھاتے تھے۔ میانوالی کا ایک ہندو تھا مسلمان ہو گیا تو اپنا نام ذوالعزاد ٹوسوی رکھوا لیا۔ اسی نام سے اس کا بیٹا ذوالعزاد تھا۔ فردوسی میں ہو کر بھی ٹوسوی ہے۔ کبھی قائم رجسٹر کیلئے کئی کئی حوالے تلاش کر لیے ہیں میں نے تو سوسے میں خواجہ سلیمان ٹوسوی کے حوالہ پر ذوالعزاد ٹوسوی کے حوالہ فکر تو سوسے کو یاد کیا۔ مرے لئے یہ دکھ زیادہ حلق کا باعث ہے کہ میں دلی میں فکر تو سوسے سے مل سکے۔

کتابوں سے بھرے ڈرائنگ روم میں جو گندہ پال اور میں کچھ دیر تک ایک بیٹھے رہے جو گندہ پال بھارت کے ان لکھنے والوں میں سے ہے جس سے پاکستان کے لوگ بہت متعارف ہیں۔ اس کا سفر نامہ پاکستان ارم اعلیٰ کے سفر نامے کی طرح ایک مقبول تحریر ہے۔ اس نے اس سفر نامے سے کچھ اقتباس لکھے۔ اس نے پاکستان میں اپنی محبت کی دھول چھوڑ آیا ہے۔ اب اس کے گفتار رستے کی رنگینوں کی طرح

رہتا ہے کہ ملنے سے کم نعمت نہیں۔"

"جس میں بھی ڈھونڈا کسی نے"

"شاید مگر میں ڈھونڈنے والوں میں سے ہوں۔ ڈھونڈنے جانے والی شے نہیں اور تم بھی نہیں۔

غور تو ہوتے ہوئے بھی"

وہ نیچے کی طرح کچھ کچھ حاش کر لینے والے نیچے کی طرح۔

"جس میں ڈھونڈنے والے نے پالیا ہے۔"

"ہاں اور میں نے ڈھونڈنے والے کو بھی ڈھونڈ لیا ہے"

"تم بچس کی دیا ہو جس سے صرف پوچھ لہائی میں جلا یا جاسکتا۔ دیا بھی جلا یا جاسکتا ہے۔ سگریٹ

بھی سلگتی جاسکتی ہے اور اگر تھی بھی۔"

"بات بہت مزیداری ہے تم نے مگر ضرورت کی چیز ہوں میں موقع محل کے مطابق"

"ایک ضرورت میں کئی ضرورتیں سما جائیں تو وہ چاہت بن جاتی ہے۔"

"یعنی چھٹی جتنی ہوں میں تم سے خیال میں"

"ساری بیویاں تمہاری جیسی ہو جائیں تو مرد دوسری عورتوں کی طرف کیوں بھاگیں اور عورتیں

آزادی نسوان کی تحریک کیوں چلائیں۔ پہلے مرد کئی کئی شادیوں کرتے تھے۔ اب کم کرتے ہیں۔ اب

ایک عورت میں کئی عورتیں ہوتی ہیں۔ اور وہ مرد میں موجود کئی مردوں سے ایڈجسٹ کر لیتی ہیں۔ تم

ایسی ہی عورت ہو۔ آج کی عورت۔ جس میں پرانی عورت بھی زندہ ہے۔ مگر تم نے جھوٹ کیوں بولا۔

جس میں پال جی کے گھر کا پتہ نہ تھا تو تم نے کہا کیوں"

"اس بات کا جواب میں دے چکی ہوں۔ بچے آدمی کا جھوٹ بھی بچا ہوتا ہے۔ فطرت کا بنا دہی

ہے اسے۔"

بے ارادہ چلنے چلتے ہم جہاں رکے تھے۔ وہیں طرف کے دروازے ۵۸ ای لکھا ہوا تھا۔ جیسے

اسی وقت لکھا گیا تھا۔ کیا یہ صرف اتفاق تھا میں نے اسے بغیر فکر کے دیکھا وہ ایسی حسین نہ تھی مگر حسن اتفاق

کی طرح میرے سامنے کھڑی تھی۔

"کمالا! ابی چاہتا ہے۔ جس میں کئی کول۔"

"مگر کیوں کیا مطلب"

"عورت دبا ہے آپ کا کل ہو تو اسے کہلی کہتے ہیں"

"اچھا تو پھر کچھ کھانا"

میری آنکھوں میں اپنا منظر دیکھتے بغیر وہ چلی گئی میں نے دروازے کے سامنے کھلے ہوئے دروازے کی

طرح کھڑا تھا۔

غیر محفوظ بادشاہ کا قلعہ

چاندنی چوک کے پاس نرملک

مست ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ قریب سی دھڑی عورت دو دھڑکروں (مردوں) کو اپنے رشتے میں بٹھنے بیٹھے جاری تھی جس کی تصویریں دلی کی اخباروں میں چھپ چکی تھیں۔ یہ باہت عورت واقعی اندر کی ہم عمر ہو گئی۔ دوسری ایسی عورتیں چالیس برس کی سی تھیں ساتھ سالہ اندر کی ہم عمر ہو جاتی ہیں۔ بھارت میں ہر میدان میں عورت موجود ہے سچ بھی اس نے پائی ہے۔ گھٹت بھی کھاتی ہے سب اس کی آرزو پر مرگئی گئی ہے ایک جمہوری حکومت میں یہ علامت شدہ منظر مجھے برا منظر لگا عورت کبیں ہو بھارت میں لوگ اسے دیکھتے تو ہیں رک رک کر نہیں دیکھتے دواہنی دیکھنے والی چڑی بھی نہیں گھراس ہوا کو دیکھنے کو وہ بے تاب ہو رہے تھے۔ آج سائیکل رکاشی کا قدویت کا بھی تعین ہو گیا کون اوپر بن طرف نگاہ جاتی ہے۔ دوسرے سائیکل رکشہ میں بیٹھی سوار یوں سے گپ شاپ لڑائی جاسکتی ہے لڑائی بھی کی جاسکتی ہے اگر آپ چاہیں مگر سائیکل چاہیں بھی تو لوگ لڑائی نہیں کرتے لیکن پسند ہو جاتے ہیں کام میں بیٹھے ہوئے آدمی۔ یہ لوگ لڑائی نہیں کرتے قضا کرتے ہیں۔ فساد بھی اس سے کرایا جاتا ہے لڑائی میں دونوں فریقوں کے نقصان کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہندو خطرہ مول لینے کیلئے تیار نہیں آتے بھی۔

یہ برہمن بھری سڑک کشادہ ہے مگر آدمیوں اور گاڑیوں سے لٹی ہوئی۔ بیسیں کبیں ہو گاٹلی ماروں کا محلہ۔ جلی ماروں کھانے یہاں عموں کے کام بھی ماروں "چھپے ماروں" کتے ماروں اور بندے ماروں کا محلہ۔ کیوں نہیں پرہے یہ کام یہاں کرنے والے تو بہت ہیں جن جاب کا کرانے کا مکان اور حور ہو گا۔ کچھ آگے سیدھے ساتھ سڑک جامع مسجد کی طرف بھاری تھی میں قلعے سے ہوا مسجد آگیا ہے جتنے چاندنی چوک کی ساری سڑکیں بازار کا کام بھی دیتی ہیں فٹ پاتھ پر بھی بازار کے ہیں یہی فٹ پاتھ اور کئی شروں میں فٹ پاتھوں کو لوگوں نے بند روہ کے طور پر بھی استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ گھر کھائے یہاں اپنے ان کے ہاتھ روہ بھی بیسیں ہیں تیار ش پرے تو یہ علاقہ غلامی کی دلدل میں تبدیل ہو چکا ہے۔

رکشار کا تو ہم نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا دروازہ کھلا ہوا ہے سامنے۔ ہمارے گھروں میں بڑے بڑے دروازے ہوتے ہیں جہاں ہر سال گندم لانے ہوئے اونٹ آتے ہیں۔ اونٹوں والوں سے باری کے بعد دروازے اوپر سے رکھتے پڑتے ہیں۔ یہ قسمت ہی اونچا دروازہ ہے چاقبیلوں سے دوستی کے علاوہ گھوڑوں سے محبت نے یہ سمتیں بنائی ہیں لیکن گزر رہا تھا یہاں سے سب کچھ ہند گاڑی میں بیٹھ کر چاتے ہیں مگر ان۔ ہم کٹ کٹ کر دروازے میں سے گزرے۔ ایک پورا محلوں ہمارے ساتھ گزر کتا کتا مٹا

ہاتھ لگ رہے تھے۔ بھابھی کرشنا پال اپنے شہر کی چیزوں کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں کرتی ہے اور خوب کرتی ہے یا پھر پال کے افسانے کرشنا کی تحریروں کے ترجمے ہیں دونوں نے میری بہت خاطر کی لڑائی واقعی لاہری میٹھے دکھائی جو کتاب مجھے ابھی گلی میں نے اٹھائی۔

فون کی ٹھنکی بولی پال نے ر سہور کان سے لگا کر مجھے دیا یہ حرے حسن عسکری بول رہا تھا۔

"بھئی آپ کیوں نہیں آئے"

"آپ نے مجھے بلا یا ہی کہ ہے"

"یار میں شرمندہ ہوں یہاں تک کہ میں غلطی ہوئی"

"مگر سچی کو آپ کا پیغام مجھے میں غلطی نہیں ہوئی تھی آپ کی مرنائی ہے کہ فون کر لیا میرے بھتے

آوی کیلئے یہ بھی بہت ہے"

"یوں نہ کہیں اہمل صاحب آپ سے ملاقات ضروری ہے"

"آپ سے ملاقات ہوگی بھارت میں نہ کسی پاکستان میں ہوگی انشاء اللہ"

پال کیساتھ افسانے کے معیار و مستقبل پر بات ہوئی رہی۔ پال شوق تھا کہ اردو شعروادب کے حوالے سے بھارت کے لکھنے والے پاکستان کی طرف نگاہ رکھتے ہیں اور میرے ذہن میں پاکستان کے کئی شرمندہ نام ابھرے جو بھارت والوں سے اپنی حسیہ (RECOGNITION) کیلئے مرے جا رہے ہیں۔ دونوں طرف کے نئے روپے ادیبوں کے تجزیوں میں روشن ہوتے ہیں پال کی ایک مینی شریہ (اکثر ۲۰۴۰) (C) ہیں اس نے "میں اینڈ وہیں ریڈیوشپ" پر تحقیق کی ہے یہاں سے ہاں یہ موضوع ہی منع ہے شریہ کو پاکستان آنا چاہئے۔ یہاں کے مردوں عورتوں کے تعلقات اور بے تعلقیوں دیکھنی چاہئیں۔

نچلے گھر والا ایک نوجوان اپنے دی آ رہی فلم پال کی کو دکھانا چاہتا تھا جس نے میرے وہاں ہونے کا بارز کیا تو نوجوان مجھے بھی اپنے ساتھ لے بیٹھے مگر صبر ہو گیا اس خاندان کے ساتھ فلم دیکھنے کا سارا اور تھا یہ گھروں کی کچھوں میں سنے، قوتوں کی بے شکلیوں کیساتھ ساتھ تڑپتی عروسی بھی محفوظ ہیں۔ میں فلم اداہ و دکار چھوڑ کر آ گیا کہ رات مجھ سے بہت آگے نکل آئی تھی۔

"بحیثیت ادیب میں سے شانت ہوں یا میری شانت کے تقویٰ شانت کے سبھی مظاہر ہیں۔

میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہی بن جاتا ہوں یہ میری شانت ہے"

یہ جو گندہ پال کے ٹائل "ٹاڈ" کا قافیہ ہے۔ پال دیکھ کر وہاں کے کوشش میں بہتہ پچانا جاتا بھی ایک پچان ہے یہی سب سے بڑی پچان ہے ہر نہ پچانے جانے کیلئے لوگ کام میں کرتے چاہتے ہیں کہ لوگ منظر ہوں کو ان کی آنکھ سے دیکھیں۔ پال منظر اور آنکھ میں بھی پیو اگر نے میں ضرور کامیاب ہو گا۔

چل ٹھیکیا چل اچھے ملنے جتنے پرندے اچھے
نہ کوئی سہاوی ذات پچانے نہ کوئی ساتوں تھے

"آپ نہیں کیا سکتی ہیں۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی حالانکہ اس کے سراپے میں کم گنجینیں ہیہے ساختہ رہ گئی تھیں۔ وہ میری بات پر جیسی یا اس بات پر جو ابھی اس نے کی نہ تھی تاب بھیجے اس کے باقاعدہ۔ سب کی ضرورت میں رہی تھی۔ عورت جس بھی حال میں ہو جس بھی مقام پر ہو۔ اس میں کیجئے کہ وہ ملاحیت میں جو سکھانے کی ہے۔ بظاہر ان نیک عورت بہتر سکھائی ہوئی ہے ان پر عورت زیادہ مذہب ہوتی ہے جو طوائف پوری عورت لگسہ رہی تھی اور لگسہ رہا تھا جسے میں بھارت میں اس عورت سے کوئی تربیت لینے آیا ہوں چندوں رشتوں کا لیکن دین اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اس عمل سے شعوری اور لاشعوری طور پر بے پرواہ اور بے غرض ہو۔

اس بازار میں ہوش کا کھانا لھندا تھا مگر مزہ ادا تھا۔ ہوئی پر نام کاہر ڈنہ تھا جسے اس عورت کے ساتھ پر نام کی محکمہ تھی گوشت یا کسی قمار گرنہ پڑھا ہم اس درخت کو تلاش کر رہے تھے جو ہماری واپسی کا نشان تھا کچھ اور گھومنے کوئی باغ رہا تھا ہمارے پاس وقت نہ تھا جسے اس وقت چھوڑ سے چلی عورتیں کیا سوچ رہی تھیں۔ اصل مزارقیوں شام کو ہوتا جو کھانا ان گھروں میں کس طرح اتارتی ہوئی رات ان مکانوں میں کس ادا کے ساتھ داخل ہوتی ہوئی کیسے داخل ہوتی ہوئی۔ اندر مردان کو بھی کیا جاسکتا ہے۔

کیکوالا بھی تکہ بان کھارہا تھا۔ اس نے ہمیں دور سے پہچان لیا۔ اس نے کیوں محسوس کیا کہ ہم اس بازار سے بیزار ہوئے ہیں تو وہ ہمیں کہیں اور لے جانے کو تیار ہو گیا۔

"میرا کچھ گھروں میں آیا ایسا بازار اگے پر کدو خربوز چاہیں گے آپ۔" اور اس نے ہمیں ایسے دیکھا کہ بازار لگ گیا وہیں میرے سامنے اپنے شہر ان کی ہستیاں مٹھ مٹھ گئیں کئی گھروں کے دروازے کھل کر بند ہو گئے۔ جن سڑکوں پر کدو خربوزا ہوا تھا ہمارے اپنے آپ کو کدو خربوز کھوس کیا۔ سڑک پر لوگ تھے بالکل اکیلے عورتیں مرد جن کی کسی اور میں جینے کی انگ نہ تھی اور وہ زندہ تھے یہ تھرا ایسے ہی لوگوں کے لئے لکھا گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جینے کی زندہ رہنا چھوڑ دیا ہے۔ ایک واضح لفظ ہے جو ان کے درمیان واحد تعلق ہے۔ ایک مٹھو ہے جو چھٹے پائے لباس کی طرح لوگوں نے پہنا ہوا ہے۔ کسی کدو سرے کے اندر جینے کے تک مرنا ہے کدو خربوز چلتا ہے پتہ چلتا ہے سرحال۔

اسکے ساتھ ہجرت بھی کیجا سکتی تھی

بہم پریشان تھے رام لعل اور اس قلم۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے ساتھ میرا رابطہ صرف ادب کے حوالے سے نہیں رہتا والی اس کے میرے درمیان کدو خربوز کی طرح پھیل چکی ہوئی ہے لاہور میں بھی اس کے غلوصل کا طاق موجود ہے عطا بھی اس شخص کا معترف ہے۔ پھر ہم نے اس کی بات کیوں نہ مانی۔ اس نے کہا۔

"کیا آؤ کیوں آپ میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہے ہیں۔"

ہم اسے اتارے مگر وہ خود ہماری بات چاہتا تھا۔ یہ جو ایک فقرے میں اس نے تین بار "کیوں" استعمال کیا تھا۔ اس نے اسے سوالیہ فقرہ نہیں رہنے دیا تھا۔ "الو امیر" بتا دیا تھا استعمال کی بجائے اضطراب اس کے چہرے کو چوم رہا تھا۔ ہم گئے تھے اس نے اسے کہا۔ کھنکھائی ان جھوٹوں پر ضرور چاہا۔ جہاں ہم نہ جاسکتے تھے ان لوگوں سے ضرور ملنا جن سے ہم ملنا چاہتے تھے ماس ارادے سے جدھر جدھر جانے کا، جس جس سے ملے گا۔ ہم اس کے ساتھ ہو گئے جب بھی وہ ایسا کرے گا نہیں ساتھ پائے گا۔ عرفان صدیقی کی بات اور ہے۔ اس نے صرف ان لمحوں کا دوستانہ ہے جب وہ شعر کہتا ہے۔ اس وقت ہم ایک علاقے میں ہوئے ہیں۔ پٹنہ قلم پر جانے والوں کی بے تکلفی بکھری تھی جن عورتیں مرد بچے پر رگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لکھنے ہوئے تھے۔ کر دہنیں لے رہے تھے۔ جیسا میں لے رہے تھے اور اس وقت اس پر افتخار کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو بھی اس گاڑی سے جاتا گاڑی کے اندر تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا چہرے پر بھی آدمی ہی آ رہی تھی۔ ہم نے ہسوں کی چھتوں پر یہ عالم دیکھا ہے گاڑیوں پر بھی تقسیم ہند کے وقت دیکھا کیا تھا۔ ہم اس وقت درجہ ہمارے آغوش مادر کی طرف ہجرت کرنے والے تھے۔ تقسیم ہند کا کچھ ہمارے لمبی آنکھ میں جھگا گاڑو گا۔ آج ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ کیفیت دیکھی جیسے گاڑی کی چھت لٹائی سروں سے جانی گئی ہو۔ وہ لوگ شیشوں پر بیٹھے ہوئے کے لئے جگہ بنا رہے تھے اور ان کی تعداد پست والوں سے کم نہ تھی تقریباً سارے لوگ ڈبوں میں بھی تھے۔ انہیں وہاں سے نکالا جا رہا تھا۔ ان سب لوگوں کے پاس ٹکٹ تھے مگر ان کے چہروں پر غریب اور غریب الوطن کی سرگرمی ہوئی تھی۔ پڑھیں کہاں کہاں سے آ رہے تھے۔ یہ لوگ نقاب کے مختلف علاقوں میں فصولوں کی کٹائی کرنے جا رہے تھے۔ ان کا نام کیت ہرزور ہے عطا کی رزق میں دے ساقوں سے شہر ان کی طرف رخمان کا روٹا دیا جاتا ہے۔ آج صور حال برعکس تھی۔

روزہ گزار کے لئے جانا ہجرت سے مختلف تجربے نہیں کم کر دے بھی نہیں۔ آدمی ہر وقت ہجرت کے عمل سے مکرر تکرر ہے آدمی جب کرے گا مکان پر لہے تو وہ ہجرت کر رہا ہوتا ہے۔ وہ تب بھی ہجرت کر رہا

حبران کر دینے والے بابے سے مکالمہ

لوگ جب تک کوشش کر رہے تھے، جب تک ہو رہی تھی۔ اب بے اعتبار بڑے تھے تو سہولت ہو گئی تھی۔ میں دروازے والی سیٹ پر بیٹھے بابے کے پاس کھڑا تھا۔ مجھ پر ایک خوشگوار میٹاری تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”آپ اشفاق احمد کو جانتے ہیں؟“

اس نے لیک ادھر سے ادھر سے نظریں سے مجھے دیکھا اور کہا

”وہ مجھے جانتا ہو گا۔“

میری ہنسی کو کسی نے میرے اندر مضبوط کر لیا۔

”وہ آپ لوگوں کی باتیں کرنا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ بابے کے بعد زندگی بے فائدہ لگتا ہے، آدمی کا تجربہ نہیں رہتا؟“

بابے نے ہر مجھے دیکھا۔

”لیکن لیک بابا بابر آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ کسی پر وہ ظاہر نہیں ہوتا۔ کوئی اسے خود پر ظاہر نہیں ہونے دیتا اس کا راز دار بننا کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔“

”ہمارے پاس بزرگوں کے علاوہ یوتھوں اور بھکاریوں کو بھی دیا کتنے ہیں“

”کتنے تم بھکاری کہتے ہو اس کے اندر دانا ہوتا ہے ان دانوں۔ اس وہ اسے نہیں جانتا ہوتا تو تم بچے کو بابا لوگ کیوں کہتے ہو کتنے ہوتے۔“

میرے پاس جواب کہاں تھا۔ سوال بھی نہیں ہمارے پاس سوال جواب کا چکر ہے۔ بس۔

”لوگ اپنے باہر کسی بابا کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔“

”پہچانیں کے کیسے اسے۔ تلاش اپنے اندر ہوتی ہے پہلے۔ جانتے ہو بابا ہوا کون ہے۔“

”ہاں جیسے آپ ہیں۔“

وہ یوتھ صاحبان میان شان سے منکرا یا اور منکرا ہوتا رہا۔

”یوں تو بڑا خاص بابا ہوا“

وہ اپنے بارے میں اتنا ہی بے نیاز تھا جتنا کہ ہوتا ہے سچے کے شعور اور لا شعور میں سرحد نہیں ہوتی اور وہ ہندو سکھ مسلم عیسائی نہیں ہوتا سچے کے دھارم میں غور غرضی ہے بس وہ مل جائے اور ہر مذہب کو بھی ہو جائے، ہندو سکھ مسلم عیسائی۔ سو دسی یہ بات میرے ذہن میں تھی یادو مجھے کہہ رہا تھا کہیں مکالمہ رکھنا تھا۔

”بچہ تو دین فطرت پر ہوتا ہے۔“

ہوتا ہے۔ جب عمل قیام کی حالت میں ہوتا ہے ہجرت اپنے اندر بھی ہوتی ہے۔ ہجرت رسولوں کی سنت اور پرندوں کی فطرت ہے مڑا آتا ہے جب مسافرت اور مساحت لیک۔ تجربہ بن جاتا ہے میرے خیال میں پاکستان کے مختلف علاقوں سے جن ہندوؤں نے بھی زندگی کے لئے سفر کیا وہ بھی ہجرت تھی۔ مسلمانوں کے عمل سے کم کام تو نہ تھا۔ یہ جو تلاش رزق میں جا رہے تھے ماہر تھے۔ دور کمرے رام لعل کی آنکھوں میں ایسی ہی کیفیت تھی جو میانوالی مشین سے پتلے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمکی تھی

وہ عورت جو اپنے بچے کو بڑی بے نیازی سے دودھ پلا رہی تھی۔ اس کا سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کا سینہ دس وقت بھی نظر آ رہا تھا جب وہ اپنے بچے کو دودھ پینے پلا رہی تھی وہ چھوٹا سا بچہ تھا کہ وہ کدھ تھی وہ جس دن سیکے سے سسرال آئی ہوگی اس نے کیا محسوس کیا ہو گا۔ اس نے جب اپنے پتلے بچے کو حتم دیا تھا تو ہجرت ہی کی تھی اس کا وجود اس کا گھر تھا اور یہی اس کی بے گھر تھی تھی۔ اجڑے ہوئے گھر میں بھی کیا جاز بیت ہوتی ہے۔ میں پتلے کے زمانے کی بار بار اس کے پاس سے گزرا اس نے میرا ہاتھ بھی نوٹس نہ لیا جتنا اپنے ارد گرد چلتی ہوئی ہوا کا لیا جاتا ہے۔ میں نے نہ سمجھ میں آئے والا کیف محسوس کیا کہ میں اس کا ہمسفر ہوں اس کے ساتھ ہجرت بھی کی جاسکتی تھی اگر وہ جا رہے ہیں میں نے بہت کوشش کر کے اپنے اندر اتنی ہوئی مٹی اٹھائی کی۔ اور اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں لیے سڑوں کے بھگوان سے تعریفی ہوئی تھیں۔ اتنی گہری حیران کی چمک کم لگا ہوں کو نصیب ہوئی ہے۔ میں نے اس کے بچے کو پیار کیا اور پھر۔ پھر آئی۔ اس کی نگاہیں اپنے بچے کی آنکھوں پر پڑی ہیں۔

پتلا تے میل وے

مڑگوں پر تیز قہار سہاری میں شر کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مگر امر سر تک دوست شہر کے طور پر متعارف ہو چکا۔ آدمی کے اندر دوست ہو تو وہ پہلی ملاقات ہی میں چھپا نہیں رہتا کی شہروں کی عادتیں دوستانہ والی ہوتی ہیں۔ لاہور میں امر سر کے آبی قہار دوست ہے۔ ہمارے اولیٰ علیحدہ میں بھی بہت شخصیات امر سر کی ہیں۔ لاہور اور امر سر کا قاضی یہ کتاب ہے۔ لوگ ہر روز دونوں شہروں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ صبح شام لوٹ آئے۔ امر سر کا حراج برہم برہم اور پراپر انہیں۔ بھارتی حکومت اسے ایک بد کردار شہر سمجھتے تھے کہ اس کے لئے زبردستی برہم برہم اور پراپر انہیں۔ بھارتی خاندان میں جرات مندانا ہے۔ امر سر کی بار خون میں لٹ پٹ ہے۔ شاید تقسیم ملک کی خون ریزیوں کا بدلہ چکانے کے لئے یہ کتاب ہے۔ ایک مذہبی طوفان میں چٹھارہ سو آج آرام کے وقت میں تھا۔ سیاحی جہود جند کے زمانے میں یہ وقت طویل دور اس کے ذرا سے میں اسے شہر کے دکھانے کے وقت میں تھا۔ امر سر میں غریب مسکوں کی اکثریت ہے۔ دلی والے کم سکھ غریب ہیں۔ دلی میں کرپان نظر نہیں آتی یہاں کرپانوں کو سکھ جھنڈوں کی طرح لہراتے پھرتے تھے سکھوں کے جھنڈے پر کرپان نہ ہوگی قہار کیا ہوگا۔

شہر کی بندو فضائیں ایک سہم ہے۔ ہمیں رائے برادران نے بتایا کہ ہندو اس شہر سے نکل رہے ہیں۔ ہندو بھی خوف کی فضا میں نہیں اور ملکہ خوف کے اسرار بلکہ اسرار کی کیفیت پورے بھارت کے سارے شہروں میں سراوت کرتی جا رہی ہیں ایک سے نامی سبے قہار ضرور ہے۔ بھارت کے پالیسی ساز غیر ہندوں کو ملتان چاہتے ہیں۔ بات تو ہیں رہی ہے۔ میر ہندو نہ گئے تو ہندوں میں فیر بنے گئیں۔ بننے لگے گئے ہیں۔

موٹر شہر کے امیر علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں اکثر بلکہ تقریباً تمام کوٹھیاں ہندوں کی ہیں یہاں سبیل لائٹ گاؤں راولپنڈی سے ملتا تھا اول ہے۔ ایک اچھے محلے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے رائے برادران اور ان کے گھروالوں کی اپنا نیت کے جو پوچھ اور اور ملکہ بھارتی۔ نئی طرز تعمیر نے نئے طرز تہذیب کو جنم دیا ہے۔ اور ایک وہ نین لوگ کی ضد شاندار زندگیوں کے خدو خال کو دکھائی ہے۔ لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ خالی خالی گھروں میں ایک آدمی پورے ماحول کی طرح سناٹا چلا جاتا ہے۔ تو فضا اس کے ہونے سے قابل قبول ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسا آدمی خود ایک تہذیب ہو جائے ایک زندگی۔ دلی داغ رائے کی بیوی اس گھر میں ایک خوبصورت گھر کی طرح ہے جسے دلی داغ نے اپنی جتنی کما۔ ایک محل جیون دلی بیوی کے لئے اس سے زیادہ کوئی لفظ نہیں۔

"رب نہ کر ایسا زچاں تے میل دے"

لہری والا شروع کر دی تھی۔ باقی لوگ تالیوں کی تال دے رہے تھے۔ ڈنکار آدمی قہار سکھوا۔ ایک جگہ جیسے جیسے ہانچ کے سارے داونچ آواز پڑا تھا۔ کون کہتا ہے کہ سکھ "ان سکھ" قوم ہے۔ اب تو یہ قوم ہے۔ سکھ ساری دنیا میں ہیں۔ مشرقی پنجاب میں ذرا زیادہ ہیں۔ بھارتی حکومت کو بس یہاں ان کا ذرا زیادہ ہو کر الٹا ہے وہ چاہتی ہے کہ جس طرح یہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں سارے بھارت میں بکھر جائیں۔ یہ ان کا پانک ہے۔ اقلیتی فرخنے والے ایک جگہ ہوں تو مسائل پیدا ہوتے ہیں اور مسائل کم کرنے کے لئے خود انہیں کم کرنا پڑتا ہے بھارتی حکومت یہ نہیں سمجھتی کہ انہیں کم کرنے سے دو اور اقلیت بن جائیں گے۔ سکھ اقلیت کا انداز سیاست اب انداز جنگ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ غیر ہندو قوموں سے بھارتی حکومت اس طرح تہذیبی ہے جس طرح تقسیم ہندو سے پہلے برطانوی حکومت بنی تھی۔ انگریزوں نے کچھ اچھی طرح بھی حکومت کی۔ اپنے حکمرانوں سے تو انگریز اچھے تھے۔ اکثر بڑے سکھوں نے یہ بات کی۔ ہمارے اکاؤنٹ کا بننے ہوئے بھی یہی بات کرتے ہیں۔ چیزیں سستی تھیں۔ امن و امان تھا۔ انصاف ملتا تھا۔ رشوت نہیں تھی۔ سفارش نہیں تھی۔ اب صرف "آزادی" ہے اور "جمہوریت"۔ ان دونوں کا ہوشیار کیا جا رہا ہے۔ بس مشربو گیا ہے۔

مثال کے طور پر دیکھو گی۔

ایک سی کے رنگ کی داڑھی والے سردار نے کہا۔

"جو چھوٹے چھوٹے ملی بنوائے تھے انگریز نے۔ اب تک لوہے کی طرح کڑے ہیں۔

اس نے مزید مثال کے طور پر اپنا بازو دکھایا اور ہوا میں لہرایا۔

ہماری حکومت نے اور کچھ نہیں بنوایا تو پھر کہاں سے بنوائے گی ہمارے یہاں۔ جو دو چار ملی بنوائے بھی ہیں تو کئی کئی بار بنوائے ہیں؟ یہ فقروں کا پرمی قہار اور بھر پور قہار کہ ایک مشرک فتنہ پٹا چلا گیا ذرا بھی نہ بنا۔

"ایک میل کو بے ابھی میند نہیں ہو تھا کہ میرا بیٹا رائے برادران سے گزرا۔ پل ٹوٹ گیا۔ سرائیک بھی ٹوٹ گئی یہ بھی ہمارے ہاں کی بتی ہوئی تھی۔"

لوگوں کے ہنسنے سے پہلے ایک گھبرو سکھ بول پڑا۔

"چاہا۔ اپنے بیٹے سے کوہی کو کہاں کے گھبرو نہیں پرستہ گھڑا کرے۔"

اب بھر فتنہ پوری قوت سے ہر طرف سے لٹا لٹک کر لگا ہوا۔

جب شاہ بہانہ شہر پہنچا تو وہ یہ قرار ہوئی۔

"مرد آگیا۔ مجھے پہچانو۔ مجھے ڈھانپ دو"

کیس اور نہانہ ملی تو پہلے ہونے خود میں ٹھس گئی۔ یہ بھی روایت موجود ہے کہ آگ ایک بار پھر گھڑا بن گئی جس اس سے آگے نہ گھٹ نہ کھوں گا۔ کہ یہاں آگ لگانے والے ہیں۔ اور میں آگ کو گھڑا بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ میرے دل میں کئی آتش فشاں آتش کدے بن چکے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ کہ یار لوگ آتش کدہ کو ابھی تک بہت کدہ ہی سمجھتے ہیں۔

ان پڑھ لکھنے والی بڑھ چاند کے منہ سے جو بات لفظی اقبال کے دورے میں چلی جاتی۔ اسے کشمیری لہو کا کاتام دیتے ہیں۔ یہ باتیں کشمیری اردو اگر بڑی میں شاعری ہو چکی ہیں۔ بڑھ کا قول ہے۔

"بے شک پڑھنا آسان ہے۔ اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔ جس طرح چٹائی اور اصلیت کی تلاش و شمار ہوتی ہے۔ جب میں شاعر ہوں تو مجھے بھی خوش ملی"۔

"میں نے اپنے نفس کو مارا جس سے میرے اندر کا چراغ روشن ہو گیا۔ اندر کی پنک باہر نکل آئی۔ اور اندر میرے میں اسے میں نے پکڑ لیا" اب میں ہر کشمیری لڑکی میں بڑھ کو ڈھونڈتا ہوں جسے مل کر یہ کشمیر جنت نظیر کا لطف آئے۔ اور آدمی جنت اپنے ہی کے اندر محسوس کرے۔

کشمیری اسل اور جنت کے باشندے قاضی صاحب کی کھلے احاطے میں قبر پر چراغ بھی تھا۔ وہ ملی کے کھڑے پڑے تھے۔ پانی تھا۔ اوپر جھیرے پر چڑیاں بھیجی میں دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ یہ سارا انتظام فوری طور پر نہ ہو سکا تھا ہم کسی کو بتا کر تو نہ چلے گئے۔ پھر ہم کوئی صدر دور (مارشیل لاوالا) اور وزیر عشرہ (وزیر اعظم) تو تھے نہیں۔ کہ ہمارے لئے کوئی تحلیف یا تحلیف کی جاتی۔ اور یہی بات بھی نہ تھی کہ کوئی ہمارے لئے بیشیہ سروں میں لالہ پٹنی لایا جی

سازنی لگی آج

مخرب والے کمرے سے ایک مولوی صاحب معاف کیجئے سردار صاحب لگے اس نے بڑی قی میں چٹائی میں باندھ رکھی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ اس مولوی صاحب کا، احسان ہے جس نے یہ مسجد بنائی تھی۔ عطائے انیس بتایا کہ میں ان کا پوتا ہوں۔ وہ سمجھ بزرگ آدمی تھا وہاں میں اس نے عطائی بہت تحریر کی۔ یہ سردار صاحب کی اعلیٰ طرفی ہے۔ کچھ کمال تو صاحب قبر کا ہو گا۔ ان کی قبر سلامت ہے تو میرا خیال ہے مسجد بھی سلامت ہے۔ قبریں دراصل معیدوں کی نشانیاں ہیں یہاں نمازی کوئی نہیں تو کیا ہو۔ کہتے ہیں مسجد میں نمازی نہ ہو تو فرشتے آکر نماز پڑھتے ہیں۔ بھارت میں یہ کام ان کے مسجدوں پر فرشتے ہی کرتے ہیں۔ ایک بستی میں ایک مولوی صاحب کا گناہ ہے اپنی مسجد میں پانچوں وقت اذان دینے کے بغیر پڑھتے اور نماز کی امامت کر آتے۔ اور ان کی اقامت نمازی ایک نہ ہوتا تھا۔ ساری عمر ہی محل بیہم میں گزار دی۔ انیس بھی باطلین یا بھگت خرد وہ یار بچیدہ خاطر نہ دیکھا گیا۔ اس استقامت کو کیا نام دیا جاسکتا

ہے۔ میں ایک ایسے لیڈر کو بھی جانتا ہوں اور سوں سے ایک علاقے میں انقلاب کی تبلیغ کر رہا ہے انقلاب سے ان کی مراد سوشلزم ہے اب سوشلزم کئی قسموں کے ہیں مسلمانوں کے فرقوں کی طرح کوئی اس لیڈر کا بھی ساتھی نہ بنا۔ اور وہ بھی ہمیں پابا گیا۔ یہ بھی استقامت کی بات ہے۔ وہ مولوی اور انقلابی ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے ایک دوسرے پر معترض بھی تھے اس حوالے سے اب لوگ ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں تو ان کا عمل بدتر کرتے لگتا ہے۔ جو کام دلوں میں کشادگی پیدا نہیں کرتا تو یہ مان لینا چاہئے کہ کوئی خطی کیس ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود مولویوں اور لیڈروں کو عاقبتی فہرہ دینے جانتے ہیں۔ پھر بھی اور اور ہم اس پر پتے میں ٹپل ہو گئے ہیں۔

میں نے بھول گیا کہ یہ کس کی قبر ہے۔ قبریں سب بھی ہوتی ہیں صاحب قلب اور صاحب قبر کی ہے ہوتے ہیں میں نے فاتحہ پڑھی اور مستطانی۔ منت کسی بھی قبر مانی جاسکتی ہے۔ عطا کو معلوم بھی نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے نہ بتایا کہ میں نے کیا منت مانی ہے کہتے ہیں منت جہنمی نہ جاسے تو وہ ضرور چوری ہوتی ہے کہنے والوں نے کہا ہے۔ جو یہ سب ان لیتے ہیں اسے لوگ وہی ہیں

اہو کے پھول

ہم جیاناؤلہ باغ میں اسی دروازے سے داخل ہو رہے تھے جو ہرے جنرل ڈائر (ڈائر) اپنے فوجیوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ اور کوئی رستہ ہی نہیں۔ سیرے میں چھپتا کاٹھک تھا۔ یہاں داخل ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی انگڑیاں ساتھ ہونا ضروری ہے شاید۔ اب تک ایک لمبائی میں موجود ہے۔ جن باغوں میں چلے ہوں وہاں پھول سلامت نہیں رہتے۔ یہ باغ 'باغِ تم اور جلسہ گاہ زیادہ رنگ رہا تھا۔ یہاں تو خود بخود تقریر کرنے کوئی چاہتا ہے۔ کس کس نے یہاں تقریریں کی ہوں گی۔ مگر وہ تقریر جس کے دوران گورافون نے گولیوں کی برسات کر دی اور پھر افغانی۔ فلم گاہ میں بھی۔ منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ وہ ساری جگہیں اب نگاہوں میں پھر رہی تھیں جہاں آزادی کے حوالے کو لیاں کھانکے گرتے رہے۔ اس باغ کی چار دیواری باغوں والی نہیں۔ گلیوں والی ہے۔ اس دروازے کے علاوہ جس سے جنرل ڈائر اور پھر ہم داخل ہوئے کوئی آدمی کسی طرح باہر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ نہیں جاسکتا۔ ایک آدھ دروازہ ہے۔ مگر لگتا ہے کہ اسے بند رکھنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ کچھ دیواروں پر اب تک گولیوں کے نشان محفوظ ہیں۔ جو گولیاں جسوں کو چہ نہ نہ سکتی تھیں، دیواروں سے لپٹ گئیں۔ چاندیو 'میک آج بھی اس پر فضا مقام پر تھری ہوئی ہے۔ بھارت میں بلکہ ہندوستان میں بلکہ دنیا میں کوئی باغ اتنا زار نہ ہوا ہو گا یہاں لو کے پھول جیتے تھے۔ لیکن باغ راہ پینڈی اور گل باغ لاہور میں کچھ یہ کچھ یہ ہو چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس میں کچھ 'اہوں'، یہ تو میں، کابل میں سری گرس، 'دلی میں'، 'ستران میں' ہندو میں دھاک میں 'تاریخ کے مختلف کھوں کے درمیان کھڑا ہوں۔ اور میں اب پھر پنجاب کے امرتسر میں کھڑا ہوں۔ یہاں آج سکھوں اور ہندو کھڑاؤں کی کشیدگی اس لوملہاں لئے کچھ بڑا رہی ہے اور وہ کچھ آہستہ آہستہ قریب تر ہو گا اور کھڑا چلا جا رہا ہے۔ تب بھی یہاں سکھوں اور مسلمانوں کی تعداد بہت تھی، سکھ زیادہ تھے، ہندو بھی تھے تو بڑے تھے۔

باغ کے ایک کونے میں یادگار بنائی گئی ہے۔ ایک بالک تھیرا گیا ہے جس میں اس وقت کی ساری کمانی موجود ہے۔ لفظوں میں مرقوم ہے۔ لفظ پنج رہے ہیں۔ تصویریں نو حور گری ہیں۔ تصویریں میں واڑھیاں زیادہ ہیں۔ تب مسلمان بھی داڑھی رکھتے تھے۔ اب نوجوان رکھتے ہیں فیشن کے طور پر۔ وہاں فیشن مغرب کی طرف سے آئے ہیں ہماری جمہوریت بھی مغرب کی طرف سے آئی ہے۔ اب تو خواب بد خیال بھی ادھر سے آئے ہیں زندگی کا چلن بھی اور موت کا مسلمان بھی۔

اس واسطے کہ اس پر سے برصغیر میں پھیلاؤ ایک احتجاج بن گیا۔ ہندوؤں کے محرکات ایسے

ہی ہوتے ہیں۔ انگریزوں کو اسی ظالمانہ کارروائی کا پتہ نقصان پہنچا اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا سر شرم سے جھک گیا۔ آج اس سے بڑا واقعہ بھی ہوتا ہے تو ظالموں کا سر شرم سے اونچا ہو جاتا ہے۔ ہوں ہوں زندگی آگے بڑھ رہی ہے اور پہلے لوگوں کو قند سب سے ہماری عزت کیا جانے لگا ہے، اس طرح کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ ظلم کرنے کے کیا کیا انداز اٹھل آتے ہیں۔ ظالموں کے فخر کا سامان زیادہ ہو رہا ہے۔ پہلے لوگوں کو تو سلیقے سے ظلم کر چکا تھا۔ اب سائنٹفک طریقے ہیں۔ سیاسی ہوازی ہیں۔ خاص سموتھیں ہیں۔ تباہ کن اسلحہ استعمال ہو کر رہا ہے۔ کوئی کسان پھیرنے کے باوجود نہ لڑے تو کیا لڑائی کی پریکٹس ہی کی جائے۔ ایک بہتی میں ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے فوجی تعینات کر دیئے گئے۔ کچھ دنوں تک ڈاکو سامنے نہ آئے تو فوجیوں نے شریف شہروں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ پوچھا گیا کہ یہ کیا انداز ہے۔ جواب ملا کہ اب ڈاکو سامنے نہ آئیں تو ہم کیا کریں۔ ہم نے کوئی چلا دیا ہے۔ اپنی ہندوؤں کو زنگ نہیں لگواتا۔ جو رہے گئے ہیں، آپ ہمیں ڈاکو سمجھ لیں۔

طرز برکت کیلئے قرآنی ہی عبادتوں سے لائے جاتے ہیں۔ اللہ بابر کرے۔

گولڈن ٹمپل میں سرت یا تابا ہے یا گولڈن ٹمپل تالاب کے اندر ہے۔ باقی عبادتیں پانی کے گرد اگر ہیں۔ ایک طرف ایک چھوٹا سادر درخت بھی ہے۔ دور سے ہی کار درخت معلوم ہوتا ہے۔ جس چار دیواری میں یہ درخت ہو وہاں پھر بھی آتے ہیں۔ اب بیوں گولوں کا دور ہے۔ ایسے درخت کے بارے میں الہامی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ یہ جتنے آسمان پر بھی ہے۔ پرانے دنوں میں جب کسی کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی تو وہ کہتا "آپے غڈی دیتے مسیکھا قیس" (آخر فیصلہ غڈی دینے کے بچے ہو گا) سکھوں نے یہ گولڈن ٹمپل میں کوئی ہے۔ کچھ فیصلے اس کے بھی گئے ہوں گے۔ پلٹے پانی کے کنارے میں ایک سکھ نے پانی کا اس میں بہاؤں کے لئے کھدے۔ لوگ اس پانی کو آنکھوں سے لگاتے تھے منہ دھوئے تھے ایک سکھ تو کچھ صابن لگا رہا تھا۔ شاید بہت بھرا تھا، لگتا تھا۔ ایک علیحدہ سے مقام پر جسے حمام کا غیر مناسب فیس "عورتیں کو بھی نہانے کی اجازت ہے بلکہ اجازت نامہ ہے۔ بلکہ دھوٹ نامہ ہے۔ ستائے یہاں سدرست عورتیں زیادہ غسل کرتی ہیں۔ گوری پچھو پٹائے نکلتے تھے دی لائٹ دور کی۔ (گوری تالاب سے نہا کر نکلی۔ آگے ترہہ نہیں ہو سکتا۔ ترہہ پہلے ہی نہیں ہو سکتا)

وہ عورت بھی ہم نے یہاں دیکھی جو نہا کر بھی نہائی ہوئی لگ رہی تھی۔ جلتی ہوئی موسم بخاری طرح کہ اس کے کس میں، کھینچنے والے کا ہر بھی دیکھ لے۔ جہاں کھڑے ہو کر اس نے پانی کو دیکھا تھا۔ وہاں ایک عجیب چنگڑاں تھی۔ ایک سکھ نے وہیں سے پانی لیا اور اپنی آنکھوں پر چھینٹا لیا۔

بڑھریں اور لوگوں کے ہر بھی اگر ہیں۔ پانی کی اہمیت سارے مذہب میں ہے۔ آپ زحرم ونگا محل کسی بیارے کا بھوت پانی۔ برتا ہوا پانی۔

ٹمپل کے بڑے دروازے سے دیکھیں تو پانی چو کوڑھل میں بھلا ہوا ہے۔ درمیان میں ٹمپل جزیرے کی طرح ہے۔ وہاں تک آنے اور جانے کا کنگ ایک حجازی راستہ ہے۔ اس وقت وہاں سکھوں کے علاوہ وہاں ملک سیاحوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ سرت پانی ہوتی بیوں نے سراسر بھی طرح ڈھانچ رکھا تھا۔ دو ایک تو بالکل عجیب لگ رہی تھیں۔ "میں پلٹے ہاس دی پونجی" وہ بولی ہوئی چہرہ منڈا " (میں پلٹے ہاس کی پانی ہوئی میڑھی ہوں) اسے جوان آزاد جیسے دھجے چہرہ (صرف اندر دیکھ) اگر کچھ زیادہ پونجی ہو تو سکھوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اس صورت میں اعتراض نہیں ہوتا۔ اگر اندر دیکھ کر پکڑا ہو تو پونجی یا پکڑی یا کٹا کر لے کر زور دیا جاتا ہے۔

گولڈن ٹمپل میں سلفے دی لٹ

دور سیاحوں سے لگتا ہوا یہ عظیم معبد ششدر

کر دینے والا ماحول رکھتا ہے۔ یہاں موجود ہر شے ہر شخص کا ہاتھ لگ کر۔ جلیا نوالہ بارش سے بڑھ کر لکھو کے رقص نے خالوں کو یہاں حوادیا ہو گا۔ چاروں طرف شفاف سفیدی لہرائے تو سفاک جگہوں میں جبرست ڈال رہی تھی۔ کل کے عالم آج کے مظلوم اور آج کے ظالم کل مظلوم ہوں گے۔ وقت کیسے کیسے چیلے کرتا ہے۔ جزل واز کو لندن چاکر سرور اور اودھم عکس نے نقل کیا تھا۔ تحقیق ایک انسان بڑے بڑے عساکر پر بھاری ہوتا ہے۔ آئیے اودھم عکس نے پوری دنیا میں اودھم مچا دیا۔ بیٹی سی سے اس کا ہم چھوٹا عکس بنا کر نشر کیا گیا۔ بعد کے ٹیشن میں اودھم عکس لگا گیا۔ وہ خود کو سکھوں مسلمانوں اور ہندوؤں کا نمائندہ سمجھتا تھا اور ٹھیک سمجھتا تھا۔ ایسے آدمی ہر قوم کے نمائندے ہوتے ہیں۔ کل کو غمیت تھا آج لفظ ہو گیا ہے۔ ہندو لہذا۔ نے تو سب کو غلط کر دیا ہے۔ پسے انگریزوں کو مسلمانوں سے لڑا۔ پھر سکھوں کو مسلمانوں سے لڑا دیا۔ قیام پاکستان کے وقت تو کچھ ہوا مسلمانوں اس کے بعد دیکھوں میں بھی ہندو فوج میں سکھوں کی پوری طاقت شامل تھی۔ مگر بطور اقلیت کے عبادت میں انھیں براہ راست نہیں کیا جاتا۔ اب تو فوج میں بھی وہ اقلیت کے طور پر ہی رہ گئے ہیں۔ ہندو صرف اقلیت ہی کو مار رہے ہیں کرتے۔ ایک تو یہ سکھوں کے نام پر ہی بدشعور ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے ناموں سے کہیں کہیں کچھ کچھ ہتھے پہنچے۔ شیر مہر سنگ۔ چڑا نہان "پہاڑ سنگ"۔ ہندوؤں سے دور ہونے نے انھیں مسلمانوں کے قریب کیا۔ پھوٹوں کے مسلمان ہونے کا واقعہ بھی لگتا ہے۔ پھوٹوں کو چھو (برادر برادر) بولنے کی خواہش اس طرف دیکھ لی گئی ہے۔ سکھ اگر قوم ہے۔ اودھم عکس کو بداشت کرنا چاہا۔ لندن چاکر جزل واز کو وہ خود کرنا چاہا۔ اب اودھم عکس کے بیٹے پاپے تاس کے کسی دوست سے کھانے کیجئے کو پاپے تاس اور دینے سے کچھوں میں بھی نہیں پاپے تاس پاپے تاس گا۔

میں گولڈن ٹمپل میں پہنچی تو جلیا نوالہ بارش سے لکل لکل۔ جیسے میں دوسری جلیا نوالہ بارش میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک سکھ نے مجھے جوتے اتارنے کو کہا۔ اور سر پر کپڑے کی باندھتی۔ ایک جھگ اور کشش میرے اندر تحمل کی تھی جی۔ یہ وطن کی طرح گھری ہوئی عبادت ہے۔ بڑے شہرت عبادت کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں مذہب یا مذہبی طرز احساس کی قربت کا رہا ہے۔ اس خوش رنگ عبادت کا گھر شاہ لاہور کی شاہی مسجد کم خوبصورت نہ ہو۔ سکھوں نے سرتی جگہ چلی ہے۔ ستائے اس کا سنگ بنیاد حضرت میاں میر نے رکھا تھا اور سرتا۔ وہ سنگ بنیاد لاہور کی شاہی مسجد سے لکھا کر لایا گیا تھا۔ بعد میں

سید جبریل سنگھ مجنڈر اوالہ

اے دوست ہے سرداران کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ عربی میں سید کے معنی سردار ہیں۔ ہر سکھ
 ہے ہر مسلمان بھی بلکہ کچھ سردار ہے۔ تو ہر مسلمان سید نہیں۔ لیکن کی بجائے
 کے ساتھ "اب انہوں میں بڑا واسطہ لگا ہے۔ سو اب اعتراض بن گیا ہے۔ یا اعتراض نے سوال
 کی شکل دھاری ہے۔ بھارت کا پٹلا وزیر اعظم شروچہ جب سعودی عرب گیا تو سید ہی شروچہ کا گیا۔
 کہ کچھ خوبصورت برست تھا۔ کو اسرارہ سلطان شکم میں بڑھ گئے۔ یہ ملک خوشی اور خطرے کے استخراج سے
 پھوٹا تھا کہ کہیں سرد مسلمان ہی نہ ہو۔ اور وہ بھی شید سلطان سیدوں کی غالب حکومت شید ہے۔
 سید سنی ہو تو اہل تشیع! سید نہیں سمجھتے۔ سید شید ہو تو سنی اہل حنفی کہتے ہیں۔ ہمارے کچھ مسلمان
 علماء شیعوں کو کافروں سے زیادہ کافر سمجھتے ہیں۔ کچھ مسلمانوں کو خدا کی بات اتنی اچھی نہ لگی کہ ضروری کو
 کیوں یہ توفیق مل گئی۔ بھلا کسی ملک کے سربراہ کو مسلمان ہی کرنا تھا تو روس یا امریکہ کے صدور میں سے
 کسی کو کرنا۔ تاکہ نام اسلام کو چھ قندہ ہی ہوتا۔ مگر خدا کی مرضی کے آگے کسی کی جلی ہے۔ ضرور کامیاب
 ہو گا یہ چارے مسلمانوں کو کسی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ ایک سیانے آدمی نے یہ مسئلہ حل کر دیا کہ اگر ایک
 میراثی سید ہو سکتا ہے اور زمین جوانی میں ہو سکتا ہے اور سب کے سامنے ہو سکتا ہے تو ضرور تہودوں کا سردار
 ہے۔ ہر زمین زیادہ ہے۔ ہر زمین ویسے ہی ہندوؤں کے مولوی ہیں۔ بلکہ سید ہیں۔ جن کے ایک ہاتھ میں
 فتویٰ ہوتا ہے اور دوسرے میں جنت اور جہنم کا ٹکٹ۔ مگر جب اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صدر
 محمد ایوب خان سعودی عرب گیا تو اسے بھی سیدی کہا گیا لوگ اور پریشان ہو گئے۔ جو بھی وہاں جاتا ہے سید ہو
 کر آ جاتا ہے۔ عالمی ہو گیا کہ تھاکہ یہ بھی لوگوں کو بہت دیر میں معلوم ہوا کہ سید کسی قوم کا نام نہیں۔ نہ
 سردار صرف وہ سردار کے لئے مخصوص ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے پاکستان میں جناب ہے۔ انگلستان میں
 مسٹر۔ بھارت میں شری اور بھارتی پنجاب میں سرار ہے۔ پاکستانی پنجاب میں سرور میں بلکہ کچھ نہیں۔
 البتہ پنجاب کے سرانگلی روٹنے والے علاقوں میں سائیں (سٹیں) ہے۔ فرانس میں موسیو ہے۔ ایران میں
 آفک ہے۔ ہمارے آغا کو بھی قوم کا نام دے لیا۔ آغا کا وزن ہو گا آقا۔ ویسے آقا تو ایک قوم ایک ذات ہے۔
 سب "آفک" ایک فرخ کے ہوتے ہیں۔ آواز دھیمے میں بھی سرداروں کی عظمت ہے۔ اس لئے یہاں
 بھی زمین کی حکومت ہے۔ خدا جانے دوسرے شیعہ میں کیا حال ہے۔ وہاں حکومت مسلمانوں کی ہے۔
 سرداری ہندوؤں کا ہے۔ یعنی وہ بھی ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے کئی اور لفظوں کے بھی معنی بلکہ حراج بدل
 دیئے ہیں۔ اسرارہ سائیں معنی بدل دیئے ہیں۔ مثلاً وہ صاحب کو شریف کے معنوں میں

سمجھتے ہیں۔ جس طرح مسلمان حد شریف ائمہ شریف بولتے ہیں۔ سکھ اپنے مقدس مقامات کیلئے
 "صاحب" بولتے ہیں۔ دربار صاحب پرہیز صاحب۔ ورنہ انگریزوں کے جانے کے بعد ان جیسی
 عادات اور افسران عوامی والوں کو صاحب کہا جاتا ہے۔ اب گور صاحب کے بعد کالا صاحب ہر طرف
 چمک رہا ہے۔ کالے رنگ میں چمک آجائے تو یا کہنے۔ ایک بیوی۔
 گندی رنگ والا سردار جبریل سنگھ مجنڈر اوالہ اب سکھوں اور سکھوں کا سٹول ہے۔ اسٹھ عرب تو سید
 کہیں گے ہی! تین بھی سید کہتا ہوں۔ گولڈن تمپل کو اس کے لئے کربلا بنا دیا گیا ہے۔ لہجہ بیواہی میں
 ہر قوم اپکار سے لگے انار سے ہیں حسین جبریل سنگھ سکھوں کا زمین ہے

مسلم اتحاد سے ملے قربانی

جب کوئی قوم کسی معرکہ پر قیام پزیر ہوتی ہے تو اسے کسی سیاسی یا معاشی میزان پر نہیں تولا جاسکتا۔ جیسا سراج کے کاروباری دماغ پر مانع ہو سکے ہیں۔ ان کے سامنے ترازو پر ایک آدمی بیٹھ کر آدمیوں کے کسی طرح بھاری ہو جانا ہے۔ عقیم ملک کے وقت کو ایک کھوکھلے آدمی کے برابر ہے۔ ان میں ون ووٹ۔ ہندو سیاست کے سردار ضرور سے سنا رہا اگلے کو اس پیشے میں اپنا لیٹھا۔ شری شی کے راج میں سکھوں کو دن میں بارے نظر آئے گے۔ دولت برٹن مل حکم سننا راقوال سننے و شری شی توڑ دیا۔ جس کی کچھ پانچ پارے بھارت ہمارے جہان میں بکھری ہیں۔

جرنل سنگھ گولڈن نیپل میں گرفتاری دینے والے سکھوں کے جتنے سے کچھ دور کھڑا تھا۔ (ابھی گولڈن نیپل پر ہندو فتح نہ ہوئی تھی۔ دہڑنے کی مشق کر رہی تھی)۔ اس شخص کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ ماں باپ سے اس کا کام کسی معرکتہ کی گھڑی میں دکھاتا تھا۔ اس کی ماں سے اسے شہر کی پگھار میں جنم یا ہوگا۔ بچی ماں کی گود کچھ کم نہیں ہوتی۔ شہر کے ساتھ لڑنے والے کھیلے شرط ہو کر تھی کہ ان کی ماں زندہ ہو۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ شرط ہے تھی کہ ماں زندہ ہو۔ یہ دونوں باتیں درست معلوم ہوتی ہیں۔ شاید کسی زمانے میں شہر کیلئے لڑنے والی شرط ہوئی تھی۔ مگر جرنل سنگھ کا مقابلہ شہر کی خالہ سے ہوا۔

اس سبب پر یقین نہ ہو کہ اس کا مقصد صرف یہی حال ہے جو
 معزز انوار کے پاس آیا اور کسی سیوا (خدمت) کیلئے درخواست کی۔ مستحقیت کے لئے کہا کہ وہ سامنے
 جو منی کا گھڑا رکھا ہے۔ اس میں سے ایک پیرہنی کاٹواؤں پر جس عالم کا نام لکھا ہے اُسے پا کر ختم کر دو۔
 سکھ پریشان ہو گیا۔ شاید وہ خود کو عالمی بندو تھا حال میں خود کو خدا کے دوست کی حیثیت سے اس کے ہونٹ سے پکارتے
 سے پہلے پھر کاٹا تو ختم کر دو۔ ایک پیرہنی پر لکھا نام گھڑا اور اس گھڑے میں ذال دو۔ اس کے بعد
 کیا اور۔ راوی کا موصوفہ ہے عالم کے خلاف نہ لڑنے والا بھی عالم ہے۔ مظلوم کا یہ اعزاز ہے کہ وہ عالم
 جس سے مگر شرما ہے جب کہ وہ جان قربان کر دے۔ میرے دل نے کہا کہ میں مستحق کی حیثیت پر ہی کیا شعر
 لکھوں

یہ شعر ہے لوتے وہی خاتم سن
 کبھی میںوں مران دا شوق وہی سی
 میں اس کے بارے میں اور کیا کہوں کہ وہ تحسین بہن کا ہم عمر ہے۔ وہ کہتا ہے بلکہ اود کہندہ
 ہے۔ مسلمان نے ہانگ لے لیا۔ کروڑاں (بہنوں نے) نے اپنی حکومت چلائی۔ تے سدا آجکل ادا کیے

جنرل نیازی بھی نڈر رہیگا

ذات پات والے بھرت میں مجھے نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے انفرادیت (برتری) ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ تیار چن چن کے طور پر تعارف اب ویسے بھی وجہ اختراع نہیں رہا۔ جب تک جزل اسے کہے کہ نازی نژاد ہیں اور میرا خیال ہے وہ ہمیشہ نژاد رہیں گے۔ جان کی بازی لگانے والے ہمیشہ نژاد رہتے ہیں تو جان بچانے والے کیسے بھلائے جاسکتے ہیں۔ مجھے بھی جان بچانا جان قربان کرنے سے مشکل ہوتا ہے۔ یہ مشکل کام کر نژاد نے نازی صاحب تعریف سے مستحق ہیں۔ کتنے ہیں جزل نازی ایک قابل جرنیل تھا۔ انگریزوں کے اسے ملٹری کراس دیا اور پانچویں گنا کے انھوں نے موصوف کو اسی دن کیلے تیار کیا تھا۔ نچائے کہ مجھے حق میں زیادہ آتا ہے۔ سراق الدولہ یاد آتا ہے۔ نیچے سلطان یاد آتا ہے۔ یعنی نازی فیس آئے چاہیں اب یہ لوگ۔ ان لوگوں کو شرم آتی ہوگی۔ شہر شہید کو غمخیزوں کے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ وطن آیا تھا۔ جزل نازی کی موت پر بلکہ دلش کاچر سرخوں ہونا چاہیے اور بھارت کا ترانہ بھی مگر جزل صاحب کو مرنے کی جلدی نہیں۔ جزل کو معلوم نہ تھا کہ جب غری جماؤ اور بے لگات تواس سے پہلے کچھ نہیں اپنے ہاتھ پر مونی مار لیتا ہے۔ جزل نے یہ رسمی جملہ جاتی بعض عمل کئے خاندان کو کرتے سے بدوری ہوتے ہیں۔ اندر اسے علی گال میں انگریز پاکستان کے ڈوبنے کا حالانہ کر دیا تھا پھر دشمن کشمیریوں میں اپنے آپ کو بچا کر لانا نہ مگرتو نہیں۔ آدیں میں تو انی کشمیتاں جالانے کا حل موجود ہے۔ ان کشمیریوں کی راگ اب تک وقت کے دور میں بد رہی ہے علی گال کے دور اور کھ نکال کر اندر اسے اپنی آنکھوں میں لگائی۔ نظریہ ہونے کی اور کچھ۔ میرا اور توپ توپ کر میرے اندر آواز دیتا ہے کہ میانوالی کا کوئی سپوت کسی چانپناڑ ملے میں سرخو تاریخ کا ایک اور باب۔ تم کہہ گئے اقد کرے اس وقت تک جزل نازی بیکار ہے یا بے بزدل کر داریں کا کمریت ہاک انجام میں تلاش کر لینے میں غلطی نہیں کیا کرتا۔ اس شرماک سلسلے کے جو زیادہ بزدل ہے اور ظالم اور لالچی ہے۔ پہلے مرچے ہیں۔ غیر طبعی موت۔ ایک جزل نازی، جزل ملکا اور کئی سیاستدان جو لوگوں کی نظروں میں نہیں آئے۔ تاریخی نظروں سے کیسے چھپیں گے۔ وقت نکلے ہاتھ کھڑا ہے۔

ماریشیا کے سرواں کے چمکے ہوئے سیاہ رنگ کی کھنٹی۔
 ستودہ عمارت کے ہماری اعلیٰ ترین کی کھنٹی۔
 حرمِ عظمیٰ جنگ دہائی نہیں۔ کوئی یہ بتائے کہ جنگ بندی کا
 نتیجہ دہائی کی عالمی سازش کے بعد ہمارے فوجوں نے ہو، ایک ایسے جینے پر قبضہ کیا تھا؟ اور سرحدوں پر
 گریز نہ کیا۔ دیتے رہے۔ "پانچرا" کی موت کے بعد وہ شرمینہ اعلیٰ ہوئے۔ کہتے ہیں کہ گریز
 کی موت آتی ہے تو وہ شرمینہ کا رنگ لے لیتے ہیں۔ یہ حکومت تاریخی اور مذہبی بننے کی ایک دن۔

پاک سرحد بینا پاکستان بہک

انجانی حسدانی

ہم نے کئی برس اس گھر میں گزار دیے۔ باتیں سنیں بچپن سے کرتے تھے۔ دوسرے دن رخصت ہوئے تو جیسے گھر سے رخصت ہوئے۔ گھر کسی کا ہو کر ہوتا ہے۔ وہ سب لوگ چپ تھے۔ ہر آدھ اوداع خاصو شیوں سے گرا ہوا تھا۔ جس نے ایک لمبے کیلئے سوچا کہ اس رشتے کا کیا نام ہو سکتا ہے۔ مجھے کچھ نہ سوجھا۔ ایک بہت اچھی نظم جس کا عنوان ایک نظم ہو۔ حسن و مال کا کوئی ناگزین نہیں تھا۔ چروں پر نہ تھا۔ کوئی جھڑنے کی گھڑی کس زونیک میں گھڑی تھی۔ دوبارہ ملنے کی آس آرزو کی چمک آنکھوں میں تھی تو بہت دور کس تھی۔ آسمانی سے نظر آنے والی نہ تھی۔ پھر کیا تھا۔ کچھ تھا۔ جس کیلئے لفظ نہیں جیتے۔ بنے ہوں گے۔ استعمال نہیں ہوتے۔ کون کس سے جدا ہو رہا تھا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ شاید اس ہوا سے جو ان کے وجود سے معاف کرنے کے بعد ہم سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کھلنے سے جو اس گھر کے ایک بچے کے ہاتھ سے گرا تھا اور میں نے اٹھا کے اسے دیا تھا۔ وہ مسکرایا پھر شرما دیا تھا۔ یا شرما دیا پھر مسکرایا تھا۔ کھلنے بچوں کے ہاتھ سے نہیں کر کے نوٹے تو چوہا ہوں۔ وہ بڑے تو نہیں ہو گئے۔ اچھے لوگوں سے ملنے کی خواہش تو رہتی ہے دل میں۔ یہی کہی جاتی ہے۔

— ہم امرتسر سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک بچے سڑک پر ہاتھ پھیلا کر ہمیں اوداع کہہ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کارے باہر کیا اور اسے جواب میں سلام کیا تو وہ ایک اونچی خوشی سے کھٹک اٹھا۔ وہ ہر گز نہ گاری کو اوداع کہہ رہا تھا۔ جبکہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ایک لمبے کیلئے پھرنے کا احساس مجھے ہوا مجھے یہ بھی احساس ساہوکار میں بھارت سے جا رہا ہوں۔ اگر میں گارنٹ نہ ہوتا تو میرے قدم ضرور رکھتے۔ جب قدم زمین پر نہ ہوں تو تین بے آگڑے آگڑے رہتے ہیں۔ مثلی اواز کہ ہماری آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ مٹی پاؤں نہ چھوئے تو آری اپنے پاؤں میں پھنسی مٹی بن جاتا ہے۔

سڑک کے ساتھ کچھ لوگ پیدل چل رہے تھے۔ مرد اور عورت بھی۔ مکمل نے بتایا کہ آج بھی کئی لوگ پیدل واگے تک چلے جاتے ہیں۔ یہ توان کے چلنے کا نواز بھی بتا رہا تھا کہ وہ جاننے ہیں۔ یہ عورتیں مورتیوں کی طرح چل رہی تھیں۔ ان کے پیروں میں مٹی پڑ رہی تھی جس طرح ان کی نور (چال) دیکھنے والی تھی اور وہ غامضی اور (شان) سے چل رہی تھیں۔

میںوں لے دے پانزیان نوبان

میں جے قتل میری نور

جن کے پاؤں میں پانزیان میں جو تھیں۔ خواہشیں ٹھکڑوں کی طرح ان کے اندر بچ اٹھتی

اپنے چارے وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی محسوس ہوا جیسے ہم جنت میں داخل ہوئے ہوں۔ یہاں مجھے اور کئی لاکھوں لوگوں کو تکلیفیں ہیں یہاں میں جیون اور جنم میں بعض اوقات کچھ فرق نہیں ہوتا۔ مگر بھارت سے واپسی کے بعد خوابوں سے بھری ہوئی تیز سے بیداری کا احساس ہوا۔ سماج تھا کہ پاکستان کی خواہ خواہ حالت کرنے والوں کو بھارت کا چکر ضرور لگوا دیا جائے کبھی کی حفاظت ہماری راحت کا احساس کرانے کے لئے ضرور چاہئے والوں کو ایک آدھ غوطہ کھول دیا جائے

عجب بات ہے کہ پاکستان ساری دنیا سے کرکٹ بائی بیچ جیت جائے تو کچھ نہیں ہوتا۔ مگر بھارت کے مقابلے میں کوئی کامیابی شادیانی کالیک نہانہ حقیق کر دیتی ہے۔ یہ دونوں ملک دوستی کے میدان میں بھی ایک دوسرے کے مقابلہ رہیں گے یہ نفسیات طرف تہذیب و تارخ مٹی گرائیوں میں اتر چکی ہے۔

پاک سرحد پر کوئی ہمارا استقبال کرنے والا نہ تھا پھر بھی ہوا کہ ہمارا جو ایک باتوں ڈانٹنے کی طرح ہماری سانسوں میں چل گیا۔ ہوائی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ انہی سانسے بھارت کی نفسیات نظر آ رہی تھیں۔ کسی احساس نے کچھ نہ کچھ بدل دیا تھا غریبی اندر۔

ہم واگے سے شالاد باغ تک آئے ہوئے آگے کرانے کی کاریں بڑی تیز طرار ہوتی ہیں شالاد باغ کی نسبت سے یہ علاقہ پانچواں دورہ کھاتا ہے بھارت کے بندو اسے بھوکاں پر دیکھتے تھے۔ پھر شالاد باغ کا کیا نام ہوا۔ اب یہ باغ ایک عام سیر جگہ ہے۔ اس کے قریب ہی ایک اور تفریح گاہ بن گئی ہے۔ جلوباگ۔ عجباب کے ایک گورنر جنرل جیلانی خان نے بنوائی ہے۔ گورنر جیلانی کی زندگی کے ساتھ نہ دیا دوت وہ پورے لاہور کو تفریح گاہ میں تبدیل کر دیا۔ جیلانی اسی زرخیز سے مگر گورنر نہیں تو یہ کیا زندگی ہوئی۔ محض اقبال نہیں کو اس گراؤ میں نہ پاکستان اور کئی دوسری جمہوری بڑی پارکیں۔ ایک انداز سے گھروں والے کچھ دیر کے لئے حوالے لیتے ہیں شائیں اداسی کا حسن بن لگتی ہیں کبھی سڑکیں ہوا رنگ شاداب ہو چکی ہیں البتہ جو اسے قریب میں ہیں۔ ان کا حال غریبوں میں بیسی ہے لوگ دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ ان کی طرف قد و زوالی یازیر اعظم یو سی سنگھ آئے۔

ہلاں کلان بھی بننے ہیں شہروں میں لینے کسی بھی کچھ گاؤں کو ہلاں کلان نہیں کہا جاسکتا ہے۔ دست بعد ایک شہری پاور نواز شریف عجباب کا وزیر اعلیٰ بن گئے۔ شاید وہ یہاں کی بھی قسمت جاگے ورنہ ہلاں کلان چنڈو وزیر اعلیٰ مقرر شائیں کے ہاتھوں جو ان میں بھی اپریل قبل بنے رہے ہیں۔ بہر حال لاہور میں ایسی جگہوں پر

کی طرح مرتجع طوائف ہوتا ہے۔ یہ کیارا ہے۔ راز ہم سے روختے جا رہے ہیں۔ شاہ سے پہلے کبھی میل چڑھاؤں والے دن سارے شہر میں اندھیرا ہو جاتا تھا۔ شاہ جین کے حصار پر ایک دیوار اٹھتا تھا۔ کیا لکھتا ہو گا وہ ایک دیوار اس چراغ سے چرائے جلتے تھے۔ وہاں پڑتی تھی۔ ہوشیار والا جاتا تھا خالص قندیں سرکاری پورے جون پڑتی تھیں سارے شہر کے مرد عورتیں بیٹے بیٹے سے منع ہوتے تھے ان دنوں میں لاہور کی شہروں کا شہر بن جاتا تھا۔ نہ کسی کی جیب نکلتی تھی نہ کسی کا سر پھٹتا تھا نہ کسی کی گچھی چمکتی تھی۔ اب اس دن صرف چمکتی ہوتی ہے۔ ویسے بھی مسرب آج کل چمکتی ہے پر اب میل چڑھاؤں کے دن اندھیرا تو نہیں ہوتا تھا یہ شہر میں نظر کچھ نہیں آتا لوگ کہیں سے نظر تو آ رہا ہے سب کچھ۔ نائے نائیں لوگ زکیاں و کاش سرس اور کیا نظر آئے عیالیک جانتا ہے کہ اس دن واپس لاؤ لڈ شینگ کی کرویں چکا جو نہ میں اندھے سی نہ ہو جائیں دیکھنے والے تیب لوگوں کے دنوں میں مٹی کا واسطیاقا تپ لوگوں کو چند صیادے والی روشنیان چاہیں

جس طرف ہماری سواری جاری تھی دور تک کوئی قابل ذکر جگہ نہیں ارد گرد سے درختوں کی طرح گھریں گھر کی کامیاب ساتھ والے گھر تک نہیں جاتا

اک نہانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے

اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے۔

کچھ دور ہمارے بائیں ہاتھ شہر سے رہی ہے چار شہر لاہور کا سینہ ستار کے گزرتی ہے۔ خلاستیم کی طرح سیدھی۔ خوش منظر۔ دونوں طرف راست۔ گھر میں کوئی ایک بھی پیدل چلا ہو نظر نہ آئے گا۔ نہ قندور دور تک بکھرتا ہے۔ نہ مسکراہٹ دیر تک نکلتی ہے۔ نہ انگلیوں کے پونے کو اڑنے دیا جاتا ہے۔ نہ آرزو کے منظر کو بکھلے دیا جاتا ہے۔ تاکہ کسی سیدھا منور سے جاتے ہیں لاٹھی کی آروں میں میٹھے ہوئے لوگ۔ راہ راست بھی خوبصورت ہوتا ہے۔ گھر اس پہلے والے جو بھی ہیں۔ وہی ہو جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ آپ رواں کے کنارے کوئی درندہ کسی چاندور پر حمل نہیں کرتا۔ اگر اب بھی ایسا ہو جاتا ہے تو اس درندے میں ضرور کوئی آدمی چھپا ہوا ہو گا۔ خبر سہری سے پائی جگہ پر۔ اور ہم ریٹے شیشیں دو مورچے پل سے گزرتے ہوئے شیرازوال گیت سے بھی آگے چلے جاتے۔ گھر خوشبو سے روک لیا۔ وہی خوشبو ہے جو مولانا محمد علی لاہوری کی وفات پر مٹی قبر کی مٹی سے آتی تھی۔ آج بھی کوئی اس خوشبو سے بڑا بکھڑو ہوا ہے محسوس کر سکتا ہے۔ بیٹی بھائی کی نوپ کی تجرہ گاہوں میں وہی سے چارے ہار گئے۔ خوشبو کے اجڑاؤ میں ہیں بھر بھی ہے۔ تجانبے کس دینی خوشبو ہے۔ لاہوری صاحب کبھی مسجد سے بازار میں دیکھتے تھے تو کہتے۔ "کوئی انسان نظر میں آتا کوئی کھتا ہے کوئی بھیرا۔ کوئی بزدل کوئی گدا کوئی سانپ کوئی چہا" پھر ان میں سے خوشبو کس کو آئے۔

لاہری لڑے سے ہمیں دیکھیں لکل لکل کر اپنے منہوں کو جاری تھیں۔ بسوں اور وہ ٹولوں سے ایک سی آوازیں دہر کر پھر آ رہی تھیں۔ کہیں گاتے ہو رہے تھے کہیں خیرات بوری تھی۔ دونوں ایک

جانتا ہوتا ہے تو چیلانی صاحب یاد آتے ہیں اب دور گور زمین تو ان سے ملاقات بھی ہو جائے کی میری ملاقات ایسا خال سے بھی ہوئی تھی۔ جب وہ صدر نہیں رہے تھے۔ یہ ملاقات بھی کسی ایسی یاد کے کوئے کھدے میں ہوئی تھی۔ اس جسم کے لوگ مجھ ایسوں سے ملنے کے لئے وقت سے پسند گزار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ نہ ہمارے پاس ہوتا ہے

صدر ضیاء الحق سے میری ایک سرسری ملاقات ہو چکی ہے بھی تو ان کو رینڈر ہونے کی ایسی جلدی نہیں۔ جب میں ان سے ملے وہ مجھ سے ملے تو اس وقت صدر نہیں تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ بالکل صدر نہیں ہوتے۔ کون جانے کس وقت وہ کیا ہوتے ہیں رنڈ کی کیا بات ہے وہ ان لوگوں سے تو ملنے چل پڑتے ہیں جن سے ملنا نا ضروری بھی نہیں ہو تا کبھی کسی ان سے بھی مل آتے ہیں جو ان سے ملنا نہیں چاہتے ان وقت پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں صدر ضیاء کی فکر کا سیاستدان کم کم ہے۔

تجانبے کیوں ہمارے ہاں لوگ وزیر اعظم سے زیادہ صدر کے لفظ سے مانوس ہیں۔ لفظ کی بھی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ صدر بنا آسان بھی ہے۔ کسی شخص کی مٹی سیاسی جماعت انفرسیاسی تنظیم کسی ادبی تقریب کا صدر بنایا جاسکتا ہے۔ کبھی اعظم کا لفظ وزیر کے ساتھ لگ کر اتنا معنی اور بھر پور ہو گا کہ وزیر اعظم کہتے ہی کوئی شخصت ذہن میں آجائے۔ جس طرح سکندر اعظم فاروق اعظم اشک اعظم مغل اعظم کا نور اعظم۔ یہ نام سیاست و ریاست کے حوالے سے مجھے یاد آتے ہیں۔ کچھ بھول بھی گئے ہوں گے۔

شالامار اور جلو پارک سے کچھ دور بھگانی کے لافانی شاعر شاہ حسین کا حصار ہے ہمارے ایک عالمی شہر کے نقیصات دان لاؤ لڈ ہم اہل کتنے ہیں کہ شاہ حسین اور خورشید غلام فرید دنیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ وہ خواجہ فرید کو بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ میں اس فہرست میں سلطان بابو علی شاہ میں اٹھ چل سرست کو بھی شامل کرنا ہوں۔ یہ سب لوگ صوفی تھے۔ عاشق تھے۔ کشادہ دل تھے۔ اللہ کے دوست تھے اللہ کے بندوں کے دوست تھے۔ شاہ حسین کچھ زیادہ تھا۔ اس نے ایک بندو بڑ کما دحوال سے عشق کیا اور مرنے کے بعد بھی اپنے ساتھ شلا مہل

شاہ حسین حیاتی لاؤ زمین حرن توں پہلے مرو

شاہ حسین ذکیات جانتا ہے تو مرنے سے پہلے چڑا دیو تو چل انسا موتو۔ اس نے شادی نہ کی۔ بے اولاد مرا۔ محرابے اولادوں کی گود ہری کرنے کے حوالے سے اس کی کوششیں کراستیں کی طرح مشہور ہیں خدا قادر ہے وہ چاہے تو کہیں سے بھی بندہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس سے بڑی کرامت کیا ہوگی کہ خود شاہ حسین مادحوال بن گیا۔

مادحوال مسلمان ہوا نہ شاہ حسین بندو بنا۔ دونوں دونوں چیزیں بن گئے۔ ظلم ہے کہ ہمارے انگریسی داندور لڈر صرف اردن کے شاہ حسین سے واقف ہیں شاہ حسین کے حصار پر میل چڑھاؤں بھی لگتا ہے ہمارے ہاں تقریباً سبیلے صوفیوں یا صوفی شہر کے حصاروں پر لگتے ہیں ان لوگوں کا مرقعہ ان کی مجلس

جیسے یادوں ایک جیسی۔ ایک ہی گناہ ہے بار بار گناہ جیسے ایک خبر ہے مسلسل شادی جاری ہے۔
ساتھ ہی شادی قلعہ ہے اور شادی مسجد۔ مظہر کی یاد کریں دیکھ کر حیرت اور ہیبت آدمی کی
دوست بنتی ہے۔ پھر یہ دونوں ایک ہو کر حسرت میں ڈھل جاتی ہیں۔ اب تو حسرت ہماری پکی یاد ہے۔
اب یہ دیکھئے اور دکھائے کی جگہ بن کر رہ گئی ہے۔ شادی مسجد ہے بھی دیکھنے کی چیز۔
سفید لباس میں عجمیہ کی طرح۔ شادی قلعہ اور شادی مسجد کے ساتھ شادی عکس بھی ہے۔ پہلے یہاں جو کچھ
علی الاعلان کیا جاتا تھا۔ اب چھپ چھپ کے کیا جاتا تھا۔ اس سے یہ ہوا کہ مجھے کسی کی شادی مجھے
کھل گئے ہیں۔ شادی مسجد شادی قلعہ شادی عکس کے درمیان ہزار اقبال ہے۔ ان تینوں مقالات سے اقبال
کی نئی یادیں وابستہ ہیں۔ ہم اقبال کو عظیم الامت شاعر مشرق مظہر پاکستان کے طور پر جانتے ہیں۔
ابھی کچھ بڑے بڑے بڑھیاں زندہ ہیں جو اقبال کو بہار سے ڈاکٹر کر پکارتی ہیں۔ اقبال ان باتوں سے بالا ہے۔
وہ اپنے اطوار میں عام آدمی تھا۔ کمالات میں خاص تھا۔

میر سے ملنے کا حرم اور بنا دو

اور قاترِ عظیم نے پاکستان بنادیا۔ حزار اقبال سے جتنا پاکستان نظر آتا ہے۔ اسے یاد گار قرار داد
پاکستان بھی کہتے ہیں۔ شہر کے بقیں چھ آتی کھلی جگہ۔ یہ کشادگی کس بات کی علامت ہے۔ شام کو یہاں
سیلہ سلگ جاتا ہے۔ چلتے بھی ہوئے لگ گئے ہیں۔ قرار داد پاکستان کا پورا مضمون دیواروں پر کندہ ہے۔ قیام
پاکستان کے بعد اس قرار داد کا وہی حال ہوا جو جیلوں اور اسٹیشنوں میں جگہ اقبال کو تمام حیرت کی جہل اسٹیشن میں
پیش کی جاسکے والی قرار دادوں کا ہوتا ہے۔ قرار داد پاکستان میں اپنے مطالبات بلکہ مفادات اسٹے طار کے
لگے ہیں۔ کہ وہ کسی یونین کو نسل کی قرار داد معلوم ہوتی ہے

یہ سب دیکھی ہوئی جیسے نئی نئی لگ رہی تھیں۔ یہ بھی شاید بھارت سے واپسی کا کوئی رنگ تھا
سلاستی کو نسل میں پالینڈی جس قرار داد کے دو کٹورے ہوئے۔ اصل میں قرار داد پاکستان کے دو کٹورے
ہوئے۔ پھر پاکستان کے دو کٹورے ہوئے جب آدمی پاکستان کو دنیا پاکستان کیا تو قرار داد پاکستان قرار
داد قیامت بن گئی۔ جتنا پاکستان کی دیواروں پر قرار داد پاکستان لگائی میں بھی لکھی ہوئی ہے جیسے رنگی پڑھا
میں آگ میں بھی مشرقی پاکستان میں گیا تھا۔ پھر میں اسے بلکہ دیش کہتے کوئی میں کرتا۔ مولوی فرید
احمد نے اپنے گھر کے چمن میں خون سے لٹ پت ہو کر پاکستان زندہ باد کا نعروں لگایا تھا۔ اس گھر کو پاکستان
سے الگ کون کرے گا۔ اب پاکستان کو بھی ایسا ہی بھرنا ہے کی خوشی کی جاری ہے۔

میر سے گھر کے دروازے بند تھے۔

تالے لگے ہوئے تھے۔ پتہ چلا کہ سب گھر والے اس موقع پر جتنا پاکستان لگے ہوئے ہیں۔ یاد گار
قرار داد پاکستان اب صرف قیام پاکستان بن گیا ہے۔ یاد لوگ پورے پاکستان کو اپنی قیام طبع کے لئے
استعمال کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

جتنا پاکستان والا چوک عمارتوں کا مرکز ہے۔ یہاں آئے جانے والوں کو سہ مدار چموندی پاجانا
ہے۔ اس لئے نرنگ لکھنؤ کی رہتی ہے اس عالم میں نرنگ بلیس کو کھل کھیلنے یعنی کھل کھانے کا خوب
موقع ملتا ہے۔ جتنا چوک امیں بہت پسند ہے۔ ویسے شہر کے ہر چوک پر ان کا قبضہ ہے۔ انکا اقتدار نے
قبل مضبوط رکھنے کے لئے پاکستان اور انڈی کی طرف جانے والے سب راستوں پر کی چوک کی غیر
ضروری چوک بنوا دی ہیں۔ اور ان پر ہر گھر لگا ہے۔

شہر سے چوک فیضان طے

تہ قیامت چوک فیضان

ہر چوک پر میں لگتا ہے جیسے دوڑا بھی شروع ہوئی ہو۔

شہر چوک پار کے کسے جتنا پاکستان چھپ چھپ کر خواہش میں تھا۔ کیونکہ اس وقت نہ تو شہر بڑا کھلی تھا نہ
چھٹی۔ بڑے چوک اور بے کسی کے درمیان ایک صورت مجھ سے ہے پچھنے لگی۔
"یہ جتنا پاکستان کیا ہے۔"

میں نے کہا کہ سامنے نظر آ رہا ہے۔

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے جتنا کو دیکھا تھا۔ اس عورت کو اپنی بات کے شائع ہوئے کا دکھ ہوا۔
اس نے مجھے کہا

"جتنا چھٹی پر ایک صورت بھی کھڑی ہے۔ اور کہی ہے۔" وہی تو کہی تھی میں نے سنا اور وہ جا
پہلی تھی۔ جتنا پاکستان بھی کیا ہے۔ الف (۱) کی طرح کیا ہے۔

تینوں اک الف بد رکھ

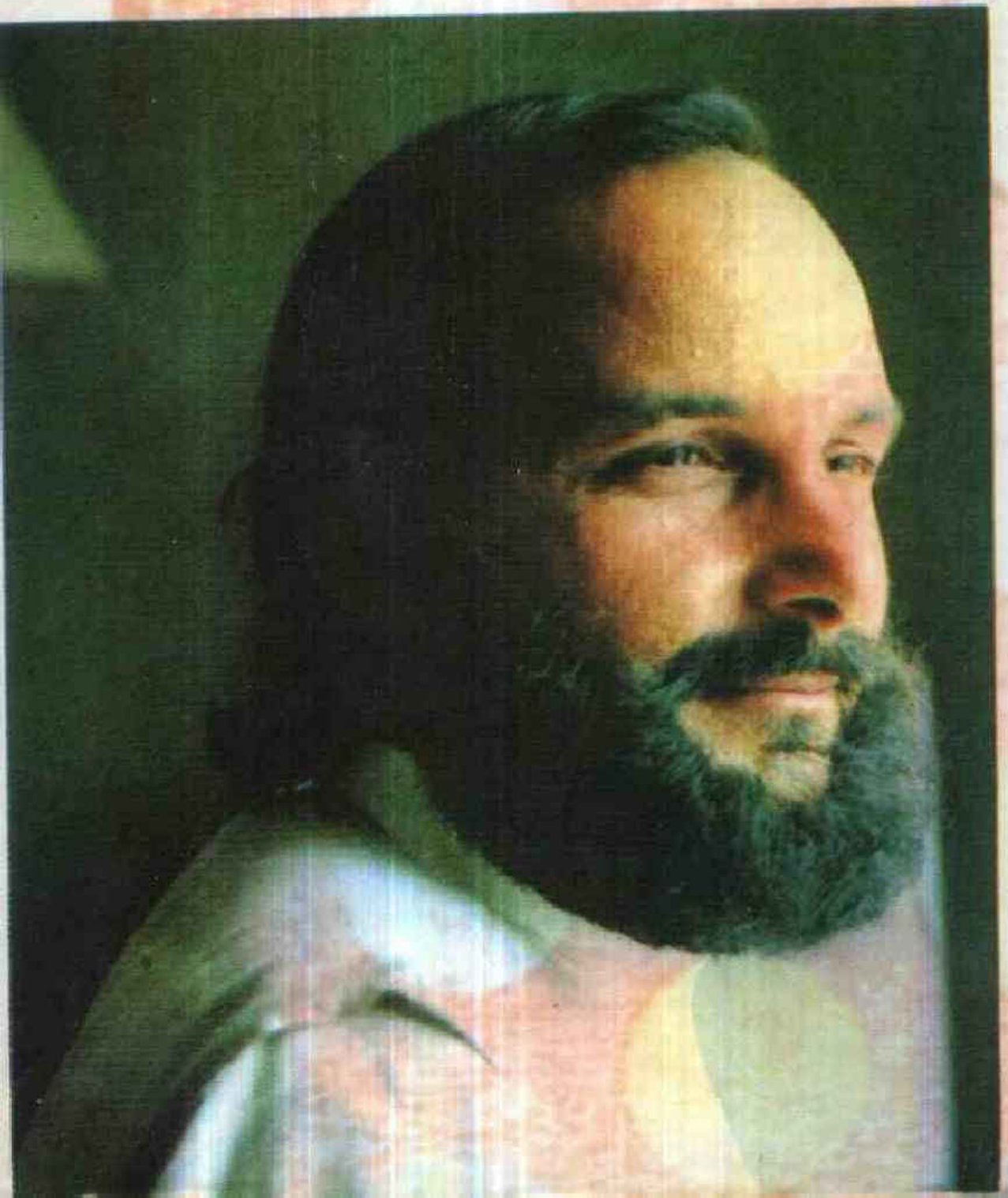
الف (۱) حروف کار سل ہے۔ رسول کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ہی جانتے ہیں۔ جن کی طرف سے بھیجا جاتا
ہے۔ رسول آخر نے کئی قیاموں پر کئی لوگوں کے بارے میں کہا تھا کہ "یہ مجھے جانتے ہے"

کس ہم ان لوگوں میں سے تو میں جو کہتے ہیں کہ ہم اپنے رسول کو جانتے ہیں مگر میں جانتے ہیں کہ اگر
کہوں کہ ہر شخص کی نہ کسی حوالے سے بگڑے کہ رسول ہوتا ہے۔ خود اپنا رسول ہوتا ہے۔ خود انخواست
میں ختم نبوت کی نفی میں کر رہا۔ ہر شخص کو بھیجا جاتا ہے۔ کہ نہ کسی کی طرف اپنے اندر کسی کی طرف۔ یہ

انگ بات ہے کہ اس راز کا مدی عمر سے اپنے چہنہ چلے۔
 علامہ اقبال اور قائد اعظم کو بھی سچا کیا تھا۔ زمینیں ایسے آدمی اپنے آدمی کی شکر رہتی ہیں۔
 محض موجود ہوتا ہے۔ کسی خاص لمحے میں اس کی موجودگی قیادت میں بدل جاتی ہے۔ اور لوگ اسے تسلیم
 کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی پاکستان تحریک برائے عمر میں داخل ہو رہا ہے۔ ۱۳۔ اگست ۱۹۸۸ء کو چارے چالیس
 برس ہو رہے ہیں۔

تاریخ و تہذیب کے استادوں پر بحث ایک آدمی زمانے کی آنکھ میں خود دار ہوا۔ اور سب کو سب کچھ
 نظر آئے گا محمد الرسول اللہ، عمر بن عبدالعزیز، شیر شاہ سوری، صلاح الدین ایوبی، لٹن، چیتا، جٹ،
 سوچی منہ، لنگرن، قائد اعظم، شاہ فیصل، فضا، الحق، گور باجوف۔ جب ہر طرف مایوسی پائی ہے تو پھر!
 ایک انسان پیدا ہوتا ہے۔ جسکی انسان کے اندر ایک اور انسان پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی جلد یہ واقعہ
 ہونے والا ہے۔ پھر یہ ثابت ہو جائے گا کہ پاکستان نہ بننا تو طبع کے کئی ملک بھارت کی کالونی ہوتے۔ پاکستان
 ان حربوں کا مرکز ہو گا۔ جن کے نتیجے میں ان سب علاقوں کی خاک چٹک اٹھے گی۔ جہاں مسلمان رہتے ہیں۔
 چارے منی ان امتیاز کو بھی منور کرتی چلی جائے گی۔ جہاں انسان لہتے ہیں۔ ذرا سی دیر کیلئے سہی یہ کائنات
 تہہ پڑ ہونے سے پہلے پہلے ٹھہر کر جائے گی۔ یہ سحر تہذیبی آنکھیں دیکھیں گی۔ ہم نہ ہونے تو دیکھنے والے
 ہوا کی آنکھوں کو دیکھیں گے۔

ملت اسلامیہ اور بنی نوع انسان کیلئے امیدوں اور خوابوں کے دروازے پر ایک انقلاب کی دستک ہو
 علامہ اقبال کی شاعری میں گونجی۔ اب ہر کہیں سنائی دے رہی ہے۔ اقبال بیسویں صدی کا سب سے بڑا
 شاعر ہے۔ اس کا نیا باج ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور وہ مقرر پاکستان بھی ہے۔ اس کے غیب کا دروازہ
 پاکستان میں کھلتا ہے۔



کھسی جی اپنے زمانے کی شان و شکھ والی تعمیریں دیکھ کر میری کیفیت وی جی جاتی جاوہ جلال والی تارخ پرچہ کر ہوئی ہے۔

ہمارے ملاحظہ ساتھ جلوس موجود تھا۔ ایک اور جھوم بھی عقاب میں تھا یہ سرکاری نوعیت کے فورسٹ تھے۔ ان کے ساتھ گائیڈ بھی تھا۔ گائیڈ کچھ سیاحت کرنا حماقت کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ہم حماقتیں کرتے، جے بی بجری حماقتیں کرتے، جے بی کئی پچائیں حماقتیں۔ جب آدمی کو پتہ چل جائے کہ وہ حماقت کر رہا ہے تو حماقت کے اندر کچھ مصمموتہ بناوہ جاتی ہے۔ گائیڈ کے پیچھے عورتیں لڑکیاں بچیاں سب کچھ بھانڈے سے کسی مغربی ملک کے۔ تعمیر تو وہ دیکھ رہے تھے جو تارخ اس وقت ان کو پڑھائی جا رہی تھی کہ وہ کھسی کو فنی تارخ تھی جس کی تارخ تھی ہم بھی اس کی فنی تارخ سے متعارف ہو رہے تھے۔ کئی مرتبہ کئی چروں پر ناگواری آئی۔ وہ اپنے مشاہدے اور سماعت میں ہم انکی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ وہ یہ تارخ نہ جانتے تھے اس لئے تخرج تھے۔ جو تارخ جاننے والے ہوتے ہیں اس میں مناسب اور غیر مناسب رو بدل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس وقت دیکھنے والے کو کھسی نے والا بٹنے کی اتنی ضرورت نہ تھی تعمیر اپنی تارخ خود بتاتی ہے۔ کھنڈر بولے ہیں خالی جیسے بھی کو کھسی ہیں۔ انھے آدمی کی بھی ایک جھنفت ہوئی ہے میں جانتا ہوں کہ ایک ان پڑھ نامہ گو قرآن پڑھا ہوا نہ تھا جب قرآن سنتو جواں قاری غلطی کر تا فور اس کی نشاندہی کر دیتا کسی نے تو چھا حضرت یہ کیا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ قرأت میری بندہ آنکھوں کے اندر ایک نور بن دیتی ہے جب غلطی ہوتی ہے تو نامہ کی جھانپائی ہے میں سمجھ لیتا ہوں یہاں غلطی ہو گئی ہے وہ دنیا بدل کا اعلان نہ تھا جیت بولے والے کی آواز میں ایک کرابت ہوتی ہے جسے صرف سچا آدمی ہی محسوس کر سکتا ہے ہر آدمی کے اندر صحبت سچ کو سمجھانے کا ایک نہ ایک بشر چھاپا ہوا ہے لہذا لوگ اس بشر کو اور چھاپے ہیں جو یہ بشر خود سمجھنے لے اس کیلئے کئی مشکل نہیں۔ لال قلم میں ہے جو کھنڈر ہے، بچوں بوزموں کا جلوس قہاج جھوت کا عقارہ کرنے میں لگا تھا قہاج قہاج کرنے آئے تھے یہ لوگ اور انھیں علم میں کیا ہوا تھا اس زمانے میں علم نامہ سے معلومات کا علم وہ نہیں جو سب جانتے ہیں بلکہ وہ جو صرف آپ جانتے ہیں۔ تارخ کتابوں میں مخری پڑی ہے پھر اس طرح مارا مارا مخری کی کیا ضرورت ہے لوگوں کو۔ لوگوں کو اپنی آنکھوں پر چھین میں آ رہا تھا کلاوں پر کیا آ گیا کیا دیکھ رہے تھے یہ لوگ کیا دیکھا یا پھر جانتے ہیں۔

میت برسے برسے تھے جو میت سکون سے کھڑے تھے ایک شہوہ آیا جیسے وہ کسی ستون پر کھسا ہوا تھا۔

ستون اپنے غنیمتوں میں کم کر رہا ہے

جب ایک ڈار اشماک کو لے کر نکلتا ہے

ابھی تو جن جوں وقت گزر رہا ہے یہ اشماک اور گزر رہا ہے میں ستون سے چپے لگا کر کھڑا

تہہ بی بی رفیع ایشانی لاہور میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ لاہور کا شہنشاہ قلعہ بھی کم نہیں۔ لال قلعہ کا رعب و اب زیادہ ہے اور میرے ذہن میں ایک ڈار یہ خیال آیا کہ بادشاہ اور سپہ سالار شہزادے شہزادیاں اور مصائب جب قلعہ میں داخل ہوتے تھے تو یہ محسوس کرتے تھے۔ آج جب وزیر اعظم کی آزادی پر سال سے تقریر پڑھ کر رہا ہے تو کیا میں جو تاج بادشاہ یہاں دیکھا یا تھا تو کیا ہوا تھا۔ جب لوگ قلعے میں اس طرح بے تکلفی اپنے پرانی سے نہ پھر سکتے تھے۔ لوگ اس قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اپنے مہرے اور حیثیت کے قلعے میں محصور ہو جاتے تھے۔ دلی میں ایمان صدر اور وزیر اعظم ہاؤس جب کے لال قلعے سے ذرا مختلف نہیں۔ حفاظتی انتظامات بھی کم نہیں بادشاہ کے چوب داروں میرے داروں اور اب وزیر اعظم کیساتھ پالیس کی گاڑیوں میں بھلا کیا فرق ہے پھر انتخاب اور انتخاب میں کتنا فرق ہے۔ میرا خیال ہے کہ فریادی کا بادشاہ سے ملنا آسان تھا۔ افسران آج کے حکمرانوں تک جھگڑ بھی نہیں چھینے دیتے۔ میں بادشاہت کا دفاع نہیں کر رہا ہوں صرف یہ کہ بادشاہت (آمریت) کسی نہ کسی شکل میں اب بھی قائم ہے۔ اسے قانونی اور اخلاقی اور عوامی تحفظ بھی دیا جائیگا۔ حکومت آج بھی ہے۔ اورنگ زیب نے مرے دم تک حکومت کی۔ نہرو بھی کی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اورنگ زیب اور جاتیسر مسلمان تھے۔ نہرو اور اندر ہندو تھے۔

لال قلعہ اپنے نامی کے شکوہ میں صمت کھڑا ہے بالکل مسلمانوں کی طرح۔ چند قدم آگے ہوئے تو بازار شروع ہو گیا۔ قلعہ اب تجارت کا مرکز بن کر رہ گیا ہے۔ کنکوں سے کم آمدنی فائدہ ہوتی ہوگی۔ یہ دکھائیں کرانے پر اٹھانے کا کیا فائدہ ہے۔ لوگ اس قلعے میں شاپنگ کرنے آتے ہیں۔ پھر لوگ کچھ کچھ خریداری کیوں کر رہے تھے۔ اہمیت خریدی ہوئی چیز کی نہیں ہوتی لال قلعے سے خریدی ہوئی چیز ہے۔ بیکنے والی تمام چیزیں انڈین میڈ تھیں۔ بیچنے والوں میں جو تھیں بھی جھنڈے وہ بھی انڈین میڈ تھیں۔ شاپنگ سنٹر کی اوپر کی منزل پر ہندوستان کی تارخ کو تصویر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تارخ کے ساتھ منتخب لوگوں نے کیا کیا سلوک نہیں کیا۔ مورخوں کے بعد مصوروں سے بھی یہ حرکت کروائی گئی ہے۔ مورخ فکاہ نہیں ہوتا ہے مگر مصور۔ متعجب ہونا چاہئے آدمی کو کہ جتنا سچا آدمی متعجب ہو سکتا ہے یہاںے مصور سارا جتن سے یہ خدمت دلی جاتی تو تارخ قہاج قہاج ایک ایسی دہائی صداقت کے طور پر سامنے آتی۔ مصور اقبال اسلم کمال ہے کام کرنا تو کمال ہو گیا تارخ بھی سلامت رہتا۔ اس قلعہ کو جدید تعمیر کار کنگ بھی دیا جا رہا ہے مگر تارخ ہر رنگ میں اپنا پتہ دیتی ہے ہم تارخ کے ہر اوج چلتے پھرتے دوبارہ بال میں بیٹھنے کی نعمت ہو چکی تھی کہ وہ دربار میں۔ وہ کہہ رہی تھی پڑی ہے جس پر شاہی بادشاہ سلامت تحریف رکھا کرتے تھے۔

کر ہی واقعی مضبوط ہوتی ہے مگر.....!

میرا جی چاہا دار یہ کیلئے کہ اس کر ہی نہیں۔ مجھے لگا یہ کسی خاص شخص کی شہر ہے لڑکی بڑی عمارت میں میری موجودگی ایک علامت تھی۔ یہ قلعہ یہ مسجدیں تعمیر نہیں کی تھیں کرنے والوں نے تارخ

نمازی حکمران کی ذاتی شخصیت

ہم ایک سارٹ سی پنڈت سی مسجد کے دروازے پر تھے جو ایک نمازی حکمران اور نگ زیب عالمگیر نے اپنے لئے بنوائی تھی۔ مسجد پر کسی مسلم طرز تعمیر کا ٹھکانہ تھا۔ مکالمہ پر بھی مسلم تہذیب اس وقت جب مسجد "مدرسہ" مرکز اور مورخہ ایک میدان میں رہتے تھے۔ اپنی بڑی سلطنت چلانے والا آدمی نماز با جماعت کیلئے وقت کیسے نکال لیتا تھا۔ ایک واقعہ بتھوے یارے قانبا کول کٹے کے قلعے کے محاصرے کے دوران جنگ تیز ہوئی۔ قلعے والوں کی طرف سے تیروں کی بارش شروع تھی کہ مسلمان لشکریوں میں سے ایک نے اذان پکارتی۔ بیٹھیں مسجد میں ہو گئیں۔ قلعے والوں نے مسلمانوں کو "بے کار" دیکھا تو برسات کچھ اور تیز کر دی۔ امام صاحب آگے بڑھے اور نماز کی نیت کیا تھی یہ خبر ہو گئی۔ ایک اور شخص آگے ہوا۔ قانع امام ہو گیا یا تہ کافق ادا کر تے ہی گر گیا۔ کچھ بھی نہیں ہوا ایک لمحے کا سکوت صفوں میں سرسرا گیا۔ موت کو قیل کرنا اور حق کو قبول کرنا برابر کا مشکل ہے۔ صاحبانِ قلعہ کیلئے یہ قاتلانہ قابلِ یقین حد تک عملی مظاہرہ تھا۔ یہ جو آدمی آگے بڑھا اور امام کے بیٹھے پر خون سے وضو کرنے والے دو ترپے تھوڑوں کے درمیان آکھڑا ہوا اور نگ زیب عالمگیر قلعہ اپنی قلعہ سے تیر اندازوں کو روک دیا اور نماز مکمل ہوتے ہی قلعے کی چابیوں اور نگ زیب کے حوالے کر دیں۔ میں اپنے اندر والے معترض کو فحشی میں جواب نہیں دینا کا کہ یہ سب نماز کی کرامت سے ہوا۔ کرامت تو اس سے بھی ہوئی جس نے بغیر ہمارے چاہیوں دے دیں۔ آجکل ہندو پولیس جاگتی ہے بونوں سمیت مسجدوں میں۔ نماز پڑھتے ہوئے کونسا جنازہ کیلئے تیار کر دیتی ہے۔ ایسا پاکستان میں بھی ہو چکا ہے کئی بار۔ نماز بذات خود "مجزوہ" کرامت ہے اس کے اثرات کیا ہوں گے نہ ذات پر نہ کائنات میں کوئی قلعہ جس میں سورہا آج کل نہ اندر نہ باہر نماز پڑھنا چھوڑتے جا رہے ہیں مسلمان اور انسان۔ خود میں نماز تکمیل پر دستوں نماز خود کو پڑھواتی نہیں مجھ سے۔ ذوق میں رہا ان لمیوں کا۔ تاخیر بھی نہیں دی جب یہ نئی طرح پر مبنی جاتی تھی تو رسم تھی درجن نہ تھی۔ ایک تہذیب تھی۔ اس تہذیب کا ایک نمائندہ اور نگ زیب تھا اس عظیم بادشاہ کی بچی بچی کرکچہ کر انتظار حسین نے اس کے خلاف کئے ہوئے سارے الفاظ واپس لے لئے بواپس لے کر نیمال نے بولے گئے کہیں اور کام آئیں گے۔ آج اس مسجد کی چوکھٹ پر میں اور نگ زیب کو یاد کرنے کیلئے لفظ حاشا کر رہا تھا۔ لفظ غصہ بھول گئے تھے جیسے نماز قضا ہو جاتی ہے۔

آج کا ایک حکمران صدر ضیاء الحق نماز کی پابندی بہت کر تا ہے۔ سنا ہے

امریکہ کے دورے پر وائٹ ہاؤس میں ملاقات یاغذاکرات کے درمیان نماز کیلئے کھڑا ہو گیا۔ وہاں خاص

منہک ہو گیا۔ شاید میں بھی اس وقت ایک ستن تھا۔ مجرور عمارت کہاں ہے جو میرے سارے کمزری ہے اس کے ساتھ ہی اٹھاک نہٹ گیا۔ میں وہاں سے بہت آگاہی عمارت کہیں گر پڑی تھی۔ میں ساتھ والے کمرے میں پھرنے لگا ان حویلیوں جیسے مکانوں کو کمرہ کتنا بڑا ہوتا ہے۔ بادشاہ کا ٹھکانا شہزادے شہزادیاں و درباری دربار میں کرتی کیا ہوں گی۔ یہاں جو بھی کیا ہو گا کسی نے کسی سے پوچھ کے تو نہ کیا ہو گا۔ ہم بھی یہاں ان کی اجازت کے بغیر گھوم رہے تھے۔ ان کے بارے میں بے سرو پائیاں سن رہے تھے اور چپ تھے۔ میں اس جھوکے میں جا کر ابو اجماع سے بادشاہ و شہنشاہ دیکر ہاتھ دیا کہ۔ سامنے قلعے میں ایک ایک آدھورانی تھی اور قلعے کی دیوار کے باہر مرکز پر لوگ آ جا رہے تھے۔ اس کے آگے دریاے جرنائیک سڑک کی طرح بسر رہا ہے۔ قلعے میں پھرتے ہوئے کوئی مقل بادشاہ بہت یاد آتا وہ ہزار شاہ ظفر تھا کہ وہ نہ شاعر بن سکا نہ بادشاہ۔ اس کی حکومت اور شاعری بھلائے والی چیزیں تھیں۔ اس نے پنجابی میں بھی شاعری کی کیا کیا کام کرنے کی حسرت تھی اسے۔

یامراتاج گدا بننا پتا ہوتا

یا مجھے افسر شاہناہ پتا ہوتا

کسی کسی حالتوں میں زندگی کے رکھی اس ہے بس بادشاہ نے۔ اس بادشاہ کے بارے میں فلم بنائی جائے تو کمال کی فلم ہے۔ غریب و فراز اور کمال و ذوال کی ایک داستان اس کی سانسوں میں آباد ہوتی رہی۔ اس کے ساتھ ایک آخری باب ختم ہو گیا۔ دروازہ بند ہو گیا قلعہ معنی کا۔ ہم اسی دروازے سے آئے تھے جیسے چور دروازے سے آئے تھے۔ ہمارے ملاوہ جو بھی یہاں آئے دروازے سے ہی آجائیں اپنے آپ سے چھٹا پھرنا تھا۔ یہ کیا کمرہ ہے یہ جگہ کیوں بنوائی گئی تھی۔ یہ قہر خانہ کس لئے تھا کس کیلئے قلعہ کی بیڑیاں کہاں جاتی ہیں خود سوال کرتا تھا خود سے اور جواب کا انتظار کے بغیر آگے بولتا تھا تھکے یقین تھا کہ صحیح جواب دینے والا ہے نہیں کہیں چھاپا ہو اہم گھوم گھوم کے اس چھاپا جانے والی عمارت میں تھک گئے۔ ہم باہر نکل آئے اور مرکز کے دیکھا تو شان و شکوہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عمارتوں کو دیکھ لینے کے بعد ان میں گھوم پھر لینے کے بعد آدمی سوچتا ہے جیسے اس نے انھیں فتح کر لیا ہو۔ مگر اس عمارت نے ہمیں مفتوں نہ چھوڑا تھا۔ شاہی تہذیب و ثقافت کے بغیر شاہانہ کردار ہے اب تک قلعے کے سارے معجزوں میں۔

جس آدمی سے کام لینا چاہے" لے لیتا ہے۔ صدر ضیاء الحق نے بھی خدا سے جو کام کیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں۔ انجانی ہمت کی بات ہے۔ صدر ضیاء کی تقریروں کی بڑی دھوم ہے۔ لوگ اس کی تقریروں سے متاثر ہوتے ہیں۔ تقریر کے بعد صدیق سالک دادومول کرنے کو منتظر ہوتا ہے۔ وہ بات بہت مزیدار ہوتی ہے جو صدر ضیاء جیٹکا تار کے تارے کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ سالک کی ہونگیاں شائع ہوتی ہیں صدر ضیاء نے لکھ کر اسے دی ہیں لہذا جانے۔ جس غیر معمولی آنکھوں والے اور دلدار رویوں والے اس شخص کی تعریف نہیں کر رہا جو مال لہاؤنے منتظر بنوا" اس کے اندر کسی اور انسان کی بات کر رہا ہوں۔

وہ بڑا گرا "پکا" سوہنا "وصفا" اعلیٰ اور بھلا آدمی ہے۔ ایک مشکل آدمی۔ گلن آسان آسان ہے "وہ آہستہ خرام ندی کی طرح ہے مگر اس کے اندر طوفان چٹکارتے ہیں۔ اس کلاخ عوامی اور کردار اسلامی ہے۔ وہ سیاسی معنوں میں آمر ہو گا مگر ہم نے جو تصور یہت میں بھی آمریت کے حربے چکے ہیں۔ حکمران ہمارا خطاب ہے نہ موضوع۔ پس ایک بات ہمیں انسپائر کرتی ہے کہ ضیاء کوئی عام اور رواجی حکمران نہیں۔ رہی انسان کی بات تو انسان وہی اچھا جو انسانوں کے لئے اچھا۔

پاکستان ایک حلقہ ملک ہے۔ یہاں نظام بھی ساری دنیا سے متاثر ہوتا چاہئے۔ وہ نظام کون لائے گا۔ صدر ضیاء کو اگر معلوم بھی ہے تو نہیں بتائے گا۔ بتانے اسے انکار بھی نہیں کرے گا اور نماز پڑھنے چلا جائے گا۔ کچھ لوگ صدر ضیاء کو پاکستانی تاریخ کا ورنگ زیب کہتے ہیں ان میں سے کچھ مثبت حوالے بتاتے کرتے ہیں اور کچھ منفی انداز میں۔ اورنگ زیب ایک جلیل القدر مگر خزانہ عکراں تھا۔ خزانہ غصص جتنا معتوب ہوئے اسے اتنی ہی عجیب بھی ہوتا ہے۔ صدر ضیاء کیلئے سائنٹ کا رکتے ہیں مخالف دلوں میں موجود ہے۔ صدر خٹیا کو کچھ لوگ اورنگ زیب کا حلیہ کہتے ہیں۔ جبکہ ارادے اس کے صلاح اعدائے اپنی والے ہیں۔

ضیاء مورخ اس کے ساتھ بھی اورنگ زیب والا سلوک کریں۔ نماز کے علاوہ بھی کئی باتیں اسے اس حکمران کے قریب تر کرنی ہیں نماز تو وہ اس وقت بھی پڑھتا تھا جب صدر نہ تھا جب بظاہر کچھ بھی نہ تھا۔ جب بھی وہ شکار اور خاکسار اس کی ذاتی زندگی ذرا بھر میں بدلی۔ بڑی بات ہے۔ اکثر آدمی ایوان اقتدار میں داخل ہوئے ہی خدا بن جیتے ہیں۔ خدا کو بھی اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تجاہل کیوں کبھی بھی جی کرنا ہے صدر بننے کے بعد وہ کچھ تو بدلتے زندگی دو بلاؤں کے فرشتے ہیں جسکی جارحی ہے شرمندگی اور زندگی "اندھیلے اور اندھیرے۔ عموماً اور مایاں۔ سیاست اور سازش "دشوت اور دھوت" منافقت اور منافرت "مخادور فساد اور اس طرح کے کئی بھی وہ لفظ کسی کے ذہن میں ہوں وہ بھی۔ انفرادی اور نفسیاتی میں نماز با جماعت پڑھنے کا کس کو شوق ہو گا۔ نماز ایک ذاتی اور خفیہ فعل نہ بن جائے نماز میں مسلمانوں پر یہ مقدمات آتے رہے ہیں میدان جنگ میں تو نماز ہو سکتی ہے جس میدان میں اپنے انہوں سے سر پرکار ہوں اور بھگدڑی ہوتی ہوں؟

اس دور میں کوئی بتانے والا ہے کہ نماز کی روحانی حیثیت کیا ہے۔ اس کی دنیاوی افادیت کیا ہے۔

انتظام کیا گیا ہست خود اس نے کی "دیکھا گیا کہ پر اوائٹ ہاؤس اس لوگے منظر کے سامنے منظر بنا ہوا تھا۔ پاکستان میں بھی لوگ منظر بننے کے منتظر ہیں میں ہوں ابھی کوئی۔ کھل ہونے ہی نہیں دیا جاتا۔ لوگ مکمل منظر بننے کے متباب سر رہے ہیں۔ یہاں تو تھانہ جی غیر مکمل حالت میں ہر طرف پھیلا دے گئے ہیں۔ سخت اور حکومت میں برابر کا فاصلہ رکھا جاتا ہے۔ بحیثیت ایک خطیلمیں ایک زمانہ صدر ضیاء کا محفل ہے۔ باقی نچر وہ ایک اچھا انسان ہے۔ سادہ اور سنا "یعنی سیاستدان کم ہم کو کا کوئی اُس جیسا سیاستدان۔ حسن سلوک کھارنگ اور تعلقات کی آجڑی ہوتی جگہوں میں گھر بنانے والا آدمی لایا اس اور قومی زبان کا دلدار وہ۔ پڑھنے والے کی قدر کرنے والا۔ بہت زبردست پیگ ریشٹش دوست اور دشمن کا اپنے جذبات کا پتہ نہ دیتا والا۔ اس کے اردوں کے بارے میں اس کے قریب ترین لوگ بھی کچھ جان نہیں سکے۔ وہی تو میں جان سکے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی دل کی بات خدا کو بھی کچھ دیر پتہ نہ چلے۔ ملک میں کوئی اچھا آدمی کوئی بڑا آدمی کوئی فنکار اور دب و شاعر مرے اس کی تعریف ضرور کرتا ہے۔ کچھ کے گھر بھی پہنچ جاتا ہے۔ نماز جنازہ بھی پڑھ آتا ہے۔ روس کے تین صدروں کو قبر میں تار آیا۔ حالانکہ اس عمل سے وہ سے صدر کے دل میں کوئی خاص بات پتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اندر کی چٹائی آگ دکھانے بھی پہنچ گیا جبکہ اندر اس کے اقتدار کو رکھ کر دیا جاتا تھا۔ پاکستان کے اندر اس کے خلاف حالات جب اپنی انتہا پہنچتے ہیں تو ایک ملک اس کی ٹی کامیابیوں کی ایک اور انتہا ہوتی ہے کچھ لوگ اس کے ارد گرد پراسرار قوتوں کا قص بھی دیکھ لیتے ہیں۔ محض کامیابیوں کا انبار اس کے ارد گرد ہے۔ کچھ لوگوں کو یقین ہے کہ وہ دو ایک سیاسی کارنامے بھی کرے گا اور ایک آدھ فکری معرکہ بھی مارے گا۔ مگر کسب مطمئن اردوں والا صدر ضیاء سوال کوئی سوال حل کر رہے گا۔ سوال نہ بھی کیا جائے تو بھی وہ نہیں پڑے گا یہ اسے ایک بے ساختہ کھٹکلا پٹ اس کے چہرے پر کھتی ہے اور پورے سراپے پر کھتی چلی جاتی ہے۔ کہتے ہیں یہ بڑا گناہے جن رکھے ہوئے ہیں اور صدر ضیاء نے فرشتے پالے ہوئے ہیں۔ مشکل سے مشکل حالات میں نہ پریشان ہوا ہے نہ شخصیت میں اتھارے۔ الٹا بننا ہی ہے بڑے سے زیادہ دھڑ رسول پر حاضر ہوتا ہے وہاں اسے روٹا ہوا بھی دیکھا گیا ہے۔ وہ نفاذ اسلام میں کامیاب نہیں ہوا۔ اُس مسئلے میں علماء پاکستان نے اس کے ساتھ کوئی خاص تعاون یا ناکل تعاون نہیں کیا۔ ہمارے لیڈر مولوی نفاذ اسلام کے حق میں ہیں مگر شرط ہے کہ پہلا غلیظان کوٹنا چاہیے تاکہ وہ اپسٹ روٹ نافذ کریں۔ کچھ مسلمان حکومتوں والے صدر ضیاء کو پسند نہیں کرتے مگر وہ عالم اسلام کا نمائندہ ہیں کہ اقوام متحدہ کو خطاب کر آیا۔ چل بار وہاں قرآن کریم کی آیات مقدسہ کی تلاوت ہوئی۔ یہ آواز ساری دنیا کے نمائندہ لوگوں نے سنی اس کی تقریر دنیا بھر کے ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات سے لوگوں تک پہنچی۔ اس نے تقریر میں رسول کریم کے آخری خطبہ کا ترجمہ سنا دیا جو انسانیت کے منظور اول کے طور پر معروف ہے۔ رسول کریم نے اس وقت قربا یا قاسم کو جو یہاں موجود ہوا۔ ان تک میری بات پہنچا دو جو یہاں نہیں ہیں۔ یہ ازلی وابدی اہمیت کا بیضام زمین پر چلنے والے تمام انسانوں تک صدر ضیاء کی معرفت پہنچ گیا۔ حج ہے خدا

تاریخ میں کیا کیلا واقعات اس کی بدولت رونما ہوئے۔ ہم نماز کیا پڑھیں؟ پڑھیں بھی تو کیا ہو جائیگا کہ وہ گناہ ہو جائے گا جب وہ پانچ گنا پڑھیں گے۔ دیکھیں گے جو ہوں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ عورت خوشبو اور نماز میرے نزدیک عورت سے وصال کرنا۔ خوشبو لگا کر نماز پڑھنا کسی عمل کے نام ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا کہ جس نے ان باتوں سے منع ہوا۔ ہم نے نبی کی برکت کو قیسموں، فرقوں اور جھگڑوں میں برباد کیا یہ تین چیزیں اپنی اصلیت کو قائم جاری ہیں۔ عورت دلوں پر راج کرتی تھی۔ خوشبو دماغوں کو فرحت دیتی تھی نماز آنکھوں کی خشک کر تھی۔ معصومیت نے محبوبیت کو لٹکا دیا۔ نبیوں نے بھی سوچا کہ خیر انسانیت کیا پسند کرے؟ آقا کا وہ ہم کیا کیا ہیں ہم جو کہہ کر تے ہیں پہلے سوچتے ہیں کہ اس میں کیا فائدہ ہو گا جب وہ کام نہیں کرتے سوچتے ہیں کہ یہ نہ کرنے سے کیا فائدہ ہو گا تب بھی پہلے نہیں کہہ پائے کہ کس طرح نماز پڑھنا درست ہے۔ رسول اعظم نے سب سے کثیر کام جو کیا وہ نماز تھی اس کے بارے میں اختلافات عجیب عجیب سو سے پیدا کرتا ہے۔ آج مختلف مختلف عقائد ہیں نماز پڑھنے والوں کے۔ نماز تو ایک منظر تھا۔ ایک عظیم اور مشترک عمل۔ ہم ایک عقائد کے نرے میں بسر ہو رہے ہیں۔ ایک بے عمل تسلسل میں مگر رہے ہیں

نہ میں پڑھی نماز نہ میں یاد خداؤں کہتا
نہ بیایں غفلت تو نہ میں جام شراب دیتا
اے داؤد وی ایوں منگیا
کوئی وی کہ نہ ہوا

کسی شرم میں کوئی بڑا آدمی گیا ایک لمبی قطار میں کھڑے لوگ اس سے تعارف کر رہے تھے کوئی کیا تھا کوئی کیا تھا ایک بندے کو کچھ نہ سوجھا اپنے بارے میں تو اس نے کہا۔

”صاحب میں ایوں دینی درواہاں“ (میں دینی درواہوں) ہمیں بھی تعارف کیلئے تاریخ کی لمبی قطار میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ہم بھول بیٹھے ہیں کہ ہم کیا ہیں؟ ہم بھی ”ایوں دینی دروے“ آں۔ لال قلعے میں بھی ہم ایوں بھر رہے تھے اور عالمگیری مسجد میں ایوں داخل ہو گئے تھے۔ ہم نے جو تاج اندوس، سرکاری فورسوں کو کپڑے کی جو تیاں پڑنا دی گئیں قدیم سب تک نہ میں کو نہ چھوئیں اپنے ہونے کا خاص ہی نہیں ہو نہ مسجد وصال کی کیفیت پاؤں رکھنے اور مانتا رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مسجد سترہ سو اسی بیس دہائی دہائی کی طرح جو کب سے بیٹھی ہو۔

ہر۔ یہ فرض کب سے بعدوں ہماری جہیں کے لئے ترس گیا ہو گا ہم نے بھی یہ نہیں کیا ہے نماز نہ پڑھی تھی۔ یہ سب اپنے باطن میں کمزور ہیں۔ ان میں نماز پڑھ کے بھی کب پڑھتے ہیں ہم۔ ہم اس لمحے میں رہتے ہیں

تھے کیا تے گا نماز میں تھے کیا تے گا نماز میں

ہم نے نماز پڑھنا شروع کر دیا تھا ہمیں احساس ہوا کہ ہم بدو اور بدعتی ہیں پڑھنا ہمارا کام ہے بات ہو سکتی ہے کہ بدو اور وقت کیلئے ہمیں کمر میں رکھنا پڑے گا۔ ہمارا اصولی کام میں ہمارا کیا ہم نے مسجد کے دروازے کو چھو اٹھا ہے ارادہ پڑائی کر دے ہمارے ہاتھ تھک گئے تھے ہم نے ان باتوں سے منہ رگ لیا تھا ہمارا دوسرا منی سے منور ہو گیا تھا۔ ہمارے جسموں پر دھول ہی دھول اور ہمارے مسافر کا نظری طور پر نیم ہوتا ہے۔ یہی وقت کی بات تو ہم پر تو صدیاں سے زوال کا وقت مطلب ہے

یہ نماز عصر کا وقت ہے

یہ گڑھی ہے دن کے زوال کی

ہم خسارے میں ہیں اس سے بڑا اشارہ کیا ہو گا کہ ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہم تو دھوکے میں ہیں رہا خسارے میں رہتے سے بدتر ہے۔ گناہ ہم پانچوں وقت ”نماز عصر“ ہی پڑھتے ہیں ابھی ہم نے یہاں ”نماز عصر“ پڑھی تھی۔ یہ وقت تو لے پڑھو۔ ہاتھ منہ دھوئے وضو نہیں ہو جائے گا ہم بدو ہو کر بھی بے وضو ہیں ہمیں صلا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی ہو جائیگا جس نے صرف دل کے فتوے کا قائل ہوں اور اس لئے زوال کی صلیب پر دل بھی ہے دلی بھی گمراہ ہوا تھا۔ ہمارا ایک وزیر اعظم سپردی انتظامیہ کے لئے ایک نماز کی کیا پڑھنا بدو اور بدعتی ہیں۔ ایک دفعہ اس نے نماز عصر تھیں بار پڑھی تھانے نماز عصر کے بعد غروب تک کوئی نماز نہیں ہو سکتی۔ سپردی کو کیا علم تھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے کچھ لوگوں پر نماز پڑھنا لازم ہے بالکل اسی طرح جس طرح لوگوں کے لئے نماز پڑھنا فرض ہے۔ میرے ماما عباس خان سرگدیوئے مسجد کی نماز کی بجائے سہاواں کے بڑے شاعر اکبر شاعر کے گاؤں (گیت) گایا کرتے تھے براہ راست میں خلل کو کالی کھانا کھا لیا ہے۔ نماز کیا کیا کمال ہے جس بھی کے ساتھ مجھے ہو چاہے۔ نماز پڑھتے۔ انوں پر سلام۔ البتہ نمازی ہونے کے بعد تھے کمال کرنا آئے اسے نماز کی طرح تو ہیں نہیں کرتی چاہئے۔ نماز سرکاری تربیت کا معیار بھی تھی آج نماز پڑھنے والے بڑی اور منافقت کے پیکر ہیں نماز کے کاندھوں کا تو کیا دیکھ کر اس کی ادائیگی کا لطف بھی کیا سربلندی کی تو سرستی بھی گئی۔ پہلے تو ہیں نماز پڑھنا صرف عادت تھی جس طرح سرگیت چھانچا ہے اور گاؤں کا گناہ ہے۔ اب نماز عادت تو ہے ہی پڑھتی ہیں گئی ہے۔ حد تو ہے کہ ہم کچھ نیچے نہ بھی نہ ہو سکے۔

میں چاہا تھے اس آدمی میں مسجد اپنے سامنے شرمندہ تھا کیا مجھے اس مسجد میں نماز پڑھنے کا حق تھا جو کچھ میں نے کیا تھا یہ نماز تھی نماز ہے جو دنیا ہمیں ہر کس پروردگار پانچ دفعہ مسلمان پڑھتے ہیں اگر وہ واقعی نماز پڑھتے ہیں تو اس ”تو“ کے بعد جس جو کچھ کہیں گاتھ پڑھو اور تو نے لگ جائیں گے۔ قرآن کتاب ہے کہ نماز پڑھنا اس کے روکتی ہے۔ اب جو لوگ نماز پڑھتے ہیں اور یہ انہیں سے نہیں کہتے وہ یا تو نماز میں پڑھتے کچھ اور ہی پڑھتے ہوں گے یا پھر جو کہہ کر تے ہیں ان میں نہیں ہوتی۔ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ برائی کیا ہے اور نماز کیا ہے۔ فیصلہ اور توئی ایک دوسرے کے ساتھ ہیں شاید مگر ان لوگوں کا کیا کریں جو اس خوف سے نماز میں پڑھتے کہ میں وہ واقعی رہا نہیں اسے رکھتی نہ جائیں۔

مگر پڑے تھے دونوں گھمے ہوردی ہوئی ان سے۔ ایسی ہی ہوردی ان سے بھی ہوئی جو نماز پڑھنے کیلئے جمع ہو رہے تھے۔ وہ بھی کم مسافرت تھے ان کے چہروں پر لکھا ہوا تھا کہ نماز پڑھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔

کبھی ہم مسجد کو دیکھتے تھے کبھی مسجد میں دیکھتے تھے۔ مسجد اور انسان (مرد و عورت) کے وجود میں بڑی برعنائی ہیں گنبد اور مینار کی ساخت پر غور کریں مگر انسان اجڑی ہوئی مسجد کی طرح ہوتا جا رہا ہے۔ وضو کیلئے محض میں حوض کا پانی گندا تھا اس

پانی سے استنجہ بھی نہ ہو سکتا شاید پانی کڑوا بھی تھا کھڑے پانی کا کسی حال ہوتا ہے کھڑی قوم کا بھی یہی حال ہوتا ہے ایسے تو بھی تک ہے۔ یہ نہیں چاہا کہ ہم کالم کھڑے ہیں میں کھڑے ہیں تقریباً پاک پانی سے وضو کر کے ہم نماز میں شریک ہوئے۔ امام بخاری موجود نہیں تھے نمازے نماز کرنے پڑھائی۔ ہمارے لوگ امام کا شجرہ اور عقیدہ نہ معلوم کر لیں تو اس کے پیچھے نماز میں پڑھتے۔ ہمارے ایک استاد کا مکر تے تھے کہ کسی کی لڑائی میرے بچاؤ سے بھی تو وہ نماز میرے پیچھے پڑھنا چھوڑ دیتا ہے۔ امام بخاری صاحب کس دور سے پڑھتا اس شخص کی جراتوں کی کمیاں چھٹی رہتی ہیں ہمارے اخباروں میں بھی امام ولیر آدمی ہے۔ کئی دفعہ جیلوں کی سیر کر آیا تو خداوند اس سے بولھا۔ مگر کچھ یہاں اس کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ "یہ امام صاحب کا مژدہ ہوتا ہے تو حکومت سے سمجھو کہ لیتے ہیں سرکاری نوعیت کے دورے کر لیتے ہیں" جب دل آتا ہے تو حکمرانوں سے کشتی بھی کر لیتے ہیں جس پر کبھی کبھی فورا کشتی کا مام ہوتا ہے۔

یہاں پوسنگے ہوئے تھے مسلمانوں کے ساتھ ہندو حکمرانوں اور خنزروں کی زیادتیوں کے تحت سیاہ بھارتی حکومت کی سیر کاروں پر روشنی ڈالی گئی تھی مسجد پر مسلمانوں کی بھگتہ ڈونے کی کوششوں کی بھی ذمہ داری تھی۔ ہندو پابندوں کے قدموں کے نشان نہ تھے مگر غرض پر چلوڑوں کی دھمک اور دھچکوزی

لرز رہی تھی۔ میں دیکھا جاتا ان سے کہ جامع مسجد میں پانچ دفعہ اذان کا جھنڈا بلند ہوتا ان پوری دنیا کی وسعتوں اور ہندو پاک کی ساری فضائوں کی پرانی رشتے ہے۔ یہ بروقت کو جتنی ہے دنیا میں کسی نہ کسی ملک میں کہیں نہ کہیں اذان کا وقت ہوتا ہے بروقت اذان کا وقت ہوتا ہے یہ کوئی رشتہ ہے کہ کائنات کے بدن میں۔ کسی شرمش مع کا وقت ہے تو دوسرے ملک کے شرمش نظر کا وقت ہے۔ اذان ایک رضا کارانہ بلا وہ ہے جیسی قواب مسلمان ان کی سنی کر پڑے ہیں یا تہی یا ضرور ہے کہ اذان ان کو تقریر بند کر دیتے ہیں۔ ہماری مائذون لوگیاں بھی سر پر دوپٹے لے لیتی ہیں۔ اذان قلعہ و بیہودگی و محبت ہے۔ حتیٰ افلاخ کا کیا مطلب ہے اور دھنیر شینٹ کا مطلب کیا ہے ہم بیکارنے والے کی نیت اور ذہنیت سے پیغام کی اہمیت و افادت کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں لوگ آج کے مسلمان کے عمل اور انجام پر دین کو پکھنے ہیں باب العلم حضرت علیؑ نے کہا کہ "حق کے ذریعے بندے کو پہچان دینے کے ذریعے حق کو نہیں" ہم بندے بے چارے کے پیچھے پڑ گئے ہیں ہاتھ دھو کھنگاہتہ مت دھو کھنگاہتہ مت کہ بلکہ اثنان کے کہ گنگاہل میں ڈکیاں لگا لگا کے۔ خدا بندے کو بندے سے بچائے۔

جامع مسجد میں سیر سپاٹا

کالج اور پختور سٹاپاں بھی

تفتن گاہیں ہیں۔ وہاں کوئی لٹکی صدر سٹوڈنٹس یونین بن جاتی ہے صرف اس خصوصیت پر کہ وہ بہت اچھی ڈانسر ہے۔ میں ہوتا سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا ڈانسر ہی ڈانسر صاحب کو تھا۔ صدر صاحب سے دست بردار گزرا شہرے بھارت میں ہر آدمی آپ کو دست بردار تھا آگے کو صدر صاحب ڈانسر کرے مگر صرف ڈانسر ہی نہ کرتی رہے صدر کے کرنے کے اور بھی کام ہیں۔ ہماری پختور سٹوڈنٹس کے ایسے سٹوڈنٹس باقاعدہ سیاسی لیڈر ہوتے ہیں۔

لال قلعے کے پڑوس میں جامع مسجد بھی تفتن گاہ ہے ہم وہاں بیٹھے تو وہ سب لوگ جو ابھی ہمارے ساتھ قلعے میں تھے یہاں بھی تھے یہاں پہلے بھی کچھ کی تھی۔ ہر قسم کا سلیج یہاں تھا پختور بھی میں دیکھ رہی لوگ اس امید بان سے مسجد میں آرام فرما تھے جیسے یہ کسی ریلوے سٹیشن کا ریسٹ ہاؤس ہو۔ تقریباً اس کے ٹکٹ والوں کی آرام گاہ آرام گاہ کے ساتھ آخری نہ لگایا جائے تو کسی سی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ لوگ قدرتی طور پر دھلے دھلائے ہوئے ہیں انڈیا کی یادوں لوگ بھی تھے یہاں۔ ڈانر جی والے پور پورے پورے کر لیں غل بولگی لوگ رہے تھے بہت سے سیاح اور سیاحین مسجد کا باقاعدہ محاذ کر رہی تھیں کچھ دیکھ لوگی مفلون پر بے قاعدہ انداز میں لپٹے ہوئے تھے بلکہ نواں لگا رہے تھے کچھ سوئے ہوئے تھے یہ ایک آرام لوگوں کو نہ سکون جگہ پر نیند آگئی تھی ان کے خراٹوں کی آواز پوری مسجد میں گھوم رہی تھی یہاں پہلے ایک پہری اور ایک پہنیں بالکل قریب قریب بلکہ مغرب پر لپٹے ہوئے تھے دوئے ہوئے سر کو شیاں بھی کر رہے تھے ایسے ہیں فریقین سنتے بھی لیں سے جن ان کے سراپاں میں نظر آنے والے ارتقا شہر کا کسی انگلش فلم میں جذبات انگیز ٹو سین سے پہلے ہوتا ہے بروقت خطرہ خرابی خوشخبری کا مندریکہ کہنا ہے لکھی گئی

لئے وہ کیا کر نہیں۔ جوش میں آکر ہمارے نمازے اور پوری مسجد میں چلا جائے۔ میں جہول کی کھوئی بھگتی کھائی کا قائل ہوں ان حقیقت کی طرف اس ہوں نیاز و دوح کا معائنہ بھی ہے اس سے بڑا معاشق کوئی نہیں اب نماز میں اتنی محنت بھی نہیں جو کسی پند کی عورت سے ہم کلام ہونے میں ہے۔ عورت سے ہم کلام ہونے میں بھی وہ خراسانیں رہا۔ مسجد کے خادم نے نماز با جماعت کا طائر کیا اور سیاہوں کو باہر ہانکنے کی کوشش کرنے لگا ان میں سے کچھ نے عزت کی پہلی صف والے پہری اور پہنیں ایک دوسرے کا سدا لیکرا لٹھے یہ تو میں مسجد کے نظرس کیلئے کہ رہا ہوں وہ تو ایک دوسرے سے پرت لپٹ کے کھڑے ہوئے تھے۔ کھڑے ہونے سے پہلے دو لیکار گہر پڑے تھے دوسرے کو کھڑا کرنے کی کوشش میں

بھارت میں اردو صحافت

بھارتی اخبارات در مسائل میں تصویریں رنگین نہیں تھیں مگر ضرور حراج ضرور ہوتی ہیں جو کچھ اخباروں میں قلموہ جمہوری اور جمعی آزادی کا سطر تھا۔ پاکستان کے اخبار نویس بھارتی اخبار نویسوں سے کسی لحاظ سے کم نہیں۔ یہ بات کی میں چلائی میں اور دوسرے معاملوں میں۔ ان معاملوں کی وضاحت پھر کسی بھی تحریک آزادی اور تاریخ آزادی میں مسلم صحافیوں ادیبوں "شاعروں کا کردار اور قریا قریا ہندوؤں سے آگے ہیں کچھ لوگ ہیں بھارت میں اب بھی جن کی بات کی ہوتی ہے مثلاً خوشنیت سنگھ "گلدیپ نیر" بھٹنا اس "آخر" فکر چوسلی "متبول احمد دہلوی۔ ان کے کالم اور مضامین ہمارے اخبارات میں جیسے جہاں پاکستان میں غیر جمہوری حکومتوں کے باوجود کچھ اخبار نویسوں سے صحافتی وقار کو قائم رکھا جیتی حمایت پاکستان کے کچھ اخبار حکومت کی کر لیتے ہیں بھارت میں اخبار بھی کر لیتے ہیں۔ مخالفت دونوں طرف کی حکومتوں کی اخباروں میں ہوتی رہتی ہے۔ بھارت میں جمہوریت کے شہر میں۔ بات ذرا اونچے سروں میں ہے آوارہ تحریروں اور حریاں تصویروں کے نواسے سے بھارت والے زیادہ وہ ہیں۔

روزنامہ "ملاپ" میں فکر چوسلی کے کالم "ہیاز کے چھٹکے" سے ایک اقتباس

"واحد میاں کا سر اتر تھا کہ رو لیزر نہیں جٹا چاہتا کیونکہ وہ ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ مجھے تو اپنی طرح ادیب بننے کی تھیں بس نے کچھ دھڑکیسے میرے سامنے جہر کو مجھ پر کھوہ شہر بار کر کے کئے گا میری کوئی مجھ پر نہیں بس نے کہا کوئی نہیں۔ اس کی لیزروں میں سو شرام نہیں ہو مگر سو شرام کیلئے چھانی پر چڑھ جانے کے اعلان کر رہے ہیں قرآنی مجھ پر کوا بیانی سو شرام کچھ اور پر ہم پڑ گھوڑاں نے جو ہم پر پڑ لکھ کے دکھا میری کچھ میں نہیں آج میں طرح لیزروں کے سو شرام کی آج تک کچھ نہیں آئی"

اس ایک اخبار میں ضیافت پر سات مضامین یا تصویریں ہیں ایک مضمون کا عنوان ہے "جو ذمی حور قوت کو سر جری کے ذریعے جوان بنایا جا سکتا ہے" اس مضمون کا خلاصہ اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کر سکتا ہوں کہ سسٹی (۶۰) برس کی عورت ان کے کمال فن کے شہسین (۱۶) برس کی نظر آتے تھے تھی ہے۔ بڑھاپا صرف "ن" ہی ہے مگر حور قوت کا سانس ہے کہ انہیں "قوت غز" اچھا لگتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ اشتہار نہیں ہے تو اشتہار کیا ہوگا؟

روزنامہ "پر تاب" کے ایڈیٹر زید کے ایڈیٹوریل کا یہ حصہ خاصا دلچسپ ہے۔

"اندووائی کی جمہوریت میں انسانیت کی کوئی جگہ نہیں بس کی جمہوریت نہ انسانوں کیلئے ہے نہ حیوانوں کیلئے بس نے آسمان میں چٹو کر کے ی رہتا تھا چاہے اس کی قیمت کو لوگوں کو کتنی ہی ادا کرنی

میں بار بار پھرتا ہے لہذا ہر کی شتی سامنے نظر آئی شتی مسجد مثال کا پیکر ہے جو کچھ بچا جاتا ہے دلی کی جامع مسجد جلال کا پیرا بن ہے جو بچتا جاتا ہے۔ ایک طرف شتی ہے ایک طرف شتی ہے دونوں مثل مسلمانوں کے ذوق کا آئینہ ہیں اور آئینہ شفاف ہے اور آئینہ دھندلا ہے جو شکل آنکھوں کے بغیر ہوا سے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے جو آئینہ چمک کھوے اسے بھی اندھا بنی بھجھاتا ہے لے کون دیکھتا ہے۔ سارا وقت مسجد مجھے دیکھتی رہی اور میں اپنے اندر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہمارے دلوں پر کسی کی حکومت ہے کہ وہاں بھی مسجدوں اور عمارتوں کا ایسا ہی حال ہے۔ شتی مسجد جیسے ابھی بن رہی ہو جامع مسجد برسوں سے بنی کھڑی ہے واقعی کھڑی ہے۔ مرکز سے مت اونچی۔ انڈیا میں بیرون کے اوپر۔ پیچھے سے دیکھیں تو بہت عظیم الشان دکھائی دیتی ہے بس کی اینٹوں کا رنگ میٹا لالہ اور دریدہ لالہ اور لالہ ہے۔ یہ منظر جن طرف سے نظر آتا ہے جن طرف سے دروازے ہیں جو بند پڑے ہیں حکومت کا خیال ہے کہ اس طرح کم مسلمان آئیں گے نماز پڑھتے۔ ان میں بیرون پڑیوہ فریبوں کا غریب مسلمانوں کا گناہ خدا کرے یہ دروازے نہ کھلیں خدا کے بندے نہ اجڑیں لیکن بندے کا دل بھی خدا کا گھر ہے مجھے جامع مسجد کی مڑیاں اور اچھی لگتی ہیں خود رواؤں کھلا ہوا ہے اس کی سیدھا میں رہتا چھوڑ کر بھی بھکاری موجود ہیں میں کی بار بیرون پر آگیا۔ جامع مسجد اور چاندنی چوک کو ملنے والی شاہدہ مرکز پر بھی کچھ پیچھے والوں اور کچھ ماتھے والوں کا قبضہ تھا۔ سنجو گاندھی نے اپنے زمانے میں اس مرکز پر سے یہ سارے تجاویزات بنوا دیئے۔ اس پر بہت لے دے ہوئی اسی طرح کی لوگ بے گھر بھی ہوئے اسی طرح بے گھر ہو سکی بات معنی خیز آوارہ لہناک ہے مسجد تک پہنچنا آسان ہو گیا کیلئے تو میں سے گزرنا مشکل تھا۔ جو راستہ زندگی کی طرف چاہا ہے وہاں سے تاجاںز تجاویزات کون بنوائے گا ہر جاں تک کیسے آسان ہو گا۔

غیر المسلمان کے میں ادیبوں کے مجھنے کو بہت دکھ سے بیان کیا۔

اور حیدر دھ سے بتایا کہ جن دنوں صد سالہ جشن برساں عرب اور پاکستان کے علماء آئے ہوئے تھے تو وہ روزانہ میں صبح میں کیل کاسٹر کے دیو بند جاتے تھے وہاں فہرے کی کسی نے حسن کی تہاں کام کا کوئی ہوئی نہیں تپا تپتیں مسجدوں کی ضرورت نہیں ہو تھیں کی ضرورت ہے جو کچھ ابھی میں جہاں چھاپے کار نہ ہو۔ تحریک پاکستان کے دور ان برصغیر کے مسلمانوں سے مددوں پر اپنی ذہنی قیادت کو کھل کر بظاہر ایک غیر مذہبی قیادت کو قبول کر لیا تھا تو شکس کی تھا۔ قائد اعظم نے سیاست کو دیانت کا چیلن دیا تھا تو ہندو شہر احمد عثمانی "اشرف علی تھانی جیسے لوگ کتے ہیں۔ قائد اعظم نے مولانا شبیر احمد عثمانی سے درخواست کی تھی کہ پہلی بار پاکستان کا جھنڈا افغانی لڑیں۔ شبیر احمد عثمانی نے بہت سے مولویوں کے اس اعتراض پر کہ انڈیا عالم ہو کر ایک واحد مذہبی منڈے کے پیچھے چل پڑے کہ انہماک مجھے دربار رسالت سے حکم ہوا ہے کہ میں قائد اعظم کا ساتھ دوں یہ ایک اعزاز تھا وہ یہ کیا ہے کہ انڈیا گاندھی نے دیو بند کے فیکٹری اوروں کو آپس میں لڑا سے کامتا پوری دیا کو دکھایا۔ اسلامی دنیا میں ایک بداعلیٰ اور دینی آوارہ و قدارہ ہے۔ اب یہ دیکھا ہے۔

کے دستوں پر ضائع ہوتے رہے، ابوالکلام آزاد کے بارے میں بھی میرا یہ خیال جو۔ دینی سیاست کے آدمی
ہے مولانا محمد علی جوہر۔ دینی تحریک کے آدمی تھے۔ تبلیغی جماعت والے مولانا گلپاشاں جو بھی اپنے میدان
پے نکل کر کسی اور دائرے میں کام کرنے لگا، لہذا انہیں پھر روحانی نظام کی نفی کر کے کوئی چودہ جہت عمل
ہوتی ہے نہ کامیاب۔ تصوف پر یقین اور عمل کے بعد یہ بھی نظام بن جاتی ہے۔ دینائے اسلام میں جو
کام دہائیوں اور صدیوں کے کیا اور کس سے ہو سکا۔ میری عمر اچھڑا چھ ورانہ ہیں چوں اور گدہی نشینوں سے
ضم۔

بھارتی جماعت اسلامی کا امپورڈ ایشیائی میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ رکن روٹ میں ویٹا پاسکائی جماعت والے پہلی سرپرستی میں چار چار مینٹس آئے لیکن یہ دراصل جماعت تریبون میں ان میں بہت سے ہیں۔ بعض بندوقدار اشرافیتاء فرقہ پرست جماعت سمجھتے ہیں اور اس کا مقابلہ دہشت پسند تنظیم "آرائس ایش" سے کرتے ہیں۔ یہ مقابلہ ایسا ہے جیسے ایک آدمی کے ہاتھ باندھ کر پہلی دست باکس سے لڑا دیا جائے جو کبھی کبھی اسے اس حالت میں بھی دووں ہاتھوں کا کھاپڑ جڑوے۔ ان دونوں آر ایس ایش انداز گزارنے پر غلے ہیں، جتنا پارٹی کی خدو خد میں اس کا فائدہ بھی انداز کا کریں کو کچھ رہا ہے۔ امیر جماعت اسلامی کا کہنا ہے کہ "مسلمانوں کے معاملات و مسائل کیلئے ایسی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ جرت ہے کہ یہ بات امین اجماعت کے بعد پتہ چلی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ "بھارتی مسلمان ایسی جماعتوں میں شامل نہ ہوں جن کا رویہ کلمے کے مسلمانوں کیلئے سعادنا ہے" یعنی مسلمان صرف جماعت اسلامی میں شامل ہوں۔ پاکستان کے امیر جماعت کا خیال بھی یہی تھا کہ جماعت اسلامی ہے جو آدمی جماعت کے خلاف ہے یا جماعت کے کسی ایک آدمی کے خلاف ہے وہ اسلام کے بھی خلاف ہے۔ انتخابات میں جماعت اسلامی کے آدمی کے جیتنے کا مطلب اسلام کی جیت ہے۔ خواہ اس کے مقابلے میں امپورڈان بہتر مسلمان ہوں۔ جماعت کے بڑے کے ہارنے کی شکل میں جو کہ کجا پاسکائی ہے میں نہیں کتا جاتا۔ دووں ٹکوں کی "جماعت اسلامیوں" میں کوئی خاص فرق نہیں مگر بھارت میں ان کی مشکلات بھی ہیں اور پاکستان میں ان کیلئے آسانیاں بھی ہیں۔

اسی اخبار میں ایک جائزہ ہے جس کا عنوان اس کی شہریت ہے "وایت ممالک کی بنیاد پر تحریک
اندہ اس نے جس طرح سوویت یونین کے مفادات کا تحفظ کیا تحریک کی جیت جیت ہوئے کافر اور گویا۔ اخبار
میں افغانستان پر سوویت یونین کی جارحیت کی یہ ذرہ بہ ذرہ مت کی جاتی ہے جو ہر قسم کی جماعت اسلامی کی پالیسی
ہے۔ اصولی طور پر کسی معتقل آدمی کو کم از کم اس موقف سے اختلاف مشکل ہے۔" "دعوت" نام کا یہ
اخبار ایک کھلم کھلا نعرہ ہے۔

ہفت روزہ "حیات" نئی دہلی بھارتی کیونسٹوں کا ترجمان ہے اصل میں یہ سوویت یونین کے مفادات کا ترجمان ہے آجکل کیونسٹ ہونے کا مطلب روس کا قیادار ہونا ہے۔ چینیزمان کے انقلاب

ہے۔ خاص کر اس حالت میں جبکہ امکان ہے ہو کہ اندر اپارٹی کے امیدوار جیت سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر ہوا جس دن چنٹو کو اس دن و فی فنی کشمڑ اور دوسرے حکام اسے مصروف تھے کہ اور کسی بات کی انہیں غرض نہ تھی۔ لیکن یہی وہی زندگیاں چنٹو کی دیوی کے چروٹوں میں ملیا دن کر دی گئیں۔ کسی معصوم بچوں نے اپنے ماں باپ کے ٹکڑے ہوئے اپنے سامنے دیکھے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کون سے فرقے کے لوگ ان کے ماں باپ کے قاتل ہیں۔ ایک جمہوری چنٹو کے نام پر سات ہزار لوگوں کا قتل ہوا۔ ایک آسامی پروفیسر کہتا ہے کہ یہ کسی قوم پر سب سے بڑا غلاب ہے پر وہاں منتر صی صاحب دنیا بھر کے کاموں میں اتنی مصروف ہیں کہ انہیں مقامی سامنے سے پریشان ہو گئی۔ فرقہ خیزی نہیں۔ آخر کیا ہوا جو ہزار ہا لوگ ہلاک ہو گئے بھارت کی آبادی کافی ہے۔ ووٹ دینے والے بہت ہیں۔ دہلی کی لوگ سہارا اور راجہ سبھاش دھار جیواہر لال نہرو دینے جائیں گے اور بھر کسی انتہر اکثر کافر نفس تیار دیاں شروع ہو جائیں گی اگر ۱۹۴۷ء میں وہاں یہ قتل عام کے وقت دہلی میں جشن منانے جارہے تھے اور چرغاں ہو رہا تھا تو آج ایک غیر جانبدار کافر نفس کی نگاہ سے منائی جائیں تو کیا نہ ہر جہے جو حکومت ملک کے اندر غیر جانبدار نہیں باہر کیا ہوگی۔

میں اس ادارے پر کیا تبصرہ کروں میں اس پر اندر سے دیکھ کر کایہ خیال نہیں کہ جمہوریت کوئی بری چیز ہے مگر یہ سب کچھ جمہوریت میں ہو رہا ہے ایسی باتیں کہیں جالی میں احتجاج ہوتے چلے جاتے ہیں کہ وہ کچھ ہے جمہوری حکومت اس کا کیا ایڈر چاہتا / چاہتی ہے جو جمہوری پروہان منتر سے اختلاف کرے تو پھر واقعی بھی دے۔ اصل (منتر/جادو) پروہان کے پاس ہے۔ اس کے بعد ممبران پارلیمنٹ کی کیا توجہ ہے۔ ورنہ ان کی قوادق سے کیا ہے۔

”ج“ دیسی لہنے اِشاعت میں اُن ہمارے اِکثر سولے کی خوش میں لانے والی تقصیر میں چھائی
 جس جو فکر کی دنیا سے نا کام ہو کر رُپ شیون کی سیر و سیرتیں بن جاتی ہیں۔ پھر بھی شوق شوقی مگر پورا۔
 کچھ عورتیں بخود نہیں بن کر ایکٹنگ کا کام لیتی تھیں۔ اسے کہتے ہیں چڑیاں جو ہوائیں تھامے والے دو دو گلے
 چڑے ہوئے تھے۔ اُردو۔

ہفت روزہ ”دعوت“ جماعت اسلامی ہند کا پندرہ جہاں ہے یہ لوگ پاکستانی جماعت اسلامی والدین کے میزبان ہوتے ہیں جماعت والے اپنے ممبران کے علاوہ کسی کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ اس بارے میں امیر جماعت مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب نے دو اعتراض دیے ہیں ایک وقت۔ یہ شاید جماعت کے باقی ممبر عالم دینی، ”حق قرآن“ والے حضرت مولانا محمد احسن اسلامی کے ررواری وار ہیں جن صنف کے اندر باہر سے دشمن ہیں۔ ابو ایوب ایسے تھے کہیں بودودی صاحب اندر سے صوفی تھے ویسے خلاف تھے۔ اس عمل کا نقصان ان کی ذات کو تو نہیں ہوا۔ جماعت کو بہت پیچھا۔ ان کی موت کے بعد جماعت کا انداز دیکھ کر مجھے بودودی اپنے وقت کے بڑے آدمی تھے۔ علم کے میدان کے آدمی تھے جسے سیاست و تحریک

جن دونوں خوشنوت سنگھ "ہندوستان نامہ" کا ایڈیٹر تھا اس وقت یہ ایک اخبار تھا خوشنوت سنگھ جرات مند اور بے لوث صحافی ہے۔ کچھ ہندے کچھ اخباروں کی علامت بن جاتے ہیں نظیر علی خاں گئے تو "زمیندار" بھی گیا اگرچہ پاک بھارت معاشرے پر زمیندار (جاگیردار) ابھی کیا نہیں "زمیندار" زندہ رہتا پاکستان میں تو یہ بڑے زمیندار برہمن موت مرتے۔ خوشنوت سنگھ مذہب کو نہیں مانتا مگر مسلمانوں کو مانتا ہے اس کے گھر میں اللہ اور محمدؐ کے چارٹ آویزاں ہیں وہ مسلمانوں سے ملنے ہوئے اسلام علیکم کہتا ہے۔ کبھی وہ اندرا کی لکڑی بھٹی کا حامی تھا اب سارا بھارت اس کے خلاف تھا اب وہ سینکا کا حامی ہے۔ بیکرا اندرا کا گھر میں اس کی جان کی دشمن ہے۔ حق گوئی کی پاداش میں اسے "ہندوستان نامہ" سے الگ کر دیا گیا۔ اب اس اخبار میں نہ ہندوستان ہے نہ ناٹم۔ ایک دشمنی کی بدولت ہر لفظ میں بھری ہوتی ہے۔ وہ بلکہ ویش کے خلاف تھا غلامانہاں کے بھی حق میں نہیں مگر مسلمانوں اور سکھوں کا حامی ہے۔ اس کی مخالفت میں کوئی نہ کوئی حمایت چھپی ہوتی ہے۔ وہ سکھوں کے ساتھ حکومت کے مصوری مظالم کا اس طرح مخالف ہے جس طرح مسلم اقلیت کیساتھ اس کی غیر مصوری دشمنی کے خلاف ہے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا اس کے گھر ایک عورت کو نماز پڑھتے دیکھا تو پریشان ہو گیا "حیران بھی ہو گیا جیسا اس عورت کا خوشنوت نے اپنی بیوی کے طور پر قرار کر لیا یہ کیا صورت حال ہے۔ خوشنوت کی بیوی اس کے گھر میں نماز پڑھ سکتی ہے۔ نماز ایک بار یاد ہو جائے تو نہیں بھولتی مجھے وہ عورتیں زیادہ عقیم لگیں جو دلی میں نہیں گھومنے کی نگلی پیچے پر سہ سال پہنچیں۔ کچھ تو گھنٹیں ہونے لگے تو گھنٹہ بھر دلی میں نماز پڑھتی ہوں کی اس طرح نماز پڑھنا کیسے ہر کا کسی اور کو اس کا نوازہ نہیں ہو سکتا کیا کیا غائب ہیں جن کا نوازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ زندگی کرنے کے کتے اٹھا رہے ہیں۔ بچے لگتے کوئی ہیں اتنی ہی سہی انداز ہوں گے۔

بوسے بینار کا اعتبار

یہاں پتہ چلتا ہے کہ حراز اور یتار میں بڑا کون ہے۔ کشان دونوں مقامات کی طرف دوڑا لگا رہتا تھا دیکھے ہوئے منظر میں ایک دیکھے منظر کی طرح تھرتھار رہا تھا۔ مستقل منظر بننے لگا مگر وہاں کم لوگوں کو نصب ہوتا ہے صرف وہ منظر جو پرانے والے وقت کی آنکھوں میں اتر سکی صلاحیت رکھتا ہو۔ ہر شخص ایک منظر ہے اور منظر ہمیشہ نہیں رہتے۔ بدلے رہتے ہیں حضرت قطب الدین کسی بدلے ہوئے منظر میں موجود ہے۔ ان کی زندگی منظر میں بیکر اور منظر حقیق کرنے والی زندگی تھی۔ قطب یتار سامنے قائم اسے دیکھنے سے اپنے آپ کو اونچا محسوس کرنے لگے تھے اس کے پاس پہنچ کر اسے دیکھنے میں مشکل ہونے لگی۔ بلند والا پہنچوں کو دور سے دیکھنا چاہتا ہوں ان کے دامن میں لوگوں کو اپنی ہستی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے اور یہ احساس کتنی ان کے تعجب کو بڑھاتا ہے یہاں بھی یتار کی بوسیدگی سے خوف آئے گا۔ اگرچہ میں یقین تھا کہ جب تک ہم یہاں کھڑے ہیں تو نہیں گرے گا ہم اسے بہت شوق اور محبت سے دیکھنے آئے تھے۔ دلی والے اور بھارتی اسے تو عینا دیکھتے ہیں اور اسے نہیں دیکھتے۔ جب تک ہم ایسے لوگ اس کے درشن کرنے آتے ہیں گے یہ کھڑا ہے گا مگر زمانے میں اس کی بڑھیاں بھی استعمال ہوتی ہوں گی کسی کے قدم وہاں پڑے کہ یہ راستہ ہی بند ہو گیا۔ قدم اسے روندنے کو بھی آئے تب ہیں ہر شخص اس کی بیت قائم ہے اس کے اپنے قیام کی طرح۔ گلابے طویل قیام سے وہ کھلا کھڑا ہے۔ رکوع کی طرف ہلے پھر بخود۔ لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ حیران ہوتے ہیں۔ ان کے تاثرات بھی بڑے دلچسپ ہوتے ہیں اس ضمن میں دو آدمیوں کا ذکر بہت خوب ہے

"جب یہ بنایا گیا تب یہ جگہ اور کشادہ تھی۔ زمین پر بنا کے لٹایا گیا یا لٹا کر بنا یا گیا۔ پھر اسے جھکی دے کر کھڑا کر دیا گیا۔ ان دونوں جھکی اور ہم کی ایک سی طاقت رکھتی تھی۔ اس کام میں دونوں نے بھی مدد کی تھی۔ یہ سب کچھ ملراجا شوک کے علم پر ہوا تھا۔"

"قطب الدین ایک نئے اس پر قرآنی آیات لکھوا دیں اور اس طرح مسلمان بنالیاں کو۔ پہلے مع تھا یہاں عورتوں کا آج مسلمانوں نے یہ پابندی بھی چھٹی"

"یہ یتار عورتوں کو دکھانے والی چیز بھی نہیں۔ اب یہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے"

ایک پرندہ یتار کی چوٹی پر بڑے حرے سے بیٹھا تھا۔ وہ بڑی سولت سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ دنیا کو اس نے نازی سے دیکھنے کی فطرت آدمی میں جاگ پڑے تو اس بلند مقام یتار کا یہ حال نہ ہو۔

یکہہ جاناں میں کون؟

ایک لمبی راہداری تھی گنگ سحر تھ

گلی تھیں۔ رستے میں بھکاریوں کی لاشیں تھیں۔ گوشت کے ڈھیر دیڑیوں کی گھنٹیوں کی آوازوں سے بھرے تھے۔ اور مراہو محض زندہ ہے۔ یہ کاراڑ ہے۔ یہ راز تھانے بغیر کسی صاحب چلے جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی راز باکے خور راز بن گیا اور چلا گیا کہیں۔ اور پھر میں آیا بھی۔ ہر شخص اپنی طرح آتا ہے۔ چلا جاتا ہے۔ پھر میں آتا، ایک باہری آتا ہے، کوئی شخص ہے جو بار بار چلا آ رہا ہے۔ کیا حقیقت ہے کیا نہیں۔ ہر شخص اپنی حقیقت خود ہے۔ گاکی صاحب ایک حقیقت ہیں۔ ہم اپنی حقیقت سے واقف نہیں۔ جو واقف ہو اختیار کاکی ہو گیا، وہ کس طرح واقف ہو۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے اس میں کس کا زور ہے، تو چلا کے دیکھ لے اور بن جائے جو وہ جانتا چلا ہے۔ بتائے والا تھانے گا۔ بتائے والا کون ہے؟ کون تھانے گا۔ کوئی تو تھانے گا۔ جس نے گاکی صاحب کو بتایا تھا۔ انہیں پوچھنا آ گیا تھا۔ جس کو پوچھنا آ جائے اس کو بتانا بھی آ جاتا ہے۔

مزار کی طرف لے جانے والی راہ پر دھیان بھنگ دھنگوں میں ہاتھ پھیلائے کی سکت بھی نہ تھی۔ ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس نگاہ میں ہزاروں لکھنے والوں کی آوازیں سے بھی زیادہ دلورہ طلب تھی۔ میں نے ان میں سے کسی کو کچھ نہیں دیا تھا۔ انہیں جتنے پیسوں کی ضرورت تھی میرے پاس نہ تھے۔ زائیں طرف مڑتے لوگ میرا بھی نچوڑا لے کر گئے تھے۔ سر میں سولہ ہوتو کوئی سے کہا ہو گا۔ اب ہمارے پاس فیسیاں رہ گئی ہیں۔ سر میں رہے۔ وہ ڈھنگ گئے ہیں۔ ایک بھگتے ہیں۔ انہیں سر میں کیا پاسکا۔ دھیں بائیں ادا دینے چہرتوں پر کئی حراز تھے قطب صاحب کے عزیز ہوں گے۔ ہم رکے بغیر اس گنگے میں پہنچے جہاں پھولوں کے ڈھیر کے پھول کے خشیو کو پھیلانے کے جن کے جبار ہے جس میں میں اپنے دن والوں کے دلوں میں ایک بار ضرور جاتی ہے۔ حراز پر ایک تیر لگا ہے کہ گاندھی جی نے اپنے قتل سے چند دن پہلے تنگ حراز لگائے کو کہا تھا۔ شاید اس کے قتل میں اس حرکت کا دخل بھی ہو۔ ایسا کوئی قصہ تو اس کا۔ شکر ہے گاندھی جی کا قاتل کوئی مسلمان نہ تھا۔ یہ بھی قطب کی کرامت تھی کہ کوئی اندر آگندھی کا قاتل بھی مسلمان نہیں۔ کسی گاندھی جی کی کہ سرحدی گاندھی کا قاتل بھی مسلمان نہیں ہو گا۔

میں حراز کے پورے احاطے میں اُدھر اُدھر گھومتا رہا۔ کیا خوش فضا لگے ہے۔ میں یہاں قاتح نہ چاہتا تھا۔ اس طرح اپنے قاتح ہونے کا حساس ہو جائے اور میں مشتاق گلوں میں گھرا ہوا لہر رہا تھا۔ قاتح وہ ہے۔

اسے دیکھنے والوں کا بھی یہ حال نہ ہو۔ میں نے کئی بار قطب جتار کا طواف کیا میرے پاس اس بلند جگہ کے خراج تھیں کہ اوپر کچھ نہ تھا وہ اپنی شکل اور خشکی میں کمن تھا میں نے اس کی بو ذمی انہوں کو بھوسا۔ میرے دائیں ہاتھ کا کھس دیوار پر ثبت ہو گیا جس میں گنگوٹ کا نشان واضح تھا۔ یہ تو ان پڑھ آدمی کے دستخط ہوتے ہیں۔ طرے معیار زندگی کی طرح پراسرار ہیں۔ جب آدمی کچھ جان لیتا ہے تو وہ فی دالم (میں نہیں جانتا) کے سوا کچھ نہیں کہتے بلکہ بھی اچانک مٹا ہے کسی سے کسی کو۔ محنت آدمی بعض اوقات کسی اور شے کیلئے کرتا ہے اسے مل کچھ اور جاتا ہے۔

قطب جتار کے پاس ہی چاروں طرف تہ آباد ہماریں کھڑی تھیں۔ میں کھڑے کئے کو میرا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک غم دیکھی تھی "یہ کتنا گولڈ" جس کا روتو جڑ "سوئے کی تلاش" کیا کیا تھا اس میں خرد نے چھپائے ہوئے جن بھگلوں کو قہقا یا کیا تھا وہ بھی گنجیں تھیں یا ان سے ملتی جلتی گنجیں تھیں۔ خزانے ویران بھگلوں پر بھی ہوتے ہیں یا وہ گنجیں جو ویران ہو جاتی ہیں۔ ویران کر دی جاتی ہیں دہلی اپنے اپنے باطن میں ویران ہو رہی ہے۔ خرد نہ چھپا لیا گیا ہے اس کا۔ نئی دہلی کی فخر نہ آنے والی مسائیاں کسی بڑے واقعے کا پتہ دیتی ہیں۔ قطب جتار کے اجڑے اجڑے احاطے میں کئی دیواریں اکیلی اکیلی کھڑی ہیں۔ کوئی چار دیواری سلامت نہیں نہ چھین نہ دروازے۔ کہیں تین دیواریں کہیں ایک دیوار۔ کہیں دو دیواریں ہم کلام۔ یہ وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ویرانیاں ہیں۔ ویرانوں کی نشانیاں ہیں جو دیکھنے والوں کی دلچسپیوں سے آباد نظر آ رہی تھیں۔ بے شمار لوگ تھے مقامی اور غیر ملکی۔ کہیں جلوس بنائے ہوئے کہیں جوڑے جوڑے۔ ایسی بستیوں میں بھٹیوں کی رازداریاں اور گھمبیر ہو جاتی ہیں۔ ایک نوجوان اپنی دوست کی تصویریں لے جا رہا تھا۔ کہیں کھڑا کر کے، کہیں بٹھا کے۔ کہیں لٹا کے۔ کسی کرتی ہوئی دیوار کیساتھ لگا کے۔ حسرت تھی نہیں تھی اس کی۔ اس نے مجھے کیرہ پکڑا دیا اور خواہی "اس" کے ساتھ لگ کے کڑا ہوا گیا۔ میں نے کیرے کی آنکھ سے انہیں دیکھا مجھے کہیں اور نظر آئے اس نوجوان نے اپنی دوست کیساتھ میری بھی ایک تصویر آبادی۔ آدمی ایک دوسرے کو نہ جانتا ہو تو زیادہ باہر تو "فراغ دل اور لبرل ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے بے خوفی آدمیوں کو کتنا قریب کر دیتی ہے۔ میرے ساتھ تصویر اس کیلئے سڑنگ گواہی کی طرح تھی۔ ایسے مقامات پر آدمی کی کسی کام کرتے ہیں بڑا لینے یا تصویر لینے آتے ہیں اور لگتا ہے کہ جانتے نہیں۔ کسی وقت بھی کی نہیں ہوتی یہاں لوگوں کی۔ جب یہ مقامات تفریح گاہیں نہ تھے تب بھی مریخ خاص و عام تھے۔ اب بھی ہیں۔ یہ کیا مقامات ہیں۔ آدمی ان مقامات تک کیسے پہنچتے ہیں۔ قطب جتار کے پڑوس میں ایسے مقام سے آگے پہنچا ہوا ایک شخص سو رہا ہے۔ قطب الدین اختیار گاکی ایک صاحب حال شخص۔ ہم صرف صاحب منہ ہیں۔

مٹی میں دل جانا ہی زندگی ہے تو زندگی ہی میں یہ عمل کیوں کیا جائے۔ مٹی میں بڑی سرفرازیں ہیں۔ مٹی اڑتی ہے۔ ستر کرتی ہے۔ سارے جہاں کی مٹی تڑپتی ہوئی ہے۔ آپس میں قرآن کے مطابق اللہ نے آدم کو مٹی سے بنایا۔ پھر عمرتی بنا کر کائنات پر فطرت لکھ دی۔ میرے رسول نے کہا۔ تم زمین پر کیسے بھی نماز پڑھ سکتے ہو۔ اس طرح زمین کی اہمیت اور بھی۔ ماری زمین ایک سی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر کیوں مٹی کے نام پر۔ الگ الگ کیا ہوا ہے لوگوں نے اپنے آپ کو۔ ہوا بنت گئے اپنے آپ کو۔ لوگ جہاں کے ہیں۔ پتے زمین کھاں کھاں کے ہیں۔ یہ وہی لوگ کہاں کہاں سے کیا کیا پڑھو نہ پڑھو آئے زمین پر۔ زمینوں پر۔ سرزمینوں پر۔

ایک توان مٹو لیں دلیوں کے نام کا کائنات۔ قنادین۔ دین کیا ہے۔ دین وہی ہے جو یہ لوگ زندگی بھر کرتے رہے۔ لوگ اللہ سے اتنا ہی پیار رکھتے ہیں جتنا زندگی سے۔ پیار کرنا ہی زندگی ہے۔ پیار زندگی قدرت اور دین میں کوئی فرق نہیں۔ صاحب دل صاحب درد صاحب حال اور صاحب دین ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔ زندگی کر کیا۔ شباب الدین سرور دی۔ بھلاؤ الدین ذکر کیا۔ صمیم الدین چشتی۔ جمی الدین ابن عربی۔ نظام الدین اولیا۔ شمس الدین سیاحی۔ قلب الدین اختیار کلکی اور سیتکولوں اور پتہ نام والے سیتکولوں والی اللہ۔ ولی اللہ وہی ہوا جو بندوں کا دوست ہوا۔ فریاد اپنی کافلوں میں یا فریاد دین جانا ہے۔ جو جب یار بننا ہے تو یار ہوتا ہے۔ زندگی آج قلب صاحب کی موت کی حفاظت کر رہی ہے۔ جن یادگاروں کے نام کا کائنات دین تھا۔ ان میں سے کھڑا اپنا پس سے عقلمند تھے۔ اس طرح حکومت کی انہوں نے جس طرح زندگی کی۔ شمس الدین اختر اور نادر شاہ میں فرق تاریخ نے بتا دیا ہے۔ متغلی کی حقیقت کا راز بھی یہی ہو شاید۔ میں یادداشتات کے حق میں نہیں۔ ولایت کے حق میں ہوں۔ جہاں بادشاہ ولی بھی تھا۔ اصل بادشاہ تھا۔ اور اصل بادشاہ تو یہ ولی تھے۔ بادشاہ بھی ان کے غلام تھے کہ کسی کو غلام بنانے کے خلاف تھے۔ انہوں نے اپنی کافلوں میں اپنی اپری طرح محبت ہو گئے۔ ہر طرح کی نفی آج بھی ان کے ثبوت میں ملتی ہوئی ہے۔

نفی ثابت دلیاں ملیا ہر اسے ہر جاتی ہو

زندگی ہم جیوں کیلئے ہوئی ہے۔ قلب الدین جیوں کی سبیل ہے۔ سبیل اپنا پتہ نہ بھی چلے تو بھی وہ سبیل کھولے، جس سے غفلت جوڑنے کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو سمجھنے کی خوشی میں لگ جاتے ہیں۔ نہ سمجھ سکتے ہیں نہ جڑ سکتے ہیں۔ زندگی کو زندگی کرنے کا کوئی طریقہ نہیں اور ہر طریقہ اصلی طریقہ ہے۔ کیا تصدیق ہے۔ ہر انسان اپنی فطرت میں موصوفی ہے۔ قلب الدین اختیار کلکی ہے۔ آدمی جب زندگی کا دشمن ہوا۔ اندر کے آدمی سے خبر ہوا۔ تو پھر قرآن اعتبار ہوا۔ یہ صمیم و پتہ نہیں ہوا۔ وہ نہیں دیکھ کر ہوا کسی کا کھدے سے نہیں چلی۔ ہر غصہ کسی کھنے کے مطابق میں زندہ رہے۔ دریا کی تیز رفتاری کے نہیں پتے۔ متعلق کرنے کی چیز ہے۔ سمجھنے میں۔ تصدیق اپنے آپ کو پائے سے پہلے خود دینے

جو قبر میں لٹا ہے۔ یہ قبر پوری دلی کی گھراں ہے۔ اس شخص کی زندگی افضل حتیٰ صامت۔ موت اور زندگی میں فرق کب رہتے دیکھتے ہیں یہ لوگ۔ سرحد چال سے پرے اور سر زمین خاک کے دل میں۔ یہ لوگ ہوتے ہیں اور میں ہوتے۔ نہیں ہوتے تو بہت ہوتے ہیں۔ دو سطر بہت شان والے تھے قلب صاحب کی زندگی میں۔ ایک جسدہ وہ دلی سے بلائے گئے کسی اور شخص میں۔ وہ چارہ تھے اور لوگوں کی آنکھیں ان کے رستے میں لٹ گئیں۔ وہ روک لئے گئے۔ دلی نے صاحب دل ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ پھر وہ جب چلے اس جہاں سے اس جہاں کو۔ وہ جہاں سے بھی اور بھی نہیں۔ ان کیلئے ہے جو ہیں۔ یہ جہاں بھی انہیں کیلئے ہے جو ہیں۔ جہاں جہاں والوں کیلئے ہوتے ہیں۔ تو دلی والوں کے آسمان کے راستے میں ڈوب گئے۔ مگر آپ نہ رکنے نہ روکنے کے لیے۔ محبت کس طرح کامیاب ہوئی ہے اور کہاں پار جاتی ہے۔ عجیب کسب نام جاتے ہیں اور کیا نہیں مانتے۔ قلب الدین تب بھی لوں پر راج کر تھا اب بھی کرتا ہے۔ راج کرنے والی شے تو ظاہر اس کے پاس نہ تھی اب بھی نہیں۔ پھر راج فرج کیا ہے۔ دوسرے فریوں میں کی کیا ہے۔ بادشاہ کو قلب صاحب کے پاس حاضری کا کاغذ نہ تھا۔ جس کو ان کا کاغذ نہ پڑھانے کا وجہ ملا۔ اس وصیت پر ان کا کوئی قریب ترین مصاحب بھی پرانے اڑا کہ وہ شخص میرا جنازہ پڑھائے جس کی تہہ کی نماز قضا نہ ہوئی ہو۔ یہی شب زندہ اور دہر اوتل کو چاہتے رہنا بھی کم نہیں۔ دوریوں میں کیا قرب تھا۔ فراق میں کیسے وصال کے سلسلے تھے۔ یہ کیا لوگ تھے کون لوگ تھے لب لخت نام ہی نام ہیں۔ قلب الدین ایک واقعہ تھا جو ہو گیا۔ اب ایسا واقعہ کب ہو گا اور یہی کوئی واقعہ نہ ہو جائے۔ لوگ واقعہ ہوئے بغیر ہوئے چلے چارہ ہیں۔ انتظار نہیں کرتے۔ مہر نہیں کرتے۔ انہیں کچھ کرنا نہ آیا۔ اُن کا جو دان کی قربان کا نام بھی ضرور ہے۔ وہ کتنے نام ہیں جو ہمیں یاد ہیں۔ کتنے ہیں جو ہمارا نام چاہتے ہیں۔ اور وہ تھے اسنے لوگ چاہتے ہیں اسے یاد کرنے کے کتنے میں نہیں آتے۔ یہ جان بچان کون دان ہے دلوں میں اور انہوں میں۔ یہ کون بھلا کون ہے۔ کیے جاناں میں کون۔ جس نے یہ کیا کہ وہ اس کون کو بیان تھا۔ وہ بھی ایک کون تھا۔ قلب صاحب بھی ایک کون تھا۔ کون دیکھان اس کے سادہ چہرے خود کون دیکھان تھا۔ ہر شخص اپنا کون دیکھان خود ہے۔ پھر یہ خود کہاں ہے۔ یہ خود بخود ظاہر ہوتا ہے کسی نہ کسی شخص پر۔ ہر کسی شخص پر اس لئے میں کون زندہ ہوتا ہے۔ کون زندہ نہیں ہوتا۔ میں قلب صاحب کے حزار پر اور مسافر ہو گیا۔ قلب الدین بھی ایک مسافر تھا۔ کہاں پیر ابو کہاں جاکے زندہ ہوا۔ مٹی ملائی ہے آدمی کو۔ اس مٹی سے ہمیں بھی ملا لیا۔ مٹی اب قلب الدین کی قبر پر ڈھری تھی جس۔ مجھے بھلاؤ الدین ذکر کیا کہ ملان کا ایک فقیر یاد آیا۔ مجھوت تھا۔ ایک معصوم پڑھتا تھا اور پڑھتا تھا۔ ماری ہر طرح کرتا رہا۔ یہ چاہنے لگا کہ وہ رقص کر رہا ہے۔ جب آدمی کو معلوم ہو جائے کہ وہ کیا کر رہا ہے تو سمجھ لے کہ وہ کچھ نہیں کر رہا۔ میں فتنہ ڈوب جاتے لیکن اب رہی نہیں۔

جندہ میرے دل دیکھا دیکھے میرے دل میں دل چلائے

کی دشمن رہے۔ لوگ دوست ہوئے۔ حضرت مقرر جان جاناں کو ایک شیعہ نے شہید کر دیا تھا۔ گاندھی کو ایک ہندو نے مار ڈالا تھا۔ یہ کتے کا وصف ہے جو اپنی نسل کا دشمن ہر ایک ہوتا ہے۔ کتا بھڑیے سے گزارہ کر لے گا۔ حتیٰ کہ انسان سے گزارہ کر لے گا مگر! ایک صوفی شاعر پہلے شاد ایک کانی میں کہتا ہے۔

کُتے خُش تے اُتے

اے انسان تجھ سے کتے برائی میں بڑھ گئے تھے۔ اچھائی میں بھی بڑھ گئے۔ ہم حقیقی اوصاف میں کتوں کا مقابلہ کرنے پر تے ہوئے ہیں۔ کتے تل کر نہیں کھا سکتے۔ ہم بھی محفلوں میں کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کیلئے کچھ نہ بچے۔ ہم وہ بکھ کھا جاتے ہیں جو کتے نہیں کھا سکتے۔ ہم رشتہ کھاتے ہیں۔ وطن کی مٹی بچ کے کھا جاتے ہیں۔ جمونی تمہیں کھاتے ہیں۔ سود کھاتے ہیں اور اس لئے دھوکہ کھاتے ہیں کہ دوسروں کا بڑا دھوکہ دیا جاسکے۔

جانے کا عمل ہے، پالنے اور کھونے کا فرق معلوم کرنے کے علم کا نام نہیں۔
قلب الدین اور مسلمانوں کے پاس ہندو بھی اپنی الجھنیں لے کر آتے تھے اور سچو کے جاتے تھے۔ اس تعلق کے سلسلے آج تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک مختلف حد تک حیران محض و شاعر و شہید میراں ۱۹۷۲ء کی ایک ٹوکی کے بارے میں نظم میں کہتا ہے۔

”میری ہانسی میں ہر دور کی بان ہے

میرا درخت کے نیچے بیٹھا۔ کسی مذہب کو برا نہیں لگتا۔ اس نے ٹوکی میں موجود اپنے بارے میں یہ بات کہی ہوگی۔ سچا رابطہ آدمی کو ایسا راستہ دکھاتا ہے۔ جس پر پہلے کوئی تعلق قدم نہیں ہوتا۔ میاواں کا ایک شہر بارہی مندر محل کا پناہ دہلی میں چھائی کی سڑک سے لگا ہوا ہے۔ میاواں کی میاں سلطان ذکر کے حصار پر دیکھیں تقسیم کیں۔ اس نسبت کی وضاحت کی طرح ہوگی۔ جبکہ دہلی میں بھارت میں کئی درگاہیں ہیں۔ اپنے شہر کی ہر شہر کی اپنی نسبت ہے۔ جو اس دائرے میں مندر ہے اور مصلحت بھی ہے۔ ہمارے علماء کرام وید مقدس کو پڑھنا حرام سمجھتے ہیں۔ وہ قرآن کریم بھی اپنی ذات پر وحی کر کے نہیں پڑھتے۔ اس کے معنی میں اپنا مفاد و موزن لے کیلئے پڑھتے ہیں۔ اولیاء ہوتے تو ہندوستان میں کتے مسلمان ہوتے بھلا۔ مسلمان تو کچھ ہندو بھی نہ بن پاتے لوگ۔ سچا ہندو مسلمانوں کے قریب ہوتا ہے۔ قلب الدین کو لوگ قوی والا کہتے ہیں ہم نے قوالی سے تہذیبی رابطہ توڑ لیا تو لوگ پاپ میوزک تک پہنچ گئے۔ سماع کی مخالفت کر کے نوالے روک لیں اب اس موسیقی کے لشکر کو اب سماع کو قابلِ سماعت نہیں دیتے دیا گیا۔ قلب الدین کی زندگی بھروسے گزری۔ موت و جد کرتی آئی اور ساتھ لے گئی۔ موسیقی بھی ایک مذہب ہے تو کوئی مذہب اس کے کیوں خلاف ہوگا۔ مذہب کے فہرہ و مخالفت کا اعلان کریں گے اور خود چھپ چھپ کے نہیں گئے۔ ہر کام خدائی کا وصف بھی رکھتا ہے۔ بس آدمی کو اپنے آپ سے نہیں چھپنا چاہئے۔ خدائی دو آدمیوں کے ایک ہی عمل سے مجروح نہیں ہوتی۔ کہیں جیسے ہوئے بہت سے لوگ بھی تھا ہونے کا لطف لے سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے عملوں پر نظر نہ رکھیں۔

قلب الدین خاندانِ چشت کے قرائع و دل لبرل صوفی تھے۔ یہ مقرر جان جاناں بھی دلی میں تھے۔ فقیرانہ سید سیدھے۔ جو برمال طریقت کو شریعت کے تابع سمجھتے ہیں۔ دلی شاعر مقرر جان جاناں نے لکھا کہ

”ہندو کو بھی مشرک نہ کہو۔“

جبکہ سب مسلمانوں کو مشرک کہنا بیان کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی جو فلاں کو مشرک نہیں مانتا وہ بھی مشرک ہے۔ یہ فتوے کے الفاظ ہیں۔ فتوے ہانسی بیڑاؤنی سے کم کھیل نہیں۔ صوفی دلی لفظی نہیں مارتے۔ ان پر فتوے لگتے رہے ہمیشہ۔ فتوئی ان کے خلاف ہوا۔ فطرت ان کی ساتھی رہی۔ مولوی ان

مصافحے کا عکس

گھر وہ ایک نگاہ جو میراں پہلے سے موجود لوگ آنے والوں پر ڈالتے ہیں اور جانے والوں پر پھینکتے ہیں اس میں استقبال اور اوداع کے بزار انداز پنہاں ہوتے ہیں۔ اور چھٹی ہوئی شے ظاہر ہو چکی ہے ابھی ہوئی ہے۔ اور لقب تو ہوتی ہی ہے۔ کئی لوگ ہمیں مسلمان سمیت جانتا دیکھ کر بے نہیں مگر ان کا دیکھنا ایسا تھا جیسے کہ رپہ ہوں۔ اچھا تو تم جارہے ہو۔ ہم جب راج توپ ہوئی سے نکلے تھے خوش تھے۔ آج کیوں اداس تھے۔ بس تھے۔ جب آدمی کیوں کلابند سوچے تو یہ خطرناک نہیں بن پاتا۔ عطا فترا لوں سے حساب کتاب کرنے کا ذکر پر گیا وہ جرم نری جس نے مجھے پہلے دن کھانا کھلا دیا تھا۔ بابر سے آتے ہوئے کچھ کر دروازے پر ہی کھڑی ہوئی۔ دروازہ گویا بند ہو گیا۔ وہ دھیرے سے مسکرائی تو دروازہ آہستہ سے کھل گیا۔ وہ ناراض بھی تھی کہ میں اسے ملاؤں۔ وہ زیادہ خفا نہ تھی کہ وہ بھی اتفاقاً اور اچانک ملاقات کی جرت میری خوشی سے واقف تھی۔ اس نے کہا کہ تم نے مجھے اپنا کمرہ نمبر بھی نہیں بتایا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس نے کب اپنا کمرہ نمبر بتایا تھا تو وہ ہنسنے لگا۔ نہ سرخ سے مجھے زیادہ سرخ ہوئی۔ اب کس اس کا سنگی تر جہان کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ انگڑیا دھرتا ہو گا۔ اس کا رویہ سبتر آدمی والا تھا۔ ان دونوں نے مجھے کھانے کی ہونٹ ہی بکرم میں نے شمرے کے ساتھ قبول نہیں کی۔ انہوں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ وہ آگے چلا گیا اور وہ مجھے پرتک چھوڑنے آئی۔ جیسے میں میراں اس کا مسلمان تھا۔ میں مسلمان تھا یا نہیں۔ وہ میزبان ضرور تھی۔ اس بھی عورت کسی نہ کسی طرح ضرور میزبان ہوتی ہے مسلمان ہو تب بھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ خوش اخلاق چینیوں کی طرح وہ تیک ملائے رکھا اور ملائے رکھا۔ وہ ذرا اداس ہوئی لیکن اداس تو وہ اکثر ہوتی ہوگی۔ کبھی پھٹکی اداسی کی ایک اور فطری کم چروں کو نصیب ہوتی ہے۔ ایسے نصیب والے لوگ زیادہ کیوں نہیں زندگی میں۔ اس کیوں میں خواہش بھی ہے۔ اس لئے یہ تکلیف دہ ہے۔ اس کا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ دنیا میں خوبصورت رائے کا بھلا ہے تو اس پر اس ہاتھ کا کش ضرور ہوتا ہے۔ میں آج بھی کسی اوداعی کیفیت والے لمحے میں پیچھے مڑ کر دیکھوں تو وہ مجھے نظر آئے گی۔

قائد اعظم زندہ باد

ایک گھر صاحبانی نے اپنے گھر میں دیو دیو کی سورتوں کے درمیان قائد اعظم کی قد آدم تصویر لٹائی ہوئی ہے۔ وہ روز تصویر کو پر نام کرنا ہے۔ ہم پوری طرح حیران و پریشان ہو چکے تو اس نے حریف کیا کہ وہ قائد اعظم کا شعر گزرا ہے کہ وہ آگے مسلمان تو لے گیا میراں سے۔ ورنہ ہم سے تو یہ بھی نہیں سمجھتے جو ہیں۔ انہیں ختم کرنے کے جن ہندو غناے اور ہندو عیسیت کر چکی۔ ختم ہی نہیں ہوتے۔ پاکستان والے بھی ہوتے تو ختم کیا ہوتا۔ پاکستان کے حق میں یہ کیا کالمانہ استدلال ہے۔ ہماری حکومت اپنے دانشوروں اور نوکر شاہوں (بیورو کریٹوں) کو سین بھی اس مقصد کیلئے بھیج چکی ہے کہ وہاں مسلمانوں کا کام و نشان معافی اور آسانی سے کیسے ملتا دیکھا۔ کوشش تو بہت کر رہی ہیں دنیا کی مختلف قومیں۔

ہندو مسلم کی ظاہری پہچان بھارت میں مشکل سے تو فسادات کے دنوں میں ہندو مسلمانوں کو کس طرح پہچان لینے پر اور مار دیتے ہیں۔ کبھی غلطی سے بھی کسی ہندو کو عیس مارا ہندوؤں نے۔ شہم خفی کے گھر کا لی دیوی کی صورت ہے۔ یہ کوئی بات نہیں۔ دیوی عورت ہی ہے۔ مگر کیا بھارت کا کوئی مسلمان اپنے گھر میں قائد اعظم کی تصویر لگا سکتا ہے۔ یہ کام بھی ہندو ہی کر سکتے ہیں بھارت میں۔ وہ اکثر کوئی ہندو تارک بھی تصویر اس ہندو کے قریب تر ہے۔ جس نے قائد اعظم کی تصویر گھر میں لگا رکھی ہے۔ اس سے ملتی جلتی کئی تصویریں گوپی کی زبان کے ساتھ ملتی ہوئی ہیں۔ مثلاً قابل کی تصویر۔ گوپی ہوتا ہے تو لوگ دھوکہ کھاتے ہیں۔ جس طرح قائد اعظم کی تصویر اس ہندو کے گھر میں لگتی ہوگی۔ گوپی ہوتا ہے تو چھاپے لاس کی وجہ سے بالواسطہ کسی روز وہاں ادب کو قائد اعظم کی تصویر لگتی ہوگی۔ جس طرح خود تسلیم کاغذ کی وجہ سے اردو کو ملتی ہوگی۔ اگرچہ اس سے فوری مقصد انگریز کا یہ تھا۔ وہ اپنی حکومت کی کرنا ہے تھے اس طریقے سے۔ گوپی کا کام بھی تارک ادب اور دھوکا سمجھنا ہو گیا ہے۔ قائد اعظم کی تصویر پاکستان کے اکثر گروں اور تمام دفتروں میں ہوتی ہے۔ یہ تصویر روپوں پر بھی ہے۔ کئی پاکستانی اس تصویر کا اس ہندو کی طرح احترام کرتے ہیں۔ جو کسی ان کی نظر قائد کی تصویر والے فوٹوں پر پڑتی ہے۔ وہ انہیں ہم کر دینے سے لگتے ہیں اور ناچار سے ناچار کام بھی فہر آکر دیتے ہیں۔ قائد کا کام ان کو موزے۔

قائد اعظم زندہ باد۔

بھارت والے اپنے فوٹوں پر دیوی دیوتاؤں کی تصویر بناتے ہیں کہ اس طرح ان کے درشن ہوتے ہیں اور دنیا کے کام بھی چلتے ہیں۔

ہر سے رام ہر سے رام

اور یک نعتی سے جو مجھے اس سے ہے۔ دلی کیا بازار مجھے نہیں لگے۔ ہاتھ باندھ کر کھڑے لالائوں کی خاکساری بھی کوئی خاص نہ تھی۔ ایسا موسم، معاشرہ ماحول کب کہاں ہو گا کہ کاروبار کے سارے دھندے ختم ہوں۔ جو چیز جسے ضرورت ہو اسے مل جائے۔ کس طرح مل جائے۔ بس مل جائے۔ ماہرین اقتصادیات نہ مایں مگر مجھے یقین ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب نہ ہوں گے میں نہ ہوں گا مگر یہ ہو گا۔ مجھے ان کیوں میرا یہ خیال ہے کہ جنت کا خوشحال عالمی کتابوں میں ہے، وہ دنیا میں ہو گا بھی نہ کہی۔ کچھ خاص لوگوں کیلئے تو ہے اب بھی جب سب لوگوں کیلئے ہو گا۔ ان لوگوں کیلئے جو جہنم میں رہتے ہیں۔ میں نے اس طرح کے منظر الہی آنکھوں سے دیکھے ہیں، جو قرآن میں بیان کئے گئے ہیں۔ بہت بڑی کتاب ہے قرآن کئی اور مکمل۔ کیا میں سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ سوال نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو اس کا جواب ہاں یا ناں میں نہیں ہو سکتا۔ کچھ سوال جواب سے زیادہ اطمینان بخش اور مزیدار ہوتے ہیں۔

قرآن تو ایک ذوق پیدا کرنے والی کتاب ہے کہ عقیدتوں کو ایک اور حقیقت میں جذب ہونے دیا جائے کہ ان کا نام نشان مٹنے نہ پائے۔ رسولِ اعظم نے نبوت سے پہلے کی معاشرت کو بہت حد تک زندہ رکھتے دیا۔ ہندوستان کی مٹی کی تاثیر بھی مسلمانوں کی تقدیر میں مکمل گئی۔ اب عہد حاضر میں انسان کا روشن مستقبل اور اسلام کا آئندہ تابندہ کسی مقام پر کیجیہاں ہو گے تو وہ زندگی کا نقطہ عروج ہو گا۔ ورنہ قیامت کی ہر علامت اسچنے پورے معانی سے دور رہی ہے۔ پر اسے قیامت نہیں آئی

قیمت کی جمع قیامت

خریدنے کا دھنک مجھے نہ آیا۔ بیچنے کو کچھ میرے پاس ہے نہیں۔ کسی کا ایک وقت کی روٹی کیلئے مگر کے رتن بیچنے کا معاملہ اور ہے۔ ہمارا ایک دوست دوسروں کی طرف سے پیش کی ہوئی کتابیں بیچنے کی عادت میں جتا ہے۔ ”بیٹ نہ بیان روٹیاں نہ بھی گھاں کھوئیں“۔ وہ کہتا ہے کہ ان کتابوں کا مصرف اس سے اچھا اور نہیں۔ لوگ اپنے آپ کو کچھ دیتے ہیں اپنی کو قلم کوچ دیتے ہیں کہ حرا آجاتا ہے۔ لوگ حرا لینے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیتے ہیں۔ جس واسطے اللہ کو سوا بیچتے ہیں۔ بی کرنا ہے سب کچھ خریدا لیا جائے۔ کوئی مانے گا کہ میں نے اپنے لئے کچھ نہ خریدا۔ مجھے جو دو چار تحفے ملے وہ بھی خاتون کیلئے تھے۔ کتابیں بہت پیش کی گئیں۔ مگر اسے اس طرح کا تحفہ نہیں سمجھتے۔ یہ اگر تحفہ ہو تو کوئی نام اور ہونا چاہئے اس کیلئے۔

ہم گم شدہ شے کی طرح جدھر نہ آتا چل دیتے۔ جس بے تکلفی سے ہم پھر رہے تھے۔ اس طرح مہارت کا صدر بھی نہ پھر سکتا تھا۔ پردھان منتری تو بالکل نہیں۔ جس طرح ہم ابور میں گھومتے ہیں۔ صدر پاکستان کب پھر سکتا ہے۔ موٹی موٹی توختوں والے لالہ صاحبان کو انور مسعودی مشہور پنجابی نظم کا یہ مصرعہ سنانے کوئی چاہا۔

تو کہہ جانے بھولے مجھے اتار کلی دیاں شٹاں

لالہ سی میں یہ جانتا ہے کہ اتار کس طرح بیچتے ہیں کلی کو کیسے۔ اور ان صفات والی دوسری چیزیں ابھی بہت پر بیچنے کے کیا بنا کر رہتے ہیں۔ لاہور کے بازار کلی بازار میں آدھے سے زیادہ لوگ کچھ خریدنے نہیں آتے۔ پھر نہ پھرانے آتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج اور ورڈش کالج کے طلبہ و طالبات ان میں کلی کی باری مہاں پھیرے لگاتے ہیں۔ ایسے ہی ہوتے ہوں گے جو گریوں والے پھیرے۔ اسے جو گھٹاں والے پھیرے بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ کتابوں میں بھی ہوئی خوبصورت اور ہم سے کبھی نہ خریدی جاسکتے والی قیمتی چیزوں سے زیادہ ٹھکے ٹھکے اور مال دار چہرے مفت میں دیکھنے کو ملتے تھے اب بھی ملتے ہیں۔ ایسے چروں والے لوگ بھی انٹرایسے ہی آجاستے ہیں۔ اور انہیں دیکھنے کی سب کو آزادی ہوتی ہے۔ غصہ ہی ہوا کہ جھوٹے اجڑے ہوئے خریدے گھروں میں بھی پھینچتے ہیں۔ کوئی انہیں بلانے نہیں جاتا نہ کوئی انہیں ایسا کرنے سے روک سکتا ہے۔ دلی کے بازاروں میں شاید سندر کو مل چروں واپس پر دالے کی پابندی ہے۔ مجھے یہ لوگ کہاں پھیرا کر رکھے ہیں۔ ہمارے بچوں نے۔ دلی میں فکر آتے نہیں پھول سے چہرے۔ یہ حالت پتہ نہیں کب ہے۔ خریداری تو محض ہمانہ حق خرید و فروخت جتنی بھی ایمانداری

بھٹی ہو سے مختلف تھی۔ شاید وہ کہ پیچھے کے انداز مختلف ہوں۔ دونوں ملکوں میں عام مسافروں کے لئے یہ بڑا گوارہ تو ہوتی ہوگی اسے گوارہ کرنے کی اہلیت بھی خود بخود یہ اہو جاتی ہے۔ گاڑی کا سربست پسند ہے مجھے۔ گاڑی اب ہمارے تدریجی مٹاؤی سلسلوں کی ساتھی ہے۔

گڈی کوک مریدی اے

اس کے آگے جس کا بھٹی چاہے اپنی مرضی کا مسافر لگالے۔

یہ عجیب شام سڑھی تھی۔ ہم کچھ دیر تک کھڑے رہے۔ پھر سارے ڈبے میں ہمارے پاکستانی ہونے کی خبر پھیل گئی۔ کئی آدمی ہماری سیٹوں پر غیر مجتہد چڑھانے کیلئے اپنے طور پر کوشش کرنے لگے۔ اور وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ ایسے لوگ ہیں جن سے ہمت عمارت میں بھی ہیں۔ زیادہ تو جوان لوگ ہیں۔ میں ایک کڑی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ رات شام کو اپنے پیچھے میں سے رسی جھنجھ ایک میلہ میلہ سارا اندھیرا ڈھانچا۔ ابھی دلی ہمارے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ ملکوں کے سامنے اور ان میں کچھ آدمی ہمارے سامنے نظروں سے چھٹتے جا رہے تھے۔ گاڑی دیرانے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا آدمی کے لمس سے آزاد ہوئے تھی تو حرا آئے گا۔ جدا ہونے کا پناہا ہے۔ اس سے پہلے میں نے اس مصرعے کو بھی جپیدگی سے نہیں لیا تھا۔

کون جانے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اب وہ دلی نہیں رہی۔ دلی کی وہ گلیاں نہیں رہیں۔ انہیں چھوڑنا تھا مشکل نہیں رہا۔ میں مشکل میں تھا مجھے دلی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس دلی سے بھی جسے کچھ لوگوں نے اپنی ادبی مملکت بنا لیا ہے۔ اس ناچازر قبضے کو مضبوط کرنے کیلئے کئی جائز کام نہیں ہو رہے ہیں۔ دلی سے ادبی وصل کے خواہشمند ان سے بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ مگر میں ادبی طور کا عشق کرنے والا ہوں۔ میں نے لکھنے پر مٹنے والوں کو ایسے آدمیوں کی خوشامد کرتے دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ منافقت کرتے دیکھا ہے۔ کہ کبھی کبھی تعلقات پر ناچازر تعلقات کا شگ ہوئے لگتے ہیں۔ منافق کے ساتھ منافق ہونا کسی حد تک جائز ہوگا۔ مگر یہ اس طرح جائز نہیں جس طرح شبیر کے سامنے شبیر ہونا لازمی ہے۔ تجاوت خیالات اور تجاوت منافقت میں فرق نہیں رہا ہے۔ وہ پاکستانی نظم نگار کیس میں جھپٹا رہا دلی جانے کا چنگا پڑ گیا ہے۔ دلی سے محبت دیکھنے والے کئی بیٹوں کو کچھ بھی منافقتیں سے محبت ظاہر کرنے پر مجبور ہیں۔ محبت ظاہر کرنا محبت کرنے سے مشکل ہے۔ اس مشکل کے بعد ان کے لئے آسانی یا آسانیاں ہیں۔

میں نے نظروں آتی ہوئی دلی پر آخری نگاہ ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ دیکھنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ یہی ہے۔ دلی پوری آج کب تک کے ساتھ میرے سامنے تھی۔ کسی شے کو اس طرح دیکھنا بار بار دیکھنے سے بڑھ کر ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ جو سب سے دلی کا محاورہ ہے اس کا عقل دل کے علاوہ دلی سے بھی ہوگا۔ بہت لوگ ہیں جو دلی میں رہتے ہوئے بھی دلی میں نہیں رہتے۔ ان کے دل میں رہتے پر پابندی ہوتی ہے۔

گڈی کوک مریدی اے

گاڑی پینٹا غلام پر تیار کھڑی تھی۔ وہ دیر تک اسی طرح کھڑی رہی۔ وقفے وقفے سے کوک بھی مار لیتی تھی تھی۔ مسافروں کی تسلی کے لئے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ مگر ڈبے میں اندھیرا تھا۔ ہمارے ہر تھ پر قبضہ ہو چکا تھا۔ ہندو اس طرح قبضہ کرنے میں ماہر ہے۔ مسافرت کی اس رات میرا سونے کا ارادہ نہ تھا۔ سفر میں سہولت عجیب حرکت لگتی ہے۔ ابھی ہم نے ان ہندوؤں سے چھوٹنے کا خیال ترک کر دیا۔ ویسے بھی آج کل ہم ان سے چھوٹنے کے ارادہ چھوڑے ہوئے ہیں۔ ہم ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کر رہے ہیں ہر چھوڑا ہو سکتا ہے۔ ہندو بھی چھوڑا نہیں کر رہا۔ ان دنوں قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مقبوضہ چھوڑ کر بھی قبضہ کر رہا ہے۔ اس نے مقبوضہ کشمیر پر کئی بار قبضہ کیا ہے۔ آسام اور اب اپنے پنجاب پر ایک بار پھر قبضہ کرنے کیلئے اٹھتا ہوا پاؤں مار رہا ہے۔ گولڈن ٹمپل پر قبضہ کر بھی لیا ہے۔ کئی مسجدوں پر اس کا پہلے سے قبضہ ہے۔ کسی نے کسی طرح قبضہ کرنے کی پریکٹس تو جاری رکھنا ہی ہے۔ اور میں تو یہ عادت شور مچا کر پوری کر لی جاتی ہے۔

جین ہمارے علاقوں پر قبضہ کر رہا ہے۔ پاکستان اپنے ان علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہے۔ جہاں ہم قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ہمسایہ ملک ہمارے دلش کی طرف آنے والے پاؤںوں پر قبضہ کرنے والا ہے۔ باہر آسمان پر پاؤںوں کی شرعے ٹھکریاں فضا میں چھینچھین کرنے لگی ہیں۔ یاہارتیوں کو چارہ دیں۔ نیانے کس ملک سے لپٹا پھر چڑھا کر آئی ہیں۔ پاؤںوں جیسے آسمان فواز محض انیکھو شرابا ہمارے پاس آ گیا۔ اسے تو ہمارے جانے کی اطلاع نہیں تھی۔ وہ نیانے کس کس سے پوچھ کر آیا تھا۔ جتنی بھی بھرا آ رہی ہے۔ مشہور حزان نگار اور یہ ہے۔ یہ شرمیلی کی کیا غرض بندھی ہوئی تھی ہمارے ساتھ۔ شاید زندگی میں پھر اس سے ملاقات بھی نہ ہو۔ اور اس کی میرا بیان دھیر ہوئی جاتی تھی ہمارے آس پاس۔ دلی میں اس شام کی آخری کھڑیاں اس کی عقل موجودگی میں پہلے سے کی طرح جتی جا رہی تھی۔ اس کی جھپٹوں میں فرق نہ آیا تھا۔ یہ اس طرح کا وقت ہے جو آدمی کے اندر مارتا ہے۔ ہر وقت گزرتا رہتا ہے۔ میں نے شربا کو پاکستان آنے کا کہنا سنے ایک ناخوشی کے بعد کہا۔

”میرے لئے آپ ہی پاکستان ہیں۔“

”میں نے اس سے کہا کہ ہمارے تم بہت سہو جانے تو مسئلہ ہی کوئی نہ ہو۔“

باہر کے لوگ بھی کسی سے گاڑی میں تھے۔ یہ گاڑی اپنے عام روپے میں پاکستانی گاڑیوں سے مختلف تھی۔ مگر یہاں جو خاص طرح کی بو تھی وہ پاکستانی گاڑیوں میں

”میں رات منٹائی جا رہی ہے۔“
اس نے جواباً کہا کہ اس طرح جیسے میں نے اس سے غلط بات کر دی تھی۔
”اوجھڑ پہلی بار آئے ہو۔“

میری بے قراری اس سے کمزور تھی۔ اگلا شیش آنے تک ایک بار بھی اس نے میری طرف نہ دیکھا۔ گاڑی رکھنے سے پہلے میں اس کے پاس گیا۔
 ”اگر مجھے موہن داس مل جائے تو۔“

اس نے بے یقینی کے انداز میں مجھے دیکھا آخر وہ کھل نہ ہو سکا۔ وہ باہر دیکھنے لگی۔ میں باہر نکل آیا۔ روشنی اندھیرے میں ٹھکنے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ اچھا کر رہی تھی۔ نجانے لوگوں نے اسے صبح کا ذب کیوں کہا ہے۔ صبح کسی عالم میں کا ذب نہیں ہو سکتی۔ کتنے ہیں صبح گناہ کا خیال دل میں نہیں آتا اگر آئے تو پھر کیا کیا جائے۔ گناہ وقت گناہ نہیں ہوتا اور کیا گناہ کا کوئی وقت بھی مقرر ہے۔ یہ گناہ کبیرہ اور صغیر کی تقسیم کیا ہے۔ نیکی چھوٹی بڑی کیسے ہوتی ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ بندہ خود یا اس کا خدا۔ ہم صبح کا ذب اور صبح صادق دونوں سے لاپرواہ ہیں۔ سچ بولنے کا قرینہ اور جھوٹ بولنے کا سلیقہ دونوں گنواٹھے ہیں۔ ہم گناہ بے لذت میں گھبر گئے ہیں۔ نیکی کرنے میں جو تنگ ہے وہ بھی ہمیں حاصل نہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر کسے اور کرنے کے سارے کاموں میں لطف مرکب ہے۔ ہم سب کام بے زاری سے کرتے ہیں ہجارت کے سفر میں صبح کئی بار ہم پر ٹوٹ پڑی۔ آج بھی صبح سطر کا جالا آماز سطر کی طرح ۱۲ مارے کا جانب بڑھ رہا تھا۔

گزر گئی۔ شیش پر دکی ہوئی گاڑی اکثر بعد میں چلتی ہے۔ میں اپنے ڈبے کی طرف لپکا۔ گاڑی بسٹیں بکھارے بغیر چل دی۔ میں دوڑتا ہوا کسی اور ڈبے میں چڑھ گیا۔ اس ڈبے میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ میں دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ گھنٹی تیرا ہوا میرے ساتھ لپکا ہوا تھک رہی تھی۔ مجھے حرا آئے گا۔ جگہ ہوتی تو میں اس ہوا کے ساتھ لیٹ کے سو جاتا۔ میرے بائیں میں ایک شخص لیٹا ہوا تھا مگر اس کے ساتھ نہ تھی۔ شکر ہے میرے لیٹنے کی جگہ نہ تھی۔ سوئے لوگوں کے درمیان ایک عورت جاگ رہی تھی۔ میرا پی چلا کہ اس سے کہوں کہ تم اتنی کیوں نہیں پیچھے شیش پر۔ وہاں ستمدار انتظار ہو رہا تھا۔ وہ خود خنجر سونوں میں تھری ہوئی تھی۔ ہم نے سخی سخی روشنی میں پہلے ہوئے خناؤں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ باہر دیکھتے ہوئے مجھے لگا جیسے وہ دیکھ رہی ہو۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ باہر دیکھنے لگی۔ شاید دیکھ ہی باہر رہی تھی۔ میں بھی باہر دیکھنے لگ گیا۔ اب وہ پھر مجھے دیکھ رہی تھی۔ یا مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ میں باہر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ سامنے اندھیرے میں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ یا میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک حیرانہ خوف کی لہر میرے سارے بدن میں تھرتی۔ میں نے جلدی سے ڈبے میں تھام لی ہوئی اس عورت کی طرف نگاہ کی۔ تو وہ برصغیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اور گھبرا گیا اور دوسرے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ اب وہ مجھے کسی طرح نظر نہ آ سکتی تھی۔ وہ میرے پیچھے اس طرح آتی ہوئی محسوس ہوتی جس طرح سامنے سے آ رہی ہو۔ میرے لئے سامنے دیکھتے رہتا اور پیچھے مڑنا یکساں مشکل ہو گیا۔ میں نے کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔ مگر نجانے کیسے ہم ایک دوسرے کے آنے سامنے کھڑے تھے۔ جیسے دو در سے ہوئے آدمی مقابلے پر اتر آئے ہوں۔ ذرا ہوا آدمی خاص خاص وقتوں میں ہمارے یا ظالم ہوتا ہے۔ خاموشی ہمارے درمیان جنگ کے طبل کی طرح سک رہی تھی۔ رات اس کے ساتھ ہی کا کام دے رہی تھی۔ در نہ دن کو یہ واقعہ اتنا اقد نہ ہوتا۔ رات معمولی واقعہ کو بڑا بنا دیتی ہے۔ مگر رات آدمی کی دشمن نہیں ہو سکتی۔ یہ سوچ کر میں نے اس کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ میرے کتنے سے پہلے وہ بولی۔ اس کی گواہ دست قریب سے سنائی دی۔

”تم موہن داس ہو۔“

مجھے چکر مار گیا۔ دنیا میں کون کون کے کسے ڈھونڈ رہا ہے۔ مجھے ڈھونڈا جا رہا ہے۔ وہ بھی کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ اس عورت کے سوال کا جواب ہاں میں بخیر ہو گایا یا نہیں۔ اسے میرے جواب کی ضرورت نہ تھی لاتی ہے قراری کے ساتھ حاشا کے عمل نے اس کے سوال کی ہزاروں آنکھیں بنا دی تھیں۔ میں نے انہماک میں جواب دے دیا تھا اس کو۔ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”میں تم موہن داس نہیں ہو۔ در نہ میں جہیں اُٹھ کر دیتی۔“

وہ چپ چاپ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ موہن داس کون ہے۔ مجھے کوئی پتا نہ والا تھا۔ اب

حال ہے۔ قلم کو اندر شری نہ دیا گیا یا تو توشا ہے۔ ہم انٹرنی میں ہار گئے۔ فنی میدان میں بھارت پاکستان سے خوف زدہ ہے۔ پاکستان میں بننے والے انٹرنیٹ کو بھارتی سیاستدان اور سائنس دان اسلامی ہم کا نام سے رہے ہیں۔ پاکستان کا نام بھی ہند کے مسلمانوں کو چڑنے کیلئے استعمال کیا گیا تھا۔ اور وہ بن گیا۔ کیا خبر! اسلامی ہم بھی بن ہی جائے۔ شاید بن ہی گیا ہو۔ پاکستان بننے کی خبر بھی کچھ علاقوں کے لوگوں تک اب پہنچی ہے۔ جب کوئی پاکستانی کسی میدان میں معرکہ مارنا ہے تو لوگوں کو یہ چاہیے۔ اس ہم کی خبر کئی لوگوں کیلئے ہم مگر کرنے کے بعد سے کہ نہ ہوگی۔ بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے مقابلے کی دوڑ میں ہیں۔ بھارت سیکورازم کا عنصر اور جی ہے پاکستان اسلام کا۔ اب تک دونوں طرف صرف ڈھنڈورہ ہے۔ آخر اور بھی جسا ہے بھارت کے۔ اب بنگلہ دیش بھی اس کا کھاسا ہے۔ بھارت میں کسی کو چھینک آتے۔ ذمہ داری پاکستان کی۔ ایک جلسہ عام میں ایک لیڈر تقریر کر رہا تھا۔ تیار تھا کہ آج آتے ہوئے اس کی کار ایک سائیکل سے ٹکرائی۔ ٹکرائی اور سائیکل والے کو پچھ میں ہوا۔ ٹھکراس کی کار کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اور ایک ہیہ اقدہ بلند ہوا جب جیلے میں کسی نے قہقہہ چھوڑا کہ یہ واقعہ تو پاکستان کی کسی گھری سازش کا پتہ دیتا ہے۔ بھارتی لیڈروں کو اور پتہ ہے تو حین ذکار آجائیں تو وہ بھارت کے معاملات میں پاکستان کی مداخلت کا بیان و لغ دیتے ہیں اور اس دوران بھی ایک آدھ ذکار احتیاطا دے والے ہیں۔ پہلے تو حکومتوں کے سلسلے میں روس اور امریکہ کی سازشوں کا ذکر ہو تھا۔ اب پاکستان کا نام بھی اس ضمن میں لیا جاتا ہے۔ یہ پاکستان کے حوالے سے ایک بڑی کامیابی ہے۔ ایک بڑا کام جو اب نہیں کر سکے مگر آپ کے ذمے لگ جائے تو یہ کمبات تو ہیں۔

حیاتِ افسانہ نگاری سے ملاکت ہوئی۔ وہ ہمارے ساتھ دلی سے آ رہے تھے۔ ہمیں خبر نہ تھی۔ ہمسفری یوں بھی ہوتی ہے۔ دبستان دلی کے بعد دبستانِ کھٹکی کی سیر کا دروازہ کھل رہا تھا۔ بلکہ غلامِ پرکھنی پڑی تھی۔ اس کی آواز میں ہر سے کے بند ہونے کے اعلان جیسا کرب تھا۔ اب دبستان کا زمانہ گھلا۔ اور دونوں شہروں کا شہر اولیٰ بن گیا ہے۔ ہم تو اب ادب کے حوالے سے صرف ”دبستانِ پاکستان“ کو مانہ تھے۔ ہماری ادب اس طرح کا شخص نہیں سکتا جس طرح پاکستانی ادب ہے۔ پاکستانی ادب کے سلسلے میں محمد حسن عسکری اور اچھو خیم کا بھی اختلاف بھی کسی بڑی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ پاکستان اب تک اپنے لیے ایک چیخ ہے۔ بھارت والوں کا چیخ بھی پاکستان ہے۔ پاکستانی ادب ایک بڑا معاملہ بن گیا ہے۔ ایک بڑا واقعہ بن چکا ہے۔

ہامو خود کو خواہشوں سے اٹاتے ہوئے لکھنؤ شہر کے شیش کالینڈر پر سے ٹکے نام تھا۔ ایسے ہی ہمارے لکھے جیسے سرگودھا شیشوں سے باہر آئے ہوں۔ یا بہرہ روقی تھی۔ ایک جلسہ جو ہر ہفتا مزدوروں کو پھانوں میں سائیکل رکشہ کھینچنے والوں کو موٹر رکشہ (سکوتر) چلانے والوں کا اور ان کے انجنوں کا۔ انجن کا کام انسان سے بھی ایسا جاتا ہے۔ سڑکوں پر دو رنگہ میں انسانوں گھوڑوں اور موٹروں میں مقابلہ ہوتا ہے۔ ہمارا مسلمان مزدور نے ایک سکوتر (موٹر رکشہ) میں رکھ دیا اور ہم اندر انگریزی طرف چل دیے۔ جو لکھنؤ ہمارے ذہن میں تھا غالب ہو گیا۔ دو رنگہ کو متنی کے بل پر سے گزرتے ہوئے ایک ٹھٹھکی کی لہرائی۔ ہم شہر سے باہر نکل آئے تھے۔ نیا مکان رام لعل نے نئی بستی میں بنایا ہے۔ اب جو سام ہم نے لوگوں اور اسٹوں سے پہنچنا شروع کیا تو پتہ چلتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹہ یا ایک تینتیس میں پہنچ جاتا ہو گیا۔ ایک ایک مقام سے کھانا گزرتے۔ کبھی دھرم کبھی دھرم۔ ہمارا رکشہ فینبال پھانچا۔ یہاں اردو کے مشہور افسانہ نگار رام لعل کو کوئی نہ جانتا تھا۔ اپنے شہر میں رام لعل کی اس کم شہرتی پر رونہ آیا۔ ہمارے ہاں افسانہ نویس پڑا ہے کہ لوگوں نے ان کی ایک بھی کتاب نہ پڑھ رکھی ہو (مجھ سمجھ میں نہ آتا دوسرا مسئلہ ہے)۔ مگر وہ انہیں جانتے خوب ہیں۔ لاہور میں اشفاق احمد، انتھار حسین، انور سجاد، لاکھ کمانی، کرامتیں، فی دی پر ڈراما سنہ لکھیں، بیروہ بنی نہیں سکتے۔ ہمارا یار امیو اسلام امجد خوب شاعر ہے۔ فی دی پر "وارث" نہ لکھتا تو اسے شاعر کون بتاتا۔ بھارت کا فی دی ڈرامے میں کچھ مٹا ہے۔ وہ اپنی فلمی برتری کو فی دی پر جیتنا ہے تو وہ کتری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ "چنار" کوئی فی دی پروگرام تو نہیں۔ فی دی ڈراموں اور دوسرے پروگراموں کے لحاظ سے بھارتی فی دی پاکستان سے مل کر کھا گیا ہے۔ کھیلوں کے میدان میں بھی اس کا بھی

ادبی گاندھی کی تخیلی لڑکی

ایک مقام پر مجھے سوروں کا روڈ نظر آیا۔ پھر کئی مقامات پر اکا، کاسہ اور سور کے بچے نظر آئے۔ یہ بہت شریف سورتھے۔ ان کے سراپے پر ایک شریر مینیسے کی سی شنی بھی نہ تھی۔ نجانے ہمارے ہاں سور کاغذ گالی کے طور پر کیوں استعمال ہوتا ہے۔ سور کے بچے سورتھے۔ جس طرح انوکے الو کا پٹا مڑا ہوتا ہے۔ دو تین سورا ایک گھر کے اندر چلے گئے تو میں نے کٹر گوالیا اور اس گھر میں جھانک کر دیکھا۔ عقاب جھانک رہا تھا کہ شاید رام لعل کے گھر کا پتہ چل گیا ہے۔ اندر بچے سوروں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ایک چٹکی بھلی لڑکی بھی ان میں ایک کے ساتھ باقاعدہ چار فرماری تھی۔ اس نے دیکھ کر مجھے ہنسی ملی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے ہانکا چاہا مگر اس کی آواز مجھ سے نکل کر آگے گھڑی ہو گئی۔ میں نے اس سے رام لعل کا پتہ پوچھ لیا۔ اس کے جواب سے پہلے میں نے اور سوال کر دیا۔

"یہ سور کبھی نہیں آپ لوگوں سے۔"

"ہر سوسے ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ اب ان میں سوروں والی بات ہے نہیں کوئی۔"

"اب بندوں میں بھی کہاں بندوں والی بات رہی ہے۔"

"کیا مطلب۔"

اس نے بندوں کو ہنسنے دیکھا تھا۔

"تم اپنی اس دیوی کو جانتی ہو جو ایک جڑ سے میں رہتی تھی اور جو وہاں جاتا تھا اسے سورا دیتی تھی۔ یہ سب سورا ہاں سے ہجرت کر کے تو نہیں آگئے۔ آپ میں سے کتنے لوگ پہلے جنم میں سورا سورتاں تھے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا وہ لڑکی ایک غصیلی فرحت میں پھنس گئی۔ ایک سورتے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے کہ رہا ہو۔ چاقی تو کمر رہا ہے۔

"اور ہندو بھی بہت ہیں۔" لڑکی نے سوروں کو ہنسنے ہوئے کہا۔

"ہندو تو خود دیوتا ہیں۔ ہمارے ایک پاکستانی کالست کہاں اور دانشور کے دوست ہیں۔"

"یہ کسی کو کیا دیکھیں تو قتل کر دیتے ہیں۔ ہاتھ سے روٹی چھین کر لے جاتے ہیں۔"

"پھر تو یہ واقعی اس کے دوست ہیں اور یہ کہ ہندو ابھی ہندو ہیں۔ میرا خیال ہے سور بھی ابھی سور

ہی ہیں۔ مورو زرا مورو اور۔"

"آپ عجیب آدمی ہو۔ بھلا سوروں اور ہندوں کا کیا رشتہ"

"یہ بھی ہمارے پاکستانی دانشور کے دوست ہیں اور دوست کے دوست آپس میں بھی دوست ہوتے ہیں۔ انہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ کس پاکستانی دانشور کی بات کر رہے ہو۔ وہ کون ہیں کبھی بھارت آئیں گے۔"

"تو رہے ہیں۔ آئے ہوتے ہیں۔ گل پر سون لکھو بھی آ رہے ہیں۔ تم انتظار حسین سے مل کر باقاعدہ ہندوؤں کی شکایت کرو۔"

"انتظار حسین۔ ہاں ہاں آج کے اخبار میں ذکر ہے ان کے یہاں آئے گا۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر جیل جلیلی بھی ہیں۔"

میری مٹی پھوٹ گئی چونکہ مڑ میں ہائی ہر آتا تھا۔ اس میں ذوق نہ تھی۔ وہ لڑکی بھی نہیں جب اسے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک بزرگ محقق ہیں 'ڈاکٹر جیل جالی'۔ تو مجھ سے معذرت کرنے لگی۔ شیکہ۔

میں نے معذرت قبول کر لی۔ لڑکی کہاں کہیں سے نکل آئی تھی۔

مانا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں بہت اچھے ادیب ہیں۔"

میں نے لکھنے پڑھنے کا کام سے تباہی نہ تھا۔ انتظار حسین کا نام لینے سے ہی اتنا اثر ہو گیا تھا۔ ورنہ اس نے کب انتظار کا کوئی افسانہ پڑھا ہو گا۔

"تو نہیں بھانا۔"

مانا نے بیٹا سے کہا۔ میں تمہارے سے ترو کے بعد بیٹھ گیا۔ خاصہ تھکن اتر گئی۔ میں نے لڑکی کی

مانا کو بھی دیکھا اس کا نام جھنگو تھا۔ پانچوہ میری ہم عمر لڑکی تھی۔ بیڑی دت کے بعد بھارت میں خوش شہلی کی حد تک پرکشش خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ بھی الفاظ ہو گیا تھا۔ سکول کی طالب تھی وہ

لڑکی۔ ایک سو میرے پاس آکر کھڑ ہو گیا۔ جیسے میں نے اسے کسی کام سے بلایا ہو۔ میں نے ہزار دھن بہت پھسایا۔ مگر لڑکی کی ہر حواں بہتر بہت میری حفاظت کرنے لگی۔ اس نے سور کو اپنی ہانوں میں سمیٹ

لیا۔ سور مجھے اس کی ہانوں میں تو پاگل اچھا نہیں لگتا تھا۔

"اس سے تو بہتر کہ تم کوئی بی بی ہاں لیتیں۔"

"وہ بھی ہیں۔" اس نے کتے کو آواز دی۔ پھر کئی کو پکارا زرد کنارہ گاٹی ملی اودھوں ساتھ ساتھ لگے۔ ہاتھ میں ہاتھ والے کے آستے تو بھی گریز نہ کرتے۔ وہ جس طرح پھینک کر تے آئے تھے۔ خاصا

غیر فنی تھا۔ حد جاری ہو سکتی تھی ان پر۔ مگر مراد چچ میں حائل ہے۔ سرحد کے کتے خاکسے ہیں بھارت میں کو۔

"تو ہمارے گھر میں ہندو کو بکلیں اور سوروں کی ہوں گے۔ ہونے چاہئیں۔"

"کیوں۔ کس لئے۔ یہ گھر ہے چڑیا گھر تو نہیں۔"

"چڑیا گھر تو یہ ہے۔" میں نے ایک جھٹی، چھٹی سے اس کی طرف دیکھا وہ منکرانے لگی۔

"میرے بندہ شرارتی بچوں سے بھی زیادہ بدتمیز ہیں۔"

"بندر استغلا حسین کی موجودگی میں کوئی غیر اخلاقی اور انقلابی حرکت نہیں کر سکتے۔ ان کے سامنے بڑا بڑا دشوار اخلاق اور انتہا پر مہل بیٹھا ہے۔ انتہا نے اپنے نام سے بہت قانہ اٹھا لیا ہے۔ مقابلے کے دوران بھی وہ اپنے لئے مناسب موقع کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اب وہ اس انتظار کا پھل کھا رہا ہے۔ اس کا پھل بھارت میں پک چکا ہے۔ وہ اسے کسی اور کی بھولی میں بھی نہیں گرنے دے گا۔ محفل میں بھی چپ کر کے بیٹھا رہتا ہے۔ حقو جب دیا جاتا ہے جب چل دو میں ہو۔ دوسرے لوگ تو چپے کر مارتے رہتے ہیں۔ یہ کام تو وہ بھی کر لیتی ہے۔ انتظار کے دوستوں کی قسمت میں اس کے دانت گنگے پھل ہی آتے ہیں۔ اس کا مقابلہ کرنے والے قاتل سے مر جتے ہیں۔ انتظار حسین کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ادب میں سیاست کو بے ادبی نہیں کرتے دیتا۔ پھر اس سے بڑا سیاستدان کون ہو گا۔ برصغیر میں مسرتا گاندھی سرحدی گاندھی کا بعدی ادبی گاندھی ہے۔ میں کس سے مخاطب تھا۔ وہ میرے سامنے کئی مگر میرے پاس نہ تھی۔

ہمارے پاس گاندھیوں کی کئی نہیں۔ بی ایم سید سندھی گاندھی اور غوث بخش بوزنجو بلوچی گاندھی کسٹوانے کے تھے ہیں۔ نواب زادہ لہراء خان کو جب الوطی کے باوجود بخانی گاندھی کہا جاسکتا ہے۔ نجات کیوں سارے گاندھی پاکستان میں واقع ہو رہے ہیں۔ اور کچھ کچھ قاتلہ اعظم ہونے کا مکان بھارتی مسلمانوں کے حصے میں آ رہا ہے۔ پاکستان میں قاتلہ اعظم تو کیا دیکھنا کاندھیری اب تک نظر آ رہا۔

میاں والی نگر

یہاں بھی اس شخص کی وہی عادت تھی جو میاں والی میں ہم سے مل کر ہوئی تھی۔ وہ میاں والی سے پیار کرتا ہے۔ میاں والی پاکستان ہے۔ وہ پاکستان سے بھی پیار کرتا ہے۔ اردو کا بھی عاشق ہے۔ ڈھاکہ میں میاں والی کے جنرل نیازی کے جتیار والے کا اسے اتنی دیکھ ہے جتنا مجھے ہے۔ یہ بات اس نے صرف کہی نہیں۔ اپنے سرفراز پاکستان میں لکھی ہے۔ یہ سرفراز بھارت اور پاکستان میں چھپ چکا ہے۔ "زر و چوں کی بھار" گورنٹ کالج میاں والی کے ادبی میگزین "سپیل" میں جنرل نیازی کے بارے میں غم غم سے لکھی ہوئی میری ایک تحریر سے اقتباسات بھی اس نے درج کر دیئے ہیں۔ وہ اپنے دکھ میں میرے درد کو شامل کرنا چاہتا تھا۔ اسے خبر ہے کہ یہ دکھ سارے پاکستانیوں کا دکھ ہے۔ اس نے کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے جب وہ لاہور میں تھا تو اس کے کمرے میں جناب جناح کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ اس کا قاتل تھا رہا ہے۔ وہ بھارت میں مسلمانوں کے قتل عام پر کئی بار احتجاج کر چکا ہے۔ پاکستان کی جائز حمایت میں وہ آگے آگے ہے۔ اس عمل میں وہ بھارت کا مخالف نہیں ہوتا۔

رام لعل اور مولانا کے دوسرے شرابہ فروشوں نے مل کر آل انڈیا میاں والی ایسوسی ایشن بنائی ہے۔ ایک چھوٹی سی ہستی "میاں والی نگر" نام کی رہائی ہے۔ ماہانہ اخبار "میاں والی گزٹ" شائع کیا ہے۔ ہر سال ایک بار دہلی میں میاں والی سیمینار لگایا جاتا ہے۔ ہندوؤں نے میاں والی کو تہنیتا کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ لیکن کوئی بھی میاں والی نہیں کھانا۔ ہمارے ہاں کئی دہلیوی اور لکھنؤی ہیں۔ کئی نو عمر لکھنؤی بھی ہیں کہ ان کے باپ دادا لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ بھارت میں تانہور وانشور لیکن ہاتھ آزاد و معروف تشرنگار ہرچیز چالو اور مقبول شاعر آزاد گھائی میاں والی کے ہیں۔

رام لعل پاکستان آیا تو صرف میاں والی میں اس کیلئے پانچ چلے ہوئے۔ باقی جگہوں پر بھی کم نہ ہوئے۔ اس کا سرفراز ان تقریبات کا ذکر ہے۔ ایک زمانے میں شاعروں نے بنگالی طور پر لکھنؤ کا رخ کیا تھا۔ افسانہ نگار رام لعل نے ایک اور طریق سے بنگالی طور پر لکھنؤ کو آباد کیا ہے۔ وہ ایک اچھا افسانہ نگار ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے افسانے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ آج کے دور میں یہ عجیب تصور کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے سب کچھ کوئی۔ یہ شاعروں بھی مقبول حاصل کر کے لکھنؤ کوئی اچھا طریقہ تھا۔ رام لعل نے خوب بات کی ہے۔

"ہمارے عوام سماج میں شعر کو بیلاور کہانی کو کوئی تصور کیا جاتا ہے۔" یہ سچے کی بات ہے اس پر

عزت و تہاؤ اور احرار نے مضمون باندھا ہے کہ افسار نگاہ کے ساتھ لوگ وہی سلوک کرتے ہیں جو بیٹی کی پیدائش پر مبارکباد دینے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انوار اور رام کو بت ہوتا چاہئے کہ ہمارے کچھ جدید اور جلد باز افسانہ نگاروں نے بار بار یہ اعلان کرتے ہوئے افسانے لکھے کہ ان کی ”بیٹی“ کی جنس تبدیل ہو گئی ہے۔ مگر رام لعل نے اپنی بیٹی کو سینے کے برابر کہا۔ اور جی مبارکباد کا متحق ہوا۔ اب قزحہ سماج کے ساتھ ساتھ دلی سماج بھی بدل رہا ہے۔ بیٹیاں بازی لے گئیں ہیں کئی میدانوں میں بھر بھی ان کی جنس تبدیل ہونے کی خبر خوشی منائی جاتی ہے۔

رام لعل کی جتنی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنی بیٹی کو تکیہ کی تھی کہ میاں والی جانے تو اس گھر میں بھی جائے جہاں سرے ہاتھ کے گھیا تھا۔ رام وہاں گیا تھا۔ چلی سے مل کر محسوس ہوا کہ رام واقعی بیٹی کو بیٹا سمجھتا ہے۔ رام میاں والی والے اپنے گھر سے کچھ مٹی لے کر آیا تھا۔ وہ اپنے نئے مکان کی بنیادوں میں ڈال دی۔ کچھ چھوٹی چھوٹی کاریوں میں بچا دی جہاں اب پھول کھلے ہوئے ہیں۔ بامالند ان پھولوں کی خوشبوں دوسرے پھولوں سے مختلف ہے۔ ان کی بنیاد میں ہونٹ مٹی ہے۔ وہ میاں والی کی ہے پاکستان کی ہے۔ مجھے کبھی کبھی رام لعل کے افسانوں سے بھی یہ خوشبو آتی ہے۔

”دھوپ سرائے“ اور ”شبِ ہمایاں“

اس زیرِ تعمیر ہستی میں ابھی کچھ رستے منوہ وہیں۔ آدمی کو شاد کٹ کا بڑا شوق ہے۔ ان رستوں پر چلنے کا حرازی اور ہے۔ جہاں مٹی پاؤں کو چھوئے۔ آدمیوں کے بنائے ہوئے رستوں پر دوڑنے کوئی چاہتا ہے۔ ہم سڑک پر پہنچتے۔ دوڑ گئی ہوئی تھی۔ دریائے کو سنی کے پل پر سے گزرے۔ یہ انحصار دہائی والے جالہ ٹی بیسٹا ہے۔ بہنوں میں اس میں برسات کا پانی بھر گیا ہو۔ اور وہ دریائے لئی بن گیا ہو۔ دریائے کو سنی کے شرفان انداز بتاتے تھے کہ شہر کے پتوں بچ جائے گا۔ دریائے پل پر سے گزرنا اور اس کے کنارے چلنا اتنا مختلف ہے۔ لکھنؤ کے عرفان صدیقی کی شاعری پڑھنے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی دریائے کنارے کنارے جا رہے ہیں۔ عرفان صدیقی شاعری کی ایک نئی معرقت کا اعلان تلاش کر رہا ہے۔ پاکستان چھپنے والی بھارتی شاعری کا ل آدمی کی انگڑائیوں کی طرح پڑھنے والوں کے دود سے لپکتی ہے۔ بھارت میں اردو شعر کہنے والوں کی اقلیت مسلمانوں کی ہے۔ یہ بھی ان کے اقلیت ہونے کی دلیل بھی جاتی ہے۔ مگر مسلمان کہیں جیتے بھی کم ہوں۔ اپنے آپ کو کبھی اقلیت نہیں سمجھتے۔ شرط ان کے مسلمان ہونے کی ہے۔ اب مسلمان شاعر فطرت اسلامی کی کھلی رو سے آشنا ہونے کیلئے آمادہ نہیں۔ مسلمان دنیا کا جہان نامہ ان کے حیات و گروں میں پیدا نہیں ہو رہا۔ ہندو اسلامی مشترک تہذیب کے معنوی منصوبے کا کام ہوئے جا رہے ہیں۔ کئی شاعر شاعروں کے دولہا بن کر مقبولیت کے سرکش کھوڑے پر سوار ہونے کی خواہش میں رنچہ جارہے ہیں۔

عرفان ایک اور طرح کی شاعری کے میدان میں اترے۔ یہاں یہ سلام مقابلہ اپنے آپ سے ہوتا ہے۔ اس کے شعروں میں سرخروئی کی پہلی سرشاری پہچانی جاسکتی ہے۔ پھر ایک خوبیل مراقبہ ایک بچی مشترک تہذیب کا کشف آتا ہے۔

موجِ خوں نیلے سمندر میں سفر کرتی ہوئی
جلد روشن کبھی اس رنگ میں گڑگا روشن

مگر گڑگا کو بدلی طرح روشن دیکھنے والی آنکھ کسی طوفان اور سیلاب کا منظر دیکھ رہی ہے۔ وہ دونوں باتوں کو ملا دے گا۔ وہ پانی بھی نہیں ہے۔ جو آیا۔ سنے دریا کی صورت میں بنے گا۔ عرفان کسی وقت اردو کو خوبیل کرنا چاہتا ہے۔ اس نغمے میں ہمارے ہونے آدمی کے دل کے اندر امید اور تسلی کا منہ مستراح کی طرح چلتی ہیں۔ اسی پنک کی رہبری سے وہ قریب ہی دریا یافت کرنے کی توقع میں زندہ ہے۔

نکین سی کا دیا
راستے سب حدیں
آہائیں توفیں

پاکستان اور بھارت کی ہم عمر مسلمان نسل کے یہ نمائندہ شاعر اپنے وطن میں گمشدہ ہندوستان کی تلاش کو ایک حقیقی معرکہ بنائے ہوئے ہیں۔ مسلم ہند کی مشترک اور منور تہذیب سرتب کرنے کے ایک نئے بڑے عمل میں ان دونوں نے گماڑا کر دیا ہے۔ دونوں کے سامنے یہ ہو گا کہ کسی کو نصیب ہو جائے۔ عرفان صدیقی کیلئے ایک ممتاز بھارتی دانشور ابن عربی لکھتے ہیں۔

"تاریخ کے اس سفر میں روائوں، قدروں اور زندگی کرنے کے ڈھنگ کا ورثہ دلیل و ادب بن جاتا ہے۔ ہندو مسلم کے درمیان اس ورثے کا تحفظ اور فروغ ان لائق اور قربانوں کی یادداشت جو جہل سے انکار کیا۔ دینی پڑی ہیں۔ اس زندگی کی جستجو میں یہ شاعری بے حجت نہیں۔ یہ شاعری و جہل و غفلت سے شروع ہو کر مسجد و طلاق و خراب گوجران آرزو بناتی ہوئی سبز حیدر (القرآن العظیم) سے مستقبل کے سفر کیلئے راہنمائی حاصل کرتی ہے۔"

صلاح الدین کیلئے نپووان دانشور سراج منیر لکھتا ہے۔

"صلاح الدین کی شاعری ہمیں اپنے انتہائی حافظے کی کسی جہان زندگی کی خبر دیتی ہے۔ یہ بات بہت حد تک داری سے کہی جاتی ہے کہ یہ نثر کا شاعری تجربہ ہندوستانی تہذیب کی رموز و نمائندگی کرتا ہے۔ وہ ہم سے مانوس اور پیوستہ ہوئی لفظی تعلقات میں کام کرتا ہے۔ اس لیے میں اتنی قوت ہے کہ یہ ہمارے لبوں میں رواں منظر کے عکس سے ترتیب پاتا ہے۔ اس کے بارے میں رسالت کی طرف رخ کرنا اور اصل ایک سطح پر زمانی روح کا اپنے زلی سوتے کی طرف پھٹنے کا کام ہے۔"

عرفان نے ہمیں تحریف سے پہلے پہچان لیا۔ بظاہر ایک شاعر سارے ساتھ رکھ کا دیا چاہتا ہوں کچھ سکڑا یا جو کچھ گھبرا یا ہوا آدمی۔ اس نے ہمیں دو دفعہ چائے پائی۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک شعیب نظام بھی شاعر ہے۔ رام عمل چلا گیا کہ اسے کچھ ضروری قسم کا کام تھا۔ ان دنوں اردو اکائی کے صدر بیٹے کیلئے نکلیں تھی۔ درویش رام عمل کو بھی اس مذہب میں ڈال لیا گیا ہے۔ یہ کہ کوشش کسی سیاسی انتخاب جیتنے کی کارروائی سے تم نہیں ہوتی۔ مجھے یقین تھا کہ رام عمل جیسا صاف ستھرا آدمی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ چاہا کہ رام ہی سے کہ دوں کہ خواہ مخواہ کی تحریف نہ کرے۔ پھر میں نے سوچا کہ کچھ حاصل کرنے کی تمنا میں غلوں کے ساتھ دماغی کم کام نہیں۔ ہم نے اسے اجازت دی اور یہ بھی بتا دیا کہ کل شام کی گاڑی سے امر تر پہلے جائیں گے۔ یہ سن کر رام عمل خالی پینٹ قلم کی طرح ششدر رہ گیا اور اچھے اچھے بیٹھے کیا کہ وہ ہمیں کسی طرح جانے نہ دے گا۔ اس نے عرفان سے بھی مدد کیلئے کہا کہ وہ بھی ہمیں روکنے کیلئے کچھ کرے گا مگر اس نے اس کا ساتھ نہیں دیا

جانتی راتوں میں لڑاتے ہوئے سجد کے محبت
طابق مسجد میں کسی دل کی ترقی روشن
شب کا لوہان سلگنا پورا راتوں میں
خفاخوبوں میں خفاوں کا سویرا روشن
ابنی دھوپ میں چلنے ہوئے رشتوں کے شجر
گھر کے آگن میں مناجات کا چورا روشن

کا بیچ ہاتھوں میں دلدار و عاقل کے چراغ
اور آتشوں کے ستاروں سے مصلیٰ روشن
آؤ اب بندہ کریں کالی کتابیں ساری
رمل پہ ہونے کو ہے ہنر بھینچ روشن

اس کا شعری مجموعہ "شعبہ دریاں" شائع ہو چکا ہے مجھے بھارت کی اردو شاعری میں عرفان کے اسلوب نیاں کا پانچویں نم لکھا۔ ان کے انان شریا اور پچھ اور شاعری طرف جاتے تو ہیں یا نہیں آتے۔ ایک صلاح الدین پر دینے سے دو اپنی شعری نگار سے اعتبار سے کچھ ہمارا بناتا ہے۔ عرفان کا بھی۔ شاید وہ دونوں نہ جانتے ہوں کہ وہ ہمرا ہیں۔ یہ سال انکم کی محبت کی امر میں ہندوستانی پھر کے منتظرانے کی نئی ترتیب اور آئینہ ہندی ان دنوں کے لفظوں اور دلوں میں چلتی ہے۔ پھر کی روشیاں اور کی رنگ تینہ ہیں اور بگھرتے ہیں۔ اس بگھراؤ میں ان کے انداز مختلف اور منفرد ہیں۔ عرفان غزل اور پودہ انکم کے سبب ایک انکم "مجموعہ" میں نے بار بار پڑھی ہے۔

وہ ہمارا ہے

وہ ہمارا ہے

ہمیں کیلئے راستے چل رہے ہیں

وہ ایک ہے

ہمیں ایک ہے

آخری ہے

اس کے پاؤں کی انگلی کے ذرے میں پھپھ پائیں

اس کی آنکھوں کے پانی کی ایک پوند میں پانی پانی

اس کی انگلی کے کاغذ کے سامنے اپنی شہادت کا میں

وہ ایک ہے

ٹوٹی والے بچے

ہے۔ مسلمانوں کو انگریزی پر مجبور ہونا چاہئے بھارتی مسلمانوں کو ہندی پر بھی پوری دسترس ہونی چاہئے۔ ہمارے اکثر "ملائے دین" کو عربی اور اردو فارسی بھی نہیں آتی۔ وہ منبر و سول پڑھنا کر قلم اُٹاتے ہیں بلکہ قرآن جاری کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پاک و دراصل کتابت اور اشعار مسدس عالی میں سے پڑھتے ہیں وہ ان کے پڑھنے کے بعد عالی کے بھی نہیں رہتے۔

تو وہیں بہت شاندار لائبریری ہے جہاں ایک لاکھ سے زائد کتابیں ہیں۔ تقریباً ہر ضروری زبان میں کتابیں ہیں۔ دو تین طالب علم ہمارے ساتھ ساتھ ہو گئے۔ حالانکہ ان سے ہم نے اپنی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ ان سے پتہ چلا کہ جناب علی یار دور سے پہلے ہوئے ہیں۔ مسجد دیکھی یاہرے۔ مہمان خانہ دیکھا۔ وہاں رہنے کوئی چاہا۔ واپسی پر بڑے دروازے پر پہنچے جاتے ہوئے ملے۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ٹوٹی والے "بزرگ بچے" کو ادب سے سلام کیا۔ وہ جواب میں مسکرایا۔ اس نے میری ازگھی کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کی ٹوٹی اور میری ازگھی میں کوئی فرق نہ تھا۔ میں نے کہا آپ کی ٹوٹی کمال کی ہے۔ ذرا دکھاؤ۔ اس نے اُدھر اُدھر دیکھا اور ٹوٹی کنار کر سمجھادی۔ وہ ادب پورا پکا تھا۔ پورا راستہ پیارا۔ میں نے اس کی ٹوٹی کا کیا کرنا تھا۔ میرے سر پہ آتی تھی۔ میری طرف اس کی دیکھتی ہوئی نظروں میں ایک جھپک جھپک تھی سوال تھا۔ میں نے جلدی سے اسے ٹوٹی والہ پس کر دی۔ کہیں وہ سمجھ سے نہ کہہ دے۔

"ذرا اپنی داڑھی تو دکھاؤ"

تو وہ العلماء کے ابو الحسن ہمدانی علی میاں سے ملاقات کاوش پڑھا ہوا تھا۔ وہ عرب ملکوں میں بہت مقبول ہیں۔ پاک و ہند میں ان کا مقام بلند ہے اور ان کی بڑی عزت ہے۔ قبیلہ لہر یعنی میں دب اندر اندر کاؤ کلینچوری طرہ پانچ لکھ آیا تھا۔ تب بھی وہ اپنی ازگھی خواہش کے باوجود جناب علی میاں پہ ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ دُور سے ڈالنے کی بھی کوشش کی حسب معمول۔ ہمارا کٹہ نسبتاً ایک کھلے علاقے میں اس دیوار کے ساتھ چکر کھاتا جا رہا تھا۔ جس کے اندر کئی کھشوروں کا گھانا ہوا۔ ہم اپنا ٹکٹ ایک بڑے دروازے پر دوڑ کے گئے۔ یہ کسی جدید پینڈر سی گاڑی نہ لگتا تھا۔ کسی دینی ادارے کا یہ منظر منظور نظر ہے۔ دین کی تربیت کا انداز دنیوی جہاں و جمال کا بھی کندار ہوتا ہے جیسے دین و دنیا ایک دوسرے کی دوستی کریں تو آدمی آسمانی میں رہتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ تو وہ میں ادب بھی پڑھا یا جاتا ہے۔ اس لئے میاں سے فارغ التحصیل لوگوں میں شگفتگی اور کشاکش کی بہت ہے۔

بڑے طلبہ کے علاوہ ننھے ننھے بچے بھی دیکھے۔ سفید قبیلے جا بجا تھے اور سفید ٹوٹی میں بھلے لگے رہتے تھے کبھی کسی لباس میں ہوں انھیں لگتے ہیں۔ ان سے پتہ کر کے کوئی چاہتا ہے۔ مگر اب ان کے سروں پر ٹوٹیاں دیکھ کر ان کا ادب کرنے کوئی جاہور پا تھا۔ ایسے میں لگتا ہے جیسے بچے کے منہ پر کسی بڑے کاسر لگا دیا گیا ہو۔ خدائی قہداروں کا دل تو یہ بھی کرتا ہو کہ ان بچوں کے منہ پر داڑھی بھی لگوا دیں۔ ہر ہمدانی میں خاموشی تھی۔ پتہ چلا کہ کوئی طلبہ ہو رہا ہے۔ ایک عالم صاحب تقریر کر رہے تھے اور تصوف پر برس رہے تھے۔ برستے سے پہلے کرب، رہتے تھے۔ تقریر میں وہ یاد ہیں تو گہرے جتن ہیں اور برستے تھی۔ چھپتے صرف ان پر پڑتے ہیں جو سامنے بیٹھے ہوں۔ اس ضمن میں فطرت اور آدمی کے بنائے ہوئے متقون کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس وقت تو وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ جب شیخ ان کے پاس ہوتا ہے تو چچرا نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک شرب الملح ہے۔ جو کرہتے ہیں وہ میرے نہیں۔ کیا پتہ کس وقت کرنا چاہو؟ ذکر پر شاہد شروع کر دیں۔ پطرس ہمدانی نے انگریزی کے اس محاورے کا سیدھا اردو میں تراجم کر دیا ہے۔ لوگوں نے انہیں بھی انگریز سمجھ کر ہتھ نہیں کہا۔

ساتھ لکھنؤ میں ہندو مسلم فسادات نہ ہونے کے برابر ہوئے۔ مگر شیعہ سنی فسادات ماشاء اللہ بکثرت ہوئے ہیں۔ ہم ملنے میں نہیں گئے۔ خوبصورت و مظلوم والا یہ دینی ادارہ چل کر دیکھتے رہے۔ یہاں بوشل بہت ہیں۔ جہاں بڑے بڑے زار سے زار طلبہ مقیم ہیں۔ جبکہ طلبہ کی کل تعداد دو ہزار ہے۔ شافعیہ بڑے سو کے قریب ہے۔ طلبہ کو عربی فارسی اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی بھی پڑھانی جاتی ہے۔

مہاتما گاندھی پڑھ سکرین پر

رشتوں میں بہت عالم تھا والد کی موت کے وقت اپنی بیوی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ جب سے اسے اس عمل پر شرم آتی رہی پھر ساری عمر غرضی عمل (خود مسابقتی سے) ٹھک کرنے کی مشق کرتا رہا۔ اس نے اپنی بیوی کو کبھی نہ دیا۔ آخری عمر میں سینہ و ذہن چھو کر یوں کی باتوں میں بہتے کو پسند کرتا تھا۔ وہ ان میں سے کچھ کو اپنے ساتھ ایک چادر میں لپیٹ لیتا بلکہ لیٹا لیٹا دیکھتا اور دیکھتا کہ اس پر اور ان پر کیا کرتا رہا۔ اس نے تو ترک میں کچھ دن یا سنت بھی کی ہوئی تھی۔ مگر ان سبے چاروں چیزوں کا کیا تصور تھا۔ کہتے ہیں گاندھی اس آڑ میں لیٹا الو سیدھا کر لیتا تھا۔ جسے ماننے کو بھی نہیں چاہتا۔ اس نے اپنی کتاب میں اپنے بچپن کی غلط کاریوں اور دہائی کی بدفعلیوں کا جس طرح ذکر کیا ہے۔ یہ اعتراض اس کیلئے یوں قابل اعتراض ہو گیا۔ ہمیں اعتراض پس اس کے اس عمل پر ہے۔ ہمیں بھی کیا اعتراض ہے۔ اعتراض تو اس لڑکی کو ہوتا ہو گا جسے اس کے ساتھ نکاح یا تاراس کے ساتھ چلنا پڑا تھا۔ اسے بھی یہ اعتراض کیوں ہو گا۔ ورنہ وہ لیتھتی ہی کیوں۔ اعتراض تو اس کے بعد شروع ہوتا ہے اور یہ جائز اعتراض ہے۔

بہر حال گاندھی ایک آدھ راجا آدمی تھا۔ اسے تقسیم ہند کے بعد جیسے نہیں دیا گیا۔ وہ ہوتا تو شاید تاج محل بھارت کچھ اور ہوتی۔ موت سے پہلے اس کے سر ان برت نے عالم بدھوں کو کچھ لکھا۔ وہی جو مسلمانوں کو بے درجہ قتل کر رہے تھے۔ اتفاقاً برت من سے چلا ہو گیا۔ ورنہ گاندھی بھی کامن برت نہ لیتا۔ سے کم نہ ہوتا تھا۔ اس کے گاڑی کے تھوک کا اس نے بے مسخر کیلئے بھی اس کو غریب رکھنے کیلئے لاکھوں روپے خرچ کرنا پڑتے تھے۔ گاندھی نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ پاکستان ضرور جائے گا۔ فلم میں وہ مرزا سے توڑ کر اپنی بات منوانے کے بعد (ذاتی طور پر) دو داریوں کا سارا لے آ رہا تھا، تو لگتا تھا سیدھا پاکستان آ رہا ہے۔ یہ اچھا لگتا تھا۔ اسے قتل کر دیا گیا تھا کہ بدھ دارود کو ٹوک مسلمانوں کا قتل عام کر سکیں اور وہ پاکستان نہ جائے۔ اب تک بدھ لیڈر پاکستان آئے سے ڈرتے ہیں۔ گاندھی کے منہ سے ہاتھ رام لگاؤ اور دو دونوں خوبصورت چھو کر یوں کی گویاں مر گیا۔ اپنی تمام تر مکاریوں اور مکاریوں کے باوجود وہ ایک اہم آدمی تھا۔ وہ بھارت کا اصل عظیم تھا۔ اب تک اس کے نام کی حکومت ستر ستر گاندھی۔ مسٹر گاندھی۔ یہ بھی خاص پراسرار بات ہے۔ اس شخص اور اس نام سے بھارت کو کبھی نسبت ہو گئی ہے۔ غالباً۔ بدھوں سے ملتا جلتے ہیں۔ بڑی روح۔ وہ روح بھارت کے تپتے ہوئے بدھوں سے پرواز کر گئی۔ اب یہ خاک ہے۔ وہ حق ہے۔ تقدیر بدھوں سے خود ان کے بقول۔ میرے نزدیک یہ قتل ایک بڑی سازش کا نتیجہ ہے۔ بدھ لیڈروں کیلئے گاندھی اب ناقابل برداشت تھا۔ یہ سیاسی قتل ہے۔ مجھے گاندھی کے قتل اور قاتل کا علم کسی موت میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ پاکستان میں قاتل کی موت کی تعصبات سامنے نہیں آنے دی گئیں۔ گاندھی کے قتل کا اصل منصوبہ کب معلوم ہونے دیا جائے گا۔ گاندھی کی بے ہوشی سے نہرو کیلئے بہت مشکلات تھیں۔ کئی بدھ دانشور کہتے ہیں یہ اچھا ہی ہوا۔ نہرو سیاست میں گاندھی کی ضد تھا۔ گاندھی ترقی یافتہ دینی تقدیر کا حامی تھا۔ نہرو مسیحی معاشرے کے حق

ہم پھر عرفان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ کسی اور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ "کسی" کہنے سے یہ نہیں چلتا کہ یہ موت یا نہ کرے۔ ہم دفتر کے نیچے بازار پھر سے کیلئے اٹھے۔ ہم دوکانوں میں چیزوں کے داموں پر جیسے پھرے۔ پاس ہی فلم گاندھی کا ڈاگوا تھا۔ شہب کت خیر سے تک ہمارے ساتھ رہا۔ وہ فلم دیکھ چکا تھا۔ یاد رکھنا چاہتا تھا۔ اس کو جوان کا بھی کچھ نہیں چل رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں کھنکھی رکھ رکھاؤ اس طرح رکھا ہوا تھا۔ جیسے کوئی چیز کسی خلد جلد پر رکھی ہوئی ہو۔ عرفان کے بارے میں بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ جیسے مطالعے کے کمرے میں خالی پانی پڑی ہو اور یہ معلوم ہو کہ اس میں کیا تھا۔ کچھ قاسمی عرفان کے وجود میں ایک نئے نئے قلم کی ایک اور قسم کی کئی طرح سامنے ہوئی ہے۔ اس کی شاعری اس کیفیت کو بڑی بڑی کیفیتوں میں بدلنے کی کوشش کر رہی ہے۔

سیمپال میں ہمارے چاروں طرف بدھ مت کے حوزہ زیادہ عورتیں تھیں۔ یہ عورتوں کے دیکھنے والی فلم نہیں۔ برطانوی اداکار نے گاندھی کا کردار بہت خوب نمایاں کر اس نے اپنی اچھی اداکاری نہیں کی۔ جتنی اپنی زندگی میں خود گاندھی جی نے کی تھی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے بارے میں اس فلم کے حوالے سے کئی رد عمل سامنے آئے لیکن میرا خیال مختلف ہے۔ بدھ چاہتے ہوئے بھی فلم میں بھی اس عظیم کردار کو قرب نہیں کر سکے۔ زندگی میں کھلتے نہ کھاتے والا یہاں بھی جیت گیا۔ البتہ قائد اعظم (جناح) کا کردار کرنے والے اداکار کی شخصیت متاثر کرنے والی نہیں۔ یہ بھی نہیں سکا۔ جناح کو ان میں سکتا ہے۔ اس کے کردار کی اداکاری بھی نہیں ہو سکتی۔ گاندھی نے فیض آباد جیل کی لکھنوی باندھ لی۔ انگریزوں اور انگریزوں کیلئے تو وہ ایک بوجہ تھا اس حالت میں قاتل۔ قائد اعظم نے اپنی زندگی کے کچھ ایہ انداز کو غلط انداز نہ کیا۔ قوت لگوائے مگر سیاسی منافقت اور ثقافتی رد کار کی کو پاس سے نہیں گزر نہ دیا۔ ایک حق اس کی شخصیت میں۔ ایک عہد کا ابا لاجھی اس کی زندگی۔ وہ کچھ وہ تھا اس کی نقل بھی نہیں نام کی جاسکتی۔ وہ ہر لحاظ سے اصل تھا۔ فلم کے ایک سین میں قائد اعظم نے گاندھی کی طرف سے بدھستان کی وزارت عظمیٰ کی پیشکش منکرادی۔ میں نے کسی طرف غصہ نہ دیکھا۔ گاندھی نے کہا "بدھ اور مسلمان بدھ بدھستان کی دو اکٹھیں ہیں" اب بھارت دوسری آنکھ کو سامنے کرنے پر کیوں تیار ہوا ہے۔ گاندھی کیلئے قائد اعظم کی طرف سے یہ بہت بڑا سرکھٹ ہے۔ "ہر بدھ گاندھی نہیں ہو سکتا" وہ ایک بڑا لیڈر تھا۔ ایک بدھ لیڈر۔ ایک بدھ مسافر اور ہوا کی شخصیت کا استخراج۔ اس نے اچھوتوں کو انسانی درجہ دلانے اور مساوی حقوق کی کراؤ کم یعنی منظور کیلئے بڑا کام کیا۔ اس کے بلونود کچھ نازک ذاتی اور جنسی

اس کی زندگی کی طرح بہت بڑا واقعہ تھا۔ وہ ایک دھن والا آدمی تھا۔ ہم اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ مگر اس کو مانتے کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ اس نے ساری دنیا سے اپنے آپ کو منوالیا گاندھی جی تاریخ کے ناولوں میں زندہ رہے گا۔

ایک گفتگو اس کے وجود میں تھی۔ ایک کشش اس کے سامنے تھی۔ ذوالنی ذات و کائنات میں ہر طرح کے تضادات و فسادات کو ایک دائرے میں لانا چاہتا تھا۔ مگر وہ دائرے کا مرکزی نقطہ بدل کر دیکھتا جتا تھا۔ یہ اس کے حوزہ کی خاموشی سے قراہوں کا مظاہرہ تھا۔ اس طرح کئی دائرے بنے۔ چھوٹے بڑے ہوئے۔ دائرے ایک دوسرے کو ٹوٹتے بھی رہے۔ وہ دائرہ دور دائرہ شخصیت تھا۔

اس کے برعکس قائد اعظم اپنے دائرے سے کانٹو مرکزی نقطہ تھا اس کے گرد ایک دائرہ رہا۔ اس نے دائرے کو چھوٹا یا بڑا نہیں نہ ہونے دیا۔ یہ اس کی منظم شخصیت کا کمال تھا۔ کہ دائرے اور ماحول مستقیم میں فرق مٹ گیا۔ میں گاندھی اور جناح کے موازنے کے حق میں نہیں۔ مگر کیا کریں کہ کوئی دوسرا اس دائرے میں آتا نہیں۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ گاندھی جی ایک ناقابل فراموش کردار ہے۔ اس نے جو کچھ اپنی خود کوشش میں اپنے بارے میں لکھ دیا ہے۔ کتنے لوگ اتنی برات کر سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے قائد اعظم اور گاندھی جی کو نہیں دیکھا ہوا۔ وہ دنیا کے حرکت میں ہمارے عمران خزان اور بھارت کے کھل دیو کو دیکھ لیں۔ ایڈور گلہاؤزی اور بحیثیت انسان۔ شخصیت، عظمت، وسعت اور شہرت کے حوالے سے۔ فرق صاف نظر ہے۔ عمران نے حرکت کو اس مقام پر پہنچایا۔ کہ اب حرکت کرنا نہ تو کسی میدان کے طور پر بھی پاکستان ہی نے استعمال کیا۔ حرکت ڈیڑھ سنی تھارت کی نشانی ہے۔ مگر اللہ جب ہے کہ تحریک، تعلیم، سیاست اور زندگی کے سارے میدان ایک دائرے میں اکٹھے ہو جائیں۔

میں تھا۔ شہر و نفاہی تجزیوں میں بھی گاندھی پر تنقید کی ہے۔ سرودھم تنقید میں نظیر نہیں رکھتا تھا۔ گاندھی جی کے ہوتے وہ ایک مطلق اعلان سیاست ان سے بین ملتا تھا۔ ایک منظر آدمی ایک موثر محررانہ بین نکلا۔ اس کا جواب جو بھی ہو برسر حال یہ ایک سوال رہا ہے کہ کیا گاندھی کے قتل میں شہر و کسی نہ کسی طرح شریک تھا۔ عمران شہر و خاندان کے کسی نہ کسی شخص کو اس بارے میں جواب دینا پڑے گا۔ دنیا میں عدم تنہد کا چہرہ کرنا سوا ایک ہی چیز تھا۔ گاندھی مسلمانوں کو آہستہ آہستہ ہندوؤں میں مقیم کر دینا چاہتا تھا۔ کئی دوسرے لیڈر اتنا صبر نہ کر سکتے تھے۔ یہ بے مبری اب تک ان کیلئے عذاب سے کم نہیں۔

فلم گاندھی میں شہر کا کردار غیر موثر ہے اور ابوالکلام آزاد کا رول بڑا تک ہے۔ سرور خیل تو سیدھا سیدھا ہندو مثبت کا قاتل تھا۔ قابل توجہ ہیں۔ گاندھی جی کا اصل قاتل میں شخص تھا کہ یہی اشخاص تھے۔ فلم میں ایک آدھ بار انداز گاندھی جی نظر آتی۔ ایک فلم اس کے معاشقوں اور شخصیتوں پر بنائی جائے تو گاندھی سے بھی زیادہ چلے۔ اس فلم میں اس کا رول اس طرح ہے۔ جس طرح ایک آدمی نے دوستوں سے کہا تم نے فلاں فلم دیکھی ہے۔ تو اس میں میرا کام نہیں دیکھا۔ دوست اس کے ساتھ دوبارہ فلم دیکھنے گئے بلکہ وہ انہیں فلم دکھانے لے گیا۔ ایک منظر میں فساد ہوتا ہے۔ تو لوگ جان بچا کر بھاگتے ہیں۔ یہاں وہ آدمی دوستوں کو پکارنے لگا۔ دیکھنا دیکھنا وہ جو سب سے تیز بھاگ رہا ہے۔ وہ گیا۔ وہ وہ نہ ہو میں ہوں

فلم میں کوئی شکہ لیڈر نمایاں انداز میں نظر نہیں آتا۔ شکہ بھی کم ہی دکھائی دیتے۔ جیاناوالہ باغ کے قتل عام میں دھجی ہو ہو کر گرتے ہوئے اور تقسیم ہند کے وقت پنجاب کے قتل عام میں مسلمانوں کو دھجی کر کر گراتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

فلم میں دو منظر تو سنی دیکھے گئے۔ جب ایک مآب پر گاندھی ایک غریب ہندو عورت کو قہر پانٹا دیکھتا ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اپنی چادر پانی میں ڈالتا ہے تو تھیرتی ہوئی سیدھی عورت تک جاتی ہے میں سوچتا رہا کہ آج کے بھارت میں ان کت میں جس غلی ہیں۔ ان کی طرف دیکھنے والا بھی کوئی نہیں۔

ایلاہ اب مسلمان عورتوں کو لٹکا کر تاروں دیکھتا ہندو خندوں کی رو میں بن گئی ہے۔ یہاں دیکھنا کے اصل معانی جان لینے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔

منظر بدلتا ہے۔ گاندھی جی کو بھری کو چارہ نکالتا ہے ہونے لگا گیا ہے۔ بھری آدمی کی شخصیت کی تربیت اور تعمیر کرتی ہے۔ بھری سے گاندھی کی داہلی جیران گن ہے۔ اس کی پیٹیرانہ عمل کی پیروی میں گاندھی کی شخصیت میں بھی اوصاف پیدا ہو گئے۔ قوت برداشت، تحمل اور بردباری۔ انداز گاندھی نے تو شاید یہ ہم چند کا قیام تم ہندو کی بڑی چیز دھڑکھاتا ہے کہ ہو کر حکومت کی اس نے۔

ہم فلم دیکھ کر لگے تو کچھ نہ حال نہ حال سے تھے۔ جیسے ہندوؤں نے آج پھر اپنے سب سے بڑے لیڈر کو مار ڈالا ہو گاندھی کا کل یاد کچھ بھی یہ تھا کوئی معمولی اور معمول کا واقعہ تھا۔ گاندھی کی موت بھی

گھر کی راحت

شعیب رکشے کے ساتھ کلکٹ ڈرائیج سے کرایہ پکائے لگ گیا دس بارہ میل کے فاصلے کے تین روپے زیادہ تھے۔ اس کے خیال میں زیادہ تھے۔ نیار اور شریف رکشے والے نے کوئی بحث نہیں کی۔

"اچھا تو آپ دو روپے دے دیں۔"

شعیب اس طرح ہمارے ساتھ زیادتی کر رہا تھا۔ رستے میں ہمیں دو دفعہ رکشے سے اترنا پڑا۔ اوجھائی پر رکشے والا بیل گاڑی کی طرح رکشہ ٹھیکیتا ہوا لے جاتا وہ ہمیں اترنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ جہاں بھی ہو تاکہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہاں تو لوگ اپنی جگہ پر بیٹھا کر بھی اترنے سے رکتا ہوا لگتا ہے کہ وہ نہیں۔ گھر پہنچ کر ہم نے اسے ہمیں روپے کا نوٹ دیا اس پر ہنستے طاری ہو گیا۔ کہنے لگا۔ اسنے پیسے تو بھی کبھی سارے دن میں نہیں بیٹھے ہوں مشکلوں سے اس نے یہ روپے لے۔

"اتنا سہرا حق نہیں" اسے کیا معلوم کہ اس کا حق کتنا زیادہ ہے۔ اس کا گھر لکھنؤ سے کچھ دور ہے۔ "میں سڑک کے کنارے کہیں رکشے کے اندر ہی سو جاتا ہوں۔ یہ رکشہ بھی میرا نہیں۔ ٹھیکیدار کا ہے۔ اجرت بچھاتا ہوں۔"

ترقی پڑے ملکوں میں ٹھیکیداروں کے وارے نیارے ہیں نیکران بھی ٹھیکیدار ہیں ایک طرح سے پورے پورے ٹھیکے پر چل رہے ہیں۔

رام لعل کے پاس ہمارے دیر گئے تک جانتے رہے ڈرائیج روم میں میٹاؤالی آباد ہو گئی اور لاہور بھی۔ وہاں کوئی ڈیکوریٹن نہیں نہ تھا ہر طرف کتابیں اور رسالے تھے۔ خوبصورت کتاب سے چڑی کیا ڈیکوریٹن ہوئی کتاب کی فیشننی پڑائی بھی کم تھی میں نے ایک گھر میں ایک سی کتاب کے میں نے دیکھے کتابیں اگر رام لعل نے خریدی ہیں تو اس نے یہ ٹیڈا کال کیسے بنالیا ہے۔ بہت کتابیں ہم نے دیکھیں۔ تھوڑی سی انھا بھی ہیں اس دور ان رام لعل وقفے وقفے سے ہمارے ساتھ دوسرے دن نہ جاسکی خد کرنا رہا تھا کہ اس نے کہا کہ عطا کو مجبوری ہے تو کم از کم میں صبر چاؤں عطائے اجازت دے دی کریں نے اجازت مانگی تھی نہ جی اس نے ہمارے لئے دینے کوئی دہی پر بھی پروگرام ملے کر لئے تھے۔ پر سون انھار حسین اور ڈاکٹر نیل جالبی کی دعوت بھی اس کے گھر چکی ایک پورے دن کی تقریبات بھی ان مسلمانوں سے لئے تھیں ہم بھی کیے از مسلمانان خصوصی بن سکتے تھے۔ جس طرح انھار کے صفحہ خواتین پر لکھا ہوا ہے۔

اے مرد بھی پڑھ سکتے ہیں۔

رام لعل نے ہمیں خالے تانبہ کھا۔ نہ کھائے جو خالص مسلمان کھانے بھی تھے۔ وال بڑی کے لئے کسی کو اعتراض نہیں۔ یہ قربانہ کھانا بھی بچھا جاتا ہے۔ اس نے غیر متاثرہ ہے۔ سب کے لئے قابل قبول غریبی نیک وقت ایک ذہنی اور سیکولر حالت ہے۔ صبح ہم ہٹنے کے بعد مسلمان سمیت نکلے یہاں عرفان کے سامنے رکھا اور اکیلے شہر کو چل دئے۔ دو آدمی بھی اکیلے ہو سکتے ہیں۔ شہر ہمارے ساتھ ہے کلف ہو تو کوئی آدمی ہمارے سامنے بن گئے مگر ان کی اکیلے مل کر بھی اکیلے ہوتے ہیں ہم نے دو مختلف جگہوں پر دریائے کوٹلی کو عبور کیا۔ دریائے کنارے کنارے آمارے چل کے مرا آ گیا

کھنڈہ راسا کوئی بچہ ہے دریا
سمندر تک اچھٹا چارہ ہے

شعبہ افتداری کی یادگار

معلوم نہیں جب کو کئی تھی۔ ہم کیے بیٹھے تھے اور آتے تھے میں فرق کا ہمیں کچھ خاص بہت نہ ملا۔ ہم بڑے امام ہاڑو کے بڑے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ کھانہ چار چار جانب سے عمارت میں گھر اہل داخل کی سٹائی کھمبیر تھی بصر کے دلوں کے علاوہ یہاں کا منظر چھٹی کے بعد کسی بڑے سکول کی اداسی جیسا تھا۔ ہندوستان کی دوسری عمارتوں کی طرح یہ عمارت اپنی پہلی میں مگر یہاں بھٹکی کے اثرات نمایاں ہونے لگے جہاں اس کے بغیر قیادت بنتی ہی نہیں۔ ہندوستان میں کسی عمارت اور معاشرت کا سب سے بڑا وصف اس کا پرانا ہونا ہے۔ یہاں جس طرح عمارتوں کی کثرت ہے معاشرے کا بھی شمار نہیں۔ ہر عمارت ہر معاشرت دوسری سے مختلف ہے۔ یہ تعدد و تنوع سے بھی بڑی کچھ ہے۔ ان عمارتوں پر قبضہ کرنا مشکل نہیں۔ ان کی تہذیبی شرافت مٹانا مشکل ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں حکومت کرنا آسان ہے، اسے تبدیل کرنا آسان نہیں ہزاروں برس گزرے کئی حکومتیں آئیں گئیں عمارتیں بھی کھڑی ہیں۔ معاشرے میں بھی قائم ہیں۔ شری ماحول میں بغاوت تبدیل آئی ہے۔ دوسرا تو چھوٹی بستیوں اور کچی آبادیوں میں کچھ بھی نہیں بدلا۔ لکھنؤ کے ایک پرانے مندر کے سامنے ایک ہاتھ پینڈو عورت کو اس کے کشتہ داروں نے اونٹن سے اتار رکھا تھا۔ اس کے سر پر آدھ تامل کی علامت چھڑکی طرح چمک رہی تھی پہلی حیرت یہ تھی کہ آلتہ تامل کو سر پر رکھنے سے کیا ہوگا۔ اور دوسرا یہ کہ مندر سے نکلنے والے اس نے چھاری کی کمر پر پاؤں رکھ کر گزر رہے تھے۔ بیسویں صدی کے آخر میں ہندو عورت کی یہ حالت ایک معاشرت کے غیر مہل ہونے کی دلیل ہے۔ بے چاری عورت پر ایام جنس (ماہواری) سے ہوتی ہے تو اسے اچھوت سمجھا جاتا ہے چھ اچھوت ہیں وہ اسے اور اچھوت سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس انگ کے دے جاتے ہیں قیصری شہر کی اروپاں اس قدر آہستہ بہ آہستہ ہر اس عمر سے ازدواجی ماحول میں طلاق کے عدم تصور کی وجہ سے بچہ اور غلام زندگی دیکھ کر مغرب میں طلاق کی کٹھن کی چیدمیں کو آدمی آسودگیوں کے حرافہ دیکھ لگتا ہے۔ اسلام اس معاملے میں بھی مطلق رویہ اختیار کرتا ہے۔ اعتدال کا بھی بھارت میں زوال کا سامنا ہے کوئی بھی تہذیب جہاں ہندو تہذیب کے برابر آئی ہے۔ ایک معاشرتی چھوڑی تیار ہوئی ہے جو کبھی کسی مزید راہی لگتی ہے۔ لیکن کچھ بھی ہے تاروں کا کلیہ۔ کئی مسلمان دانشور اور لیڈر اگھڑ بھارت کے لئے اپنی تیار سیاست کو زور دے رکھے کی خاطر منصوبہ بناتے رہے ہیں جو منصوبہ سے زیادہ غلط ہے ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کی اردو تہذیب کو ایک بڑی مثال کے طور پر چن کر لیا جاتا ہے لکھنؤ میں شیعہ مسلک کا زور ہے یہ ایران سے مختلف کوئی نقشہ ہے یہ اب آصف الدولہ کے بڑے امام ہاڑو کے

سامنے لاہور کی کربلا گاہے شاہ ایک مغزور عمارت تھی ہے۔ امام ہاڑو شیعہ حکومت کی واحد نشانی ہے۔ جو اپنی دیوانی اور کسی میں لپٹی ہوئی بھی چھوٹا ہے۔ عمارت کی حفاظت اور نگہداشت کا کوئی انتظام نہیں۔ ہر مسلک کے مسلمان حکمرانوں کی یادگاروں سے بھارتی حکومت کا سلوک مساویانہ ہے ان کے نزدیک نہ کوئی شیعہ نہ سنی نہ جہادو۔ کچھ مسلمان دانشور کہتے ہیں کہ ہم تو صرف تہذیبی طور پر مسلمان ہیں۔ کچھ تو صرف علاقائی مسلمان ہیں۔ ذرا ہے کہ یہ بھی کوئی فرق نہ بن جائے۔ علامہ کے مقابلے میں۔ علامہ۔ علامت کے وہی ہوتے ہیں جو کسی کے دل میں آئیں۔ اگر کوئی علاقائی افسانہ کی طرح مسلمان ہے تو اب بھی فکر کی بات ہے۔ بھارت میں بعض شیعہ لیڈر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اب وہ۔ آگیا ہے کہ انہیں مسلم اقلیت کی بجائے شیعہ اقلیت قرار دیا جائے۔ حیرت یہ ہے کہ بھارتی حکومت اس مطالبے سے بے خبر ہے۔ حالانکہ وہاں پینڈو سنیوں میں اسلامیت کے دو شعبے ہوتے ہیں شیعہ یعنی اور سنی یعنی۔

ایک بڑا گھسکا گڑھ کی دور دراز کے علاقے سے ہوا جہاں خبر بہت آخیر سے پہنچی ہے۔ پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ وہ مسلمان ہیں۔ ثبوت کے لئے بتایا۔ تقریر نکالتے ہیں۔ بڑا گھسکا نے فرمایا شہار۔ تقریر نکالتا ہے چھوڑنا۔ ان عمل کو مضبوطی سے پکڑنا آپ کے ساتھ ایک مفتی صاحب نے اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا۔

ان کے لئے اسلام کی ہے۔ میں اس وقت انہیں روکنا نہیں تھا تو وہ اس سے بھی پہلے میرے نزدیک فی الحال ان کا یہ کام ان کے مسلمان ہونے کے لئے باطل کافی ہے۔ انہیں یہ کام کرنے دیں۔ مفتی صاحب آپ اپنا کام پھر بھی کر لیں۔

میں ان بڑا گھسکا سولیفہ تائید کرتا ہوں اور ان تقریر نکالنے والوں کو تیار کرنا ہے آپ سے بہتر مسلمان تصور کرتا ہوں۔ مگر ان کا کیا کیا جائے کہ جو تقریر نکالتے ہیں اور تقریر نکالنے والوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ میں شیعوں کے خلاف ہوں اور نہ سنیوں کے۔ صرف شیعہ سنی فساد کے خلاف ہوں۔ برطانیوں اور دوسری دنیا کی آپس میں مخالفت کے خلاف ہوں بریلی اور دہلی بھی بھارت کے دوسرے ہیں۔ قادیان بھی ایک بستی ہے جو آدمی اپنے لکھنؤ کو بڑے ضرورت سے زیادہ چھڑ کرے۔ وہ ضرور شیعہ ہو گا۔ شہر کے نام سے فرقوں کا زور دینا ہے حقیقت ہے۔ یہ حقیقت بھی اچھپ ہے کہ یہ سب شر بھارت کے جسے میں آئے تھے فرق کے مراکز میں جتنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں سے پریشانی میں مگر تاریخی فطرت کی طرف سے یہ اہتمام کوئی اتفاقیات نہیں ہے پاکستانی مسلمانوں کے لئے انہوں نے ہر ہوا ہوا اشارہ کیا۔ پھر پاکستان میں برطانیوں اور دوسری دنیا کی شیعوں اور قادیانوں کی تعداد میں اضافہ کیوں ہوا ہے اس لیے

کہ یہ بات بڑے بڑے ائمہ عربوں کی کچھ نہیں تھیں اپنی تساری سمجھ میں کیا آئے گی۔ اس کی یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی۔ اس نے ائمہ عربوں کو سمجھوں کہا تھا۔ پرانی عمارات میں کوئی نہ کوئی کمال ایسا ہوتا ہے جو بڑے چارے جہے تعمیر ائمہ عربوں کو واقعی سمجھ میں آتا کہ ان کی تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ پرانی عمارات اتنی مضبوط کیسے ہو سکیں کہ ان میں گراہا جاوے جو بھی زمین میں گرے اور ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں عمارات اتنی کمزور کیوں ہیں کہ گراہا جاوے جو بھی گر پڑتی ہیں آصف الدولہ کو خیر و دل تھا، مزدوروں، معماروں سے حد کر دی بات واقعی سمجھ میں نہیں آتی

بڑے مال کی لمبائی اتنی ہے کہ ایک کونے سے دوسرے کونے والا آدمی مشکل سے نظر آتا ہے وہاں چھوٹا سا ہمارا اگلیہندہ حریف چھوٹا بڑا کرکٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے ماٹس چلائی۔ شظرف نظر آئے تھا وہاں پہلانی چلنے کی آواز ہم نے سن لی اس کے ہاتھ میں کاندھ نہیں آ رہا تھا۔ مگر کاندھ کے نیچے کی آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔ ان دونوں لاڈلے جیکر میں تھا۔ سارا مختلف ساری کارنگری اسی لے کی گئی میوٹیوں نے ایک زمانے میں لاڈلے جیکر کے خلاف فوجی اڑا تھا۔ ان کے انتقال اس میں شیطان بولتا ہے کہ سب سے زیادہ وہی لاڈلے جیکر میں بولتے ہیں۔ جو گھر مسجد کے جیکروں کی زد میں چھو۔ وہ مشکل سے کرائے پر چھتے ہیں۔

ایک ہندو خدا کو دیو کے پار جانا تھا۔ منشی والے نے پارے جانے کا کرایہ آٹھ آنے طلب کیا۔ فقیر کے پاس اتنے پیسے کہاں؟ کشتی دوسری سواریوں کو بکریاں دی فقیر نے سب آٹھ پر چارہ پھیلانی اس پر غم دراز لگے دروازہ کشتی سے پہلے تنچے والے کی کشتی والے کی طرف شان سے دیکھا اور کہا "میں سال میں بیسوا ہے۔"

منشی والے نے کہا

"جناب آپ نے کیا کمال کیا ہیں برس میں آٹھ آنے کا کمال پایا۔"

لاڈلے جیکر کا کمال اب ستارہ در عام ہے مگر اس عمارت میں لاڈلے جیکر کے بغیر دو تنک اور بہت سے لوگوں تک اپنی آواز پہنچانے میں اس طرح کا سارا تھا اس میں حریف کے لئے اس عمارت میں چھاپا ضروری ہے کہ دیوار کے ضرورت ہے۔ ضرورت پر بھی کسی کوئی نہیں جانتی کہ اس عمارت میں چھاپا ضروری کر چیک ضرور ہے اور مگر کوئی کوئی کہتا ہے مگر کے لیے ابھی ہو رہے ہیں۔ مگر جو حریف عام ہو جائے مگر کہ میں رہتی عام ہو جائے پھر کوئی کسی مگر کوئی بھی ہو چاہے ہو رہا ہے۔ کچھ لیکن نہ ہونے کی طرح۔ زندگی روشن، بستی جاری ہے۔ انسان مشین بننا چاہا ہے۔ دنیا کو سویلوں اور سواہیوں کی ضرورت سمجھتی اب سے پہلے نہ تھی۔

کمالات اور بھی ہیں آصف الدولہ نے اس عمارت میں بھول بھلیاں، غواں ہیں۔ ایک مرگ بھی ہوئی ہے۔ جو کئی آدمیوں کی قبروں تک پہنچا ہے۔ یہ بڑا کمزور کی ہے۔ بھول بھلیوں میں گھومتے گھبرا آئے۔

حق کی ایک ہی فرق ہوگا۔ پاکستانی پاکستانی مسلمان مگر ہمارے لئے فتنی مسائل قومی مسائل سے زیادہ اہم ہیں گئے۔ سمجھ لگائے کہ فرق فتنہ سے لگتا ہے۔ رسول اکرم نے جنگ بدر کے دوران یہ دعائیں مانگی تھیں کہ اسے ان آریہ یعنی ہر مسلمان نہ رہے تو فتنہ جعفریہ نافذ حریفی نافذ کرنے والا کوئی نہ ہوگا حضور نے کہا تھا۔

"اسے خدا بھر کر سے نام لینے والا کوئی نہ ہوگا۔"

اب اللہ کا نام لینے والا کتنے زیادہ ہیں مگر ان کا غیور بلکہ میوٹیوں میں نہ کر سکتا تھا کہ بلکہ کمزور ہو گئے ہیں اور آپس میں لڑتے جا رہے ہیں۔ یہ فرق کھتا ہے کہ خدا اور رحل اس کے ساتھ ہیں لیکن کس سنی بھی ہیں کیڑی سنی حیات اللہ انصاری نے ایک بار عقیق انجم سے کہا۔ تم غالب پر کام کر رہے ہو۔ یہ ہے کہ میں خلیفہ قادہ شیعہ۔

ابہ روش یہ بھی چلے کہ لوگ صرف اپنی ملکی پیمان پر اکتفا کر رہے ہیں۔ مصر یا جاپانی چین امریکی روسی بھارتی پاکستانی وغیرہ وغیرہ۔ یہ فرق تہذیب کے ساتھ خیریت بھی ہے لایا گیا ہوگا۔ اسی جنگ کی، ہر طرف میں سب کچھ تباہ ہو گیا تو یہ سرحدیں کہاں ہوگی۔ خطہ ایشیائی کو سبز مرگ بنا دیا گیا تو کیا ہوگا۔ کون کیا ہوگا۔ یا کچھ ہوگا تو بھی اجتماعی موت سے بچنے کے لئے اجتماعی ہجرت کرنی چاہی۔ ہجرت کس طرف۔ یا آرم تو کتنی کم کاوانہ کھا کر زمین پر آیا یا بھر کیا کھائیں کہ میں اور بھجوائے جاؤں جہاں جہاں سائنسی ترقی کی سرشتیں ہیں اور جہاں کے گندے پتے بھی نہ ہوں ایک اور آواز ہو۔ بس آواز ہوا نیام نہ ہو۔ کسی انجام کا رہی نہ ہو۔

ایک انجام ہمارے سامنے تھا۔ ایک عمارت جس پر فتنہ رگھوان ہوتا تھا۔ بھیجی یہ عمارت بن رہی ہوگی تو فتنی رو فتنی ہوتی ہوگی یہاں ہر عزم کے دونوں میں مساں رونق ہوتی ہے۔ رونق تو رگھوانوں نے لگنی تھی۔ ہم تو اس کی نقل بھی نہیں کھینچتے۔ تھکیں انہوں نے انہیں تھکات میں ہم بڑے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب مختلف تھکیں شخص خود بخود ہمارا گائیڈ بن گیا کھانہ چاشنی گوشت و کے اشتہار کی طرح لگ رہا تھا۔ عمارت کا عجیبی پس منظر بیان کرتے ہوئے اس نے قلاب آصف الدولہ کی بہت تعریف کی۔ اس کی تعریف تو یہ عمارت زبان حال سے خود اس سے مستحیاب کر رہی تھی اس نے کہا کہ اس زمانے میں ایک ضرب الملح بن گئی تھی کہ جس کو نہ دے مولا۔ اس کو دے آصف الدولہ اور یہ کہ آصف الدولہ ہر زمانے میں ہوتا ہے۔ بس چھپا ہوا ہوتا ہے "یعنی قلاب نہیں ہوتا" میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ جی ہر علاقے کا پتا ہوتا ہے آصف الدولہ

ہم آصف الدولہ کی تلاش میں بڑے سال میں داخل ہوئے۔ بلاشبہ یہ ایک حیران کن جگہ ہے۔ اتنے لمبے چڑے یعنی وسیع و عریض سال میں کوئی ستون نہیں۔ پھر چست کس طرح کھڑی ہے۔ گائیڈ صاحب نے کچھ وضاحت کی مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اس بات کو کھڑی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا

میلی کچیل چھوٹ سے تانب

ان مڑوں پر بھی کھنٹی فلا کرتے تھے۔ جب کھنٹ کا بر حصہ پاٹا تھا تو اب تھا۔ کچھ کچھ بھی ہے۔ مگر میں کہنے کوں تو جب بھی ٹوٹی آئی تان میں ہی میں آتی۔ کھنٹ کے ہانگے چاندنی رات میں مٹسی لیکر چلنے والے بچہ کے چھٹکے سے جو پاؤں پھلا تو وہاں تک سرسے زکام نے ہر چھوڑا اب تو کونوں میں باجپین کی بارداشت سی۔ حق رہی ہے کیونکہ والا بھی نظر پڑا تو آتی تھی۔ بازار کے کھڑے پر جاندار اہم سے تیار شروع ہوتا ہے۔ اس کے بغل اہل بازار میں بھی امر اوجان اور بھی کچھ دن رہی تھی۔ جیسے کسی ملحق چار خانوں سے کما گیا ہے کہ یہ کچھ آپ گاری ہیں بلکہ کواری ہیں اسے لا کھلی ہے۔ کچھ والے سنے پان میں رہ کر کچھ کہیں یہاں فہرست ہوں۔ آپ ہو آئیے۔

"ہو آئیے" کی ادائیگی میں اتنی بلاغت تھی کہ ہم کھنٹ والوں کے ایک بار اور قائل ہو گئے اور دوسرا اس کا یہ اطمینان کہ جیسے دوسری طرف راستے بند ہیں اور ہم کچھ والے کا کرایہ دینے بغیر جا نہیں سکتے کہیں۔

یہ بانا بازار ہے جہاں غربت کی خرید و فروخت ہوتی ہے بچی کھانوں کے دروازوں پر مخصوص قسم کی میلی ٹیک جھنڈی لٹک رہی تھیں۔ دو ایک بار نظر اٹھی تو جھنڈی سرسراہیں اور ان کی اوٹ سے کچھ چھوٹوں نے جھانک کر دیکھا۔ چلی خوش تو یہ ہوتی کہ وہ بھی تک تانک جھانک کے آداب سے کچھ کچھ واقف تھیں پھر انہوں نے پان کی بیک جھلکی میں سیدھی اپنے نشانے پہنچائی یعنی ہم نے جھلی پھلائی ہوئی تو اس حمایت سے بنا سے عہدہ نہ رہتے۔ کیا یہ تو جھلی اس نسل سے ہیں جن کے پاس روڈ مار اور ٹواب اپنے بیٹوں کو زبان اور تہذیب کی تربیت کے لیے بھیجتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ بھی جھلی عمری عورت سے پوچھا۔

"اب بھی لوگ آپ کے پاس اپنے بیٹے اس مقصد کے لیے بھیجتے ہیں؟"

"ہاں بھیجتے ہیں مگر بچے ذرا بڑے ہوتے ہیں۔"

یہ فتویٰ ہی مدت میرا تھا۔ اس پر اس زبردست عورت نے "ذرا" کی وضاحت کے لئے جو تاڑیا تھا ہرے کے ہرے معنی سے رہا تھا۔ اس نے یقیناً معاذ حق نگہ شفیق الرحمن کا یہ فقرہ دہرایا تھا۔

"بچے اچھے ہوتے ہیں مگر ان میں ایک خرابی ہے کہ وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔"

شاہد شفیق صاحب نے اس عورت سے ملاقات کی ہو سکی اور ملک میں کہیں اور عورت سے مل کر بھی اس عورت سے ملاقات ہو سکتی ہے اس طرح کے فقرہ لکھنے والے سے کوئی بھی حیرت انگیز کام ہو سکتا ہے۔

اوپر نیچے دائیں بائیں جاتی تھیں گلی جیسی سڑکیوں کے پتھر لگا لگا کے بھی کہاں ہوتے جہاں سے چلے ہوتے۔ گائیڈز ہوتے تو ہم ان بھول بھروس میں مارے مارے پھرتے ہوتے کہیں ہیں یہاں تو اب صاحب و اشیا کے ساتھ آنکھ پھولی کھلیا کرتے تھے۔ مزار تو اب صاحب اٹھائے مگر بچوں کی آنکھ پھولی کا جزاوری کچھ ہے۔ ان کے لئے پھینے کی کئی کھلی چھتیں نہیں ہوتیں۔ تلاش کرنا پڑتی ہیں اس عمارت میں داخل ہوتے ہی آدمی کا کس چھتے کی کوڑھونڈ ٹھانے کے لئے جی کر تے ہیں اس سے زیادہ بھول بھلیاں تو عمارت کی تاریخ اور سیاست میں موجود سڑاؤں، شیش اور سرنگیں مشکل ہو گئی ہیں گائیڈز راہ کرم ہمیں کہیں کسی طرح سرنگ میں لے جانا پڑتا تھا۔ جگہ چاہتے تھے کیونکہ سیف و احد عتاب یاد اہد حکلم میں بات کرنا بھی خلاف شان سمجھا جاتا ہے شان تو اب رہی نہیں۔ خلاف سی خلاف رہ گیا ہے جو کچھ وہ گیا ہے۔

اس وسیع و عریض امام باڑا کی چھت زیادہ شاندار تھی۔ یہاں آسانی سے کرکٹ کھیلی جاسکتی ہے۔ تو اب صاحب یہ عمارت نہ بناتے یہ چھت ہی بنادیتے تو تاریخ تیرسوں ان کا کام رہتا۔ کھنٹ کے ٹواب تھے کچھ بھی کر کر سکتے تھے۔ ہمارے ہاں کھنٹ کے صحا جڑیں۔ جن کے پودے بچے کے باغ ہوا کرتے تھے چھت پر کھنٹ والوں کو مبالغہ اور کھلف کے بغیر وہی ہضم نہیں ہوتی۔ انہیں دیکھ کر لکنا ہے کہ وہی کھانے کا کھلف البتہ وہ ذرا کہی کرتے ہیں۔ دبستان کھنٹ کی شاعری خاص طور سے مرثیے کی شاعری میں مبالغہ اور زبان کا پختہ کارہ نکال دیا جائے تو کیا رہ جائیگا۔ مجھے تو یہ ایم باڑا بھی ایک مبالغہ انگیز عمارت لگی۔ ایسی جگہوں پر شاعروں اور مجلسوں میں خانوادہ حضرت حسین پر مظالم مصائب کی جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں فکاہوں نے ان نشتے کھینچے ہیں جیسے واقعہ کرنا کا آکھوں دیکھا حال ستارے ہوں میدان کرنا

سے روا راست۔

اب کچھ عرصے سے ہاں لگ رہا ہے مجھے ہماری شیعہ کمیونٹی مسلمانوں کی اقلیت کا مبالغہ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اور یہ مسلمانوں کا ایک اور ناکہ موز ہے۔ جس کے آگے رات و شہر گزارا ہے۔ روت اختلافی گروپ (فرقہ) تو بڑے نظریاتی گروہوں (ڈھاب) میں بنتے رہتے ہیں۔ ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتے ہی کہیں کہیں کچھ نہ ماننے کچھ اور طرح سے ماننے کی فضائیں کھلنے لگتی ہیں۔ عقیدوں کے ہم شکل اور عقیدے بخم لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اب تو شیعوں میں بھی فرقے بنتے چلے

آہ۔

"ذہب کی اہمیت کیا ہے آپ کے نزدیک؟"

"اہمیت ہے بہت مگر دوسرے مذہب والے کو سمجھاؤ کہ تو روزِ فی نہ سمجھا جائے۔ مذہب نہیں سمجھا، آپس میں بڑھ گنا۔"

"یہ تو حکمت کا قوی گیت بن گیا ہے؟"

"اور سب سے زیادہ وہ مذہب کی بنیاد پر اس ملک میں ہے"

"تم دانشور ہو یا؟"

"میں کیا کہنے والے دانشور ہوتا ہوں بات نہیں ایت دانشور کو بلا ہوتا ہے"

"تو میں کہیں کوئی باطلہ تو مجھے اپنے دل میں ڈال کر لیتا تو خداوند پہنچا ہو گا پہنچ جائے گا۔"

"یہ کہہ کر اس نے میرے لئے انجی سینٹ خالی کر دی اور خود میرے برقعہ پر جا کر سو گیا۔ میں بیدار ہوا اور باتیں ہوتی رہیں کس کے ساتھ تھے؟ میں کس کے ساتھ کس کس کے ساتھ۔ اور صبح ہو گئی۔ وہ باتیں کہنے کی ابھی مجھے اجازت نہیں مجھے ایک اور صبح کا انتظار ہے۔"

رہل کے ذہن میں لپٹل شروع ہو گئی تھی۔ کسی کم آباد جگہ پر گاڑی کی کڑی تھی۔ میں بیٹھ قائم رہا۔ آج میں نے شیش کے ساتھ بریک بے ارادہ سی نظر ڈالی۔ معلوم نہیں کونسا شیش تھا جس شیش پر آدمی کو اترتا ہو۔ اس کے علاوہ سارے شیش ایک جیسے لگتے ہیں۔ دیرانی شیش چھوٹے ہوتے ہیں مگر ان کے آس پاس دو متین انیس۔ دو کوڑ بناتو جاتی ہیں۔ ان شیشوں کے باہر نکل کر بخار لینے کوئی چلتا ہے۔ بڑے شیشوں کے باہر ٹیکسوں رکھنا آتے والوں وغیرہ۔ اور ڈرائیروں کے شور وغل کی کیسا نیت کے سوا کچھ نہیں ہوتا تو مجھے ان شیشوں سے لکل کر وہاں رستہ ہوتا ہے۔ پھر بھی منظر ہل کے شروع سے آگے بڑھ جاتی ہے لیکن اوقات ایسے شیش پر اترنے والا مسافر اکیلا ہوتا ہے۔ اکاٹھ کی اپنی ایک بادشاہت ہے۔ میں یہ بادشاہت دیکھنے کے لئے دروازے کی سلاخوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ سوچ رہی تھی کہ جیسے تھا۔ اس کی زنجیر شعلوں کی دھندل درختوں کی سب سے اونچی چٹانیں تھیں۔ شیشیں بادشاہ کے لمس سے تھیں تو گنگر و شیشاں بلی رہی ہیں۔ اسے میں میرے قریب سے ہو کر بلائی ایک بے ترتیب آہستگی سے چل ہوا اکاٹھ کا حصہ۔ یہ کیا منظر عمل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے جانے دیا۔ پھر میں نے سچا وہ مجھے نہ دیکھ یا باہر کا تو مجھے قاسے ضرور ملنا چاہئے تھا یہ شاید پھر بھی یوں نہ مل پائیں۔ اب اسے زور سے پکارنا پڑا اور یہ مجھے اچھا نہیں لگہ پڑیال میرے دل میں تھا کہ وہ مرا اور میرے پاس آکر کھٹے لگا۔

"یہ مجھے اچھا نہیں لگتا مگر دل وہ مقام ہے جہاں شیشاں بھی گونجنے لگتا ہے"

میرے دل میں کوئی ایک لمحہ کو غمیر کر نغمے لگنے لگا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھا تو مجھے اچھے سنسن اور سکوت محسوس ہوا۔

"جینے تم سے جو ابھی میری ملاقات ہوئی تھی اس کے لئے تم نے کوئی ارادہ کیا تھا ملاقات دہلن

"فطرت کیا ہے۔ اور کہاں تم دین اور فطرت کو کاٹ کاٹ کر الگ الگ کر لیتے ہو۔ بچہ نظریات اور خیالات کی بنیاد پر فیصلے نہیں بناتا۔ وہ کسی کو سارے لگتا ہے۔ اور تم۔ تم نے فطرت صرف بچہ نہیں کرتا۔ وہ سکھ کے گھر میں پیدا ہو۔ مسلمان کے گھر میں کھڑا ہو۔ ہندوؤں کے گھسے میں ہو۔ کبھی ہو۔ وہ تم سے جو کچھ بھی تم ہو کبھی یہ سوال نہیں کرے گا۔ تم کون ہو اور کہاں کیوں ہو۔ بچے کا دھرم دھپ کی طرح پچا ہوتا ہے۔"

"بابائی۔ ایسی باتیں کا نام سکول رازم رکھا ہوا ہے جسے سائنس نے اور وہ صرف باتیں ہی بناتے ہیں۔"

"انہوں نے فطرت کو فراسٹ کا چھ لاپہ پتایا۔ فراسٹ کو قلعہ بنادیا اور قلعے کو فراسٹ میں تبدیل کر دیا کچھ فرق نہیں ان سائنس اور سائنس دانوں میں۔"

"یہ دانشور آجکل لوک دانش کے کام پر اوٹلا چکے ہوئے ہیں۔ دانش اور لوک دانش میں کیا فرق ہے؟ میں نے پوچھا"

"بعض اوقات تو دانش اور حکمت میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حکمت زیادہ بڑی دانش ہوتی ہے کبھی کبھی تپتے لکھنوں میں ان پڑھوں کی ساری صفات ہوتی چاہیں۔"

بھارت میں پلاسٹک اور زوروں پر چل رہا وہ دیکھنا ہے ان کو۔"

"اب فسادات کا حراج تقسیم ہند کے وقت والا نہیں اور دکن سے بڑھتے ہیں فسادات۔ سیاہی اور معاشی مفادات کی کشش میں بھی مقابلہ دوستانہ بھیج دیا ہوتا چاہئے۔ پارہیت تو اس میں بھی ہوتی ہے۔ بھارت کو بچانے کے لئے اسے کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کر دیا ہو گا۔ یہ کام خوش خوشی ہو تو ہو بلکہ بھارت ہو گا۔ ورنہ یہ ملک تو نہیں کے اور دشمن ملک بنتے چلے جائیں گے۔ بلکہ دیش کا نام مشرقی پاکستان بھی ہو سکتا تھا۔"

اس طرح وہ پاکستان ہو تو سب مغربی دنیا والے اپنے ملک کا بچانے کا نام رکھیں گے۔

"ذہب کی بنیاد پر بھارتی سیاست دان کسی ملک کے وجود کو نہیں مانتے"

"سیاست دان متعصب ہوتا ہے بھارتی سیاست دان بھی۔ متعصب آدمی دوسروں کا نقصان سوچتے سوچتے اپنا نقصان کر بیٹھا ہے بھارتی لیڈر نہیں جانتے کہ ذہب کے نام پر بننے والی ریاست میں سب سے کمزور ذہب ہوتا ہے۔ پاکستان میں ذہب ایک نغمہ بن گیا ہے۔ بھارت کے مسلمان پہلے مسلمان ہیں پھر بھارتی۔ پاکستان میں صور حال اس کے برعکس ہے۔ بھارت میں اکثر مسلمان اب بھی نظریہ پاکستان کے حق میں ہیں پاکستان میں کئی مسلمان اس کے مخالف ہیں۔ کم ہیں تو بھی زیادہ محسوس ہوتے ہیں وہاں پاکستان کی مخالفت کرنے والے زیادہ محسوس ہیں اور ممتاز ہیں۔ بھارت میں علیحدگی کا رجحان آج بھی ذہب کے حوالے سے ہے۔ پاکستان میں یہ رجحان اس کے علاوہ کچھ ہے ایک راز کی بات بتاؤں آپ کو اب ہندو ہندوؤں سے الگ ہوں گے۔"

کمپیان پر جھنڈا

ہم امر کے قریب پہنچ رہے تھے میں نے ایک ارواے کے ساتھ گاڑی کباب روکھا۔ ورنہ آدمی بڑھکتا رہتا۔ تب دیکھے اور نہ دیکھنے میں اس فرق نہیں ہوتا۔ اب جو دیکھا تو ہر ستری فصلوں کا رقص خوش میں تھا۔ ہر شے اپنے آپ میں بھر جاتی ہے تو اپنے گتے ہے۔ جوانی اور شادمانی کو کے ایک ایک قطرے کے ساتھ حکمگردانہ دیتی ہے۔ ایسے میں کسی کو اپنے نہ دیا جائے تو وہ گھٹ کر رہ جاتا ہے یا سارے جہان کو سختی کا ناچ چائے پر تل جاتا ہے۔ رقص سے منع کرنے والے ہر چے فطری اور تخلیقی کام سے منع کرنے والے صرف ہمارے ہاں ہیں ذہر کہیں ہیں۔ ہر کہیں کسی نہ کسی بات سے خواہ مخواہ منع کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ کتے چن رقص حرام ہے۔ مرد رقص کرے تو اُمس اخلاقی نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے بھابھ (پاکستان) میں عورتوں کو شادی بیاہ اور فصلوں کی کٹائی کے موقع پر پائے دیکھا ہے۔ اس ناچ میں شریک ہوا ہوں۔ اس وقت کی عورتیں کتنی ہیں کہ سب اچھلتا پھرتا تھا۔ مجھے خبر نہیں۔ تانے والے کو خبر ہو کہ وہ کیسا ناچ رہا ہے تو وہ پھر کیا خاک نہ پے گا۔ یہ ایک بے سائنس عمل ہے۔ باقاعدہ دیکھنے کے بعد بھی میں نے پشیمانی اور پائے والوں کو بھی دیکھا ہے جب وہ رنگ میں آکر ہاتھیں دوپٹے والوں کی آنکھیں بھی ناچ اٹھتی ہیں۔ تاننا تہا تو زنگی میں کتنے ہی جذبے کے اظہار رہ جاتے۔ میں نے جب بھی کچھ اظہار نہیں کرتا چاہا تو اپنے لگ گیا ہمارا پلا زائد کتنا ہی داس ہمارا عورتیں اٹھنے پائے تھے۔ اور تلف ہونے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ کیا پھانسا تھا؟ ابھی گندم تو کستی لائی جاتی ہے۔ دخول کی تھا پرتب ہر شادی میں ہمارے رقص ہو کہ سن ایک صف بنا کر گندم کا شستہ تھے۔ تو اُمس جو حرا آنا تھا۔ اس کا کیا بیان۔ دیکھنے والوں کو بھی تلف آجائے۔ یہ مزا محض کو کھا جاتا ہے۔ دن تھے کہ کسان سارا مارا دن فصل کاٹتے تھے۔ ساری ساری رات پاتے تھے۔ اور میں تھکتے تھے۔ کتے ہیں جب سب سے لوگ عورتیں مرد مل کر فصل کاٹتے ہیں اور پاتے ہیں تو فصل بڑھ جاتی ہے۔ تھانے کیوں تھانے اب ایسی باتوں کو کہنے سے انکار کر رہا ہے۔ اور ہر کتہ ہوتی قمار جاری ہے۔ گندم کے دانے میں اب وہ طاقت بھی نہیں رہی۔ وہ دانہ کہاں سے کہنے کا نہیں اور جس کی سڑا لیک اور زنگی ہو۔ اور طرح کی زنگی اب تو گندم کھاتے کا لطف بھی گریبا۔ غبار چڑھتا ہے اور ہم سوکتے ہیں نیند میں خراب بھی ہو گئی ہیں پڑھتے ہوئے بیگانہ سنی بھر گیا ہے۔ گنتی کو لگا ہوا نہ ہے کسی نہ کسی طرح۔

اور ممکن کے درمیان ایک پردہ ہے۔ جس سے ایک بار طاقت ہو جائے طاقت۔ اس سے ایک بار اور طاقت ضرور ہوتی ہے۔ یہ ضروری بھی ہوتی ہے طاقت ہرنے والے کے ساتھ نہیں ہوتی اور طاقت کے کئی قرینے اور اعزاز ہیں۔ اس کی بدست ہی شکستیں ہیں یہ ایک اتفاق ہے کوئی کارروائی نہیں۔ ایک ذوق ہے۔ واقعے سے پسے واقعہ ہوتا رہتا ہے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح۔ زندگی میں طاقت ہو جاتی ہے۔ زندگی کے بعد بھی ہو جاتی ہے مگر جو یہاں زندہ نہیں وہ آئندہ بھی زندہ نہ ہو گا۔

میں نے اس حیران کر دینے والے آدمی سے پھر سوال کر دیا۔

”خدا سے ملنے کا کیا طریقہ ہے۔“

”جس طرح کسی محبوب سے اتفاقا ملاقات ہوتی ہے۔ خدا سے خود بخود ملاقات ہوتی ہے۔ ایسے تمام کاموں میں محنت اور طلب کا بھی دخل ہے کہ انہیں۔ محنت اور خواہش آدمی جس شے کیلئے کرتا ہے بعض اوقات اس سے خلف اور افضل چیز مل جاتی ہے۔ بعض اوقات کچھ بھی نہیں ملتا۔ ہر عمل کا اجر عمل کے دوران ایک کیفیت کی صورت میں ہوتا ہے۔ مسلسل تلی کر کے کرتے کچھ ہاتھ نہ آئے تو بھی دل خالی نہیں رہتا کچھ بھی نہ ہو تو یہ خوف ختمی میں سے چھٹا کا بے سائنس اور طلب کر لینا چاہئے۔ انعام اور اجر جن میں ہوتا کسی کا۔ دنیا میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ حق تھے خداؤں کو ملتا ہے عاری عمر مقرر اور میرے ہر دست پر پڑتے چلتے منزل پر پہنچا نا صعب نہ ہو تو سفر کو منزل مانا چاہئے۔ پھر بھولے ہوئے رستوں پر نکل چلے ہیں بھی کیا بیان ہے۔ اس طرح بھی قصور سے فاصلے پر منزل ہوتی ہے۔ لیکن منزل پر پہنچ کر تم کیا کرو گے۔“

وہ چپ ہو گیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہیں اور دیکھنے لگا

”اس میرا سلام کرنا۔“

اور میں اس سے پوچھ نہ سکا۔

”کس کو“

وہ میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چل دیا۔ اس کے ہاتھ کی کٹیریں میرے ہاتھ پر پھسل ہو گئی تھیں وہ ہندو تھا مسلمان تھا یا کچھ اور۔ میں نے اس سے پوچھا پتا چاہیے کا نیاں ہی نہ آیا ہندوستان میں کچھ لوگ تھے جنہیں مسلمانوں سے ہندؤں نے لپٹا کھینچ کر لوگوں سے پتے ہیں انہیں تھکے ویاگر سب کو اچھے لگے اس کی سے چاہا آکھوں کی لمبی لمبی ٹکوں میں وہ روشنی قہمی ہوا بھی میں نے درختوں کی سب سے اونچی شاخوں میں دیکھی تھی۔ اس کے دل میں بھی سورج طلوع ہوتا ہو گا۔ رعب بھی ہو تا ہو گا۔ وہ جاگتا اور پھٹتا چلا آیا گیا۔ میرا سے دیکھتا ہوا دیکھتا ہوا میرے نہ دیکھتے ہوئے نظر خوں سے بھر گیا تھا نہ بھارت میں ہوں۔ انہیں وہ مقام مال سب افریقہ امریکہ یا پاکستان میں ہوں نہ کچھ کے معنی میں کھڑے ہو کر دیکھنے چاہیں مندر کے دور واز سے پر یا کلیسا کے مال کے اندر سے نظر پڑیں۔ یہ بیوقوف اور مغرور نہیں ہوتے کسی سے پر وہ نہیں کرتے۔ اور انہیں ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے۔

منگی عورت اور سانجھی قبر

ہمارے سوڑ سا نکلیں گی پرانے علاقے کے

آج کل میں کم ہو رہے تھے یہ سارے سلسلے دیکھ بھالے تھے۔ کچھ تو ہم اپنے وطن کے بھی قریب تر تھے۔ فقائیں رقی ہوئی جاتی تھیں۔

منگی عورتیں ہی یادیں جھکا کر اڑائے لئے پکڑتی تھیں وہ اس گھر میں ہونے کی خواہش سے بھر اہوا تھا۔

جہاں اس نے پہلا سانس لیا تھا۔ ہم پہلے اس مسجد میں گئے جو اس کے دادا نے بنوائی تھی۔ اب وہاں ان

کی قبر ہے۔ مناسب سکون نے مسجد کو گردوارہ بنا لیا ہے۔ یہ بھی ان کی مرئی ہے۔ ورنہ انہوں نے شاہی مسجد

لاہور کو اپنے زمانے میں مصلیٰ بنا لیا تھا۔ گردوارہ میں خدا کی عبادت ہوتی ہے۔ خدا کی کاہنی بڑا سب کا

ہوتا ہے۔ سکون اور مسلمانوں کا معاملہ اس معاملے میں مسئلہ نہیں۔ گردوارہ کے بارے میں اب تک

مسلمانوں کو یقین ہے کہ وہ ان کا آدمی ہے۔ مسلمان انہیں مرنے کے بعد اپنے انداز میں خدا کے پاس

بھیجنا چاہتے تھے۔ وہ واقعی بڑا آدمی ہو گا۔ جسے مختلف مذہبوں والے اپنا آدمی سمجھیں۔ ایک کشمیری خاتون

یہ عارف کے بارے میں بھی یہی معاملہ ہے۔ کشمیری اس عقیم بیٹی کے بارے میں ایک بڑے مورخ شاعر و

ادیب اور صحافی محمد الدین فقیہ نے پوری کتاب لکھی ہے۔ یہ مذہبوں کے گھریلو ہوئی۔ پندوں کے گھر

جانی گئی اور خواتین کے ہاں مسلمان ہوئی۔ سوال والوں کے پاس بے حساب جہر پر اس نے صبر کیا۔

صبر اجری منکب بن کر اس کے انہیں مکمل کیا اور اس کے ہاں میں ایک فخر طلع ہوئی۔ کمال یہ ہے کہ

بندہ اور مسلمان دونوں اس روشنی کو مانتے ہیں۔ اور ان کرتے ہیں۔ ورنہ اب رواج صرف ان کے

کرتے کا ہے۔ مجھے اس خاتون کے بندہ یا مسلمان ہونے میں بحث نہیں کرنی۔ وہ ایک صاحبہ عرفان و

حقیقت تھی۔ اس کا بیٹا یہ ہے کہ آٹھی کے بعد وہ بالکل منگی رہی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے

سز چھلک کھا ہوا تھا۔ کسی نے اپنا سز چھلک کھا ہوا تو بانی صرف میں فیصد پچتا ہے لوگ مجھ پر میں فیصد کو

بھی غیبت کہتے ہیں۔ کچھ سز کے ایک فیصد کو اس ساری پر فوقیت دیتے ہیں بڑا بڑا خوب بات کی ہے کہ

عورت مرد کا ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ لوگ اس کا مطلب جان لیں تو ان جھگڑوں میں کیوں پڑیں۔ اب

وہ ہر طرح کے لباس کے معاملے میں تنے فیض میں جتا ہیں اور اس "لباس" کا حال بھی شلوار قمیض

اور پینٹ کوٹ کی طرح کر دیا گیا ہے

یہ عارف کہتی تھی۔

"میں کس سے کیا چھاپوں۔ میں مجھے کوئی مرد ہی نظر نہیں آتا"

مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ بتایا نہیں گیا۔ ضرورت نہ تھی اس کی۔ اس کی آرزو رنگ مہمانداری

میں دلآویز آوازوں جیسی پیوار کا شعر بنتا تھا۔ اپنے نظروں کے سامنے اپنا نام بھی بھول جاتا ہے۔ وہ

فصل جس کے ساتھ ملاقات میں آپ اپنے ہونے کا مکمل لطف محسوس کریں بہت حسین نہ بھی ہو تو

بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تب حسن کسی اور ہی شے کا نام ہوتا ہے۔ اور نام ہی تو بھول جاتا ہے۔ کسی گہری

یاد کی بات میں وہی ہنستا ہے جس کا مکمل بھول جائے۔ میں اب یاد آ رہا ہے کہ اس کا چنی دل باغ رائے

بھی سوئے ہو جان ہے۔

کمال گمارہے نے ہر طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ چھو بھلائی ہے۔ اس کی بیوی بھی اس

کی طرح ایک سڑکا طرز عمل اختیار کئے ہوئے تھی۔ ابھی تھی۔ سادوے یادوں کی طرح جو رہنے سے پہلے

نگواریں میں رہ کر بھر جاتے ہیں، بڑا جیس تو عمل قتل کر دیتے ہیں۔ ان میں جھلیاں بھی چھپی ہوتی ہیں۔

باہر کرنے والی لڑکی تیار کرنے کی ناقابل یقین المیت سے بھی لیس ہوتی ہے۔ رائے پر اور ان کی نامانی ایک

با اختیار شخصیت کی مالک ہے۔ مادر زائد رعب و اب والی پیچیدگی اس کے پاس تھی۔ میں سنا ہے نامانی

گما، تو ایک شکر گزار مسکراہٹ کی شان تھی اس کے چہرے پر قائم ہو گئی۔ حسد ہی اس کے بچوں کے ہا

جی اللہ لوک آدمی ہے۔ وہ ایسا ہی بندہ ہے جیسا کہ مسلمان ہوتا ہے۔ ایمان باغیب میں آدمی آتا

ہی لگا دھور نہ ہو۔ ان کے جھگولان سے مجھے عقیدت ہوئی۔

بندہ ورتل میں ابھی چلی پونٹ سلامت ہے۔ ابھی رشتوں کی نزاکت اور نزہتی میں اتار خند نہیں

پڑا۔ ہم نے یہاں بڑا بڑا دن کی زندگی میں سالم زندگی کا وقت چھٹا

کیا دن تھے کمال اس کی ستانی تھی شب و روز

خوشی کی طرح گھر میں بھر جائے گی خواہش

میں کسی گھر جان تو یہ خوشیوں پر تار تاروں خوشیوں پر وہ خود تلاش کر لیتی ہے مجھے۔

مجھے لوگو! ابھی لڑکی! گھر تسماری خوشیوں سے بھی خالی نہ ہوں۔

جب شاہ بہان کشمیر پہنچا تو وہ بے قرار ہوئی۔

"مراد آگیا۔ مجھے چھاپو۔ مجھے ڈھان دو"

کشمیر اور بناوٹ ملی تو پہلے بے قرار ہو کر میں گئی۔ یہ بھی روایت موجود ہے کہ آگیا ایک باہر گزار بن گئی میں اس سے آگے نہ بڑھ سکوں گا۔ کہ یہاں آگ اگلنے والے بنت ہیں۔ اور میں آگ کو گزار بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ میرے دل میں کئی آتش فشاں آتش کدے بن چکے ہیں۔ یہ بت اپنی جگہ کہ یاد لوگ آتش کدہ کو ابھی تک بت کدہ ہی سمجھتے ہیں۔

ان پڑھ یعنی امی اللہ عرفہ کے منہ سے جو بات نکلی اقبال کے دوسے میں چلی جاتی۔ اسے کشمیری لہواک کا نام دیتے ہیں۔ یہ باتیں کشمیری اردو انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ اللہ کا قول ہے۔

"بے شک پڑھنا آسان ہے۔ اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔ جس طرح چٹائی اور اصلیت کی تلاش دشوار ہوتی ہے۔ جب میں شاعر ہوں گئی تو مجھے بھی خوشی ملی۔"

"میں نے اپنے نفس کو مارا جس سے میرے اندر کا رخ روشن ہو گیا۔ اندر کی چمک باہر اُٹھ آئی۔ اور اندر جہرے میں اسے میں نے پکڑ لیا" اب میں ہر کشمیری لڑکی میں لہو کو ڈھونڈتا ہوں جسے دل کے سیر کشمیر جنتِ خیر کا حلقہ آئے۔ اور آدمی جنتِ خیر کی کدھر محسوس کرے۔

کشمیری نسل اور جنت کے باشندے قادی صاحب کی کھلے احاطے میں قبر پر حراج بھی تھا۔ روٹی کے تکرارے پڑے تھے۔ پانی تھا۔ اوپر بھیرے پر پڑیاں بیٹھی ہیں دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ یہ سارا انتظام فوری طور پر نہ ہو سکتا تھا ہم کسی کو بتا کر تو نہ چلے تھے۔ پھر ہم کوئی صدر دور (مارشیل والا) اور وزیر خزانہ (وزیر اعظم) تو تھے نہیں۔ کہ ہمارے لئے کوئی تکلیف یا تکلیف کی جاتی۔ اور ایسی بھی نہ تھی کہ کوئی ہمارے لئے بیٹھے سروں میں ادا پٹائی لایا

سزاؤں کی آماجگاہ

محراب والے کمرے سے ایک مولوی صاحب معاف کیجئے سرور صاحب لکھے اس نے دلی ہی حیدر پوری میں ہندو دیکھی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ اس مولوی صاحب کا۔ تھان جس نے یہ مسجد بنائی تھی۔ عطا نے انہیں بتایا کہ میں ان کا پوتا ہوں۔ وہ سمجھ بزرگ آدمی تھا لیکن اس نے عطیہ مست کلمہ کی۔ یہ سرور صاحب کی اعلیٰ قربانی ہے۔ کچھ کمال تو صاحبِ قبر کا ہو گا۔ ان کی قبر سلامت ہے تو سیر انشیاں ہے مسجد بھی سلامت ہے۔ قبریں دراصل معبود کی نشانیاں ہیں یہاں غمازی کوئی نہیں تو کیا ہوا۔ کہتے ہیں مسجد میں غمازی نہ ہو تو فرشتے آکر نماز پڑھتے ہیں۔ عبارت میں یہ کام اکثر معبود پر فرشتے ہی کرتے ہیں۔ ایک ہستی میں ایک مولوی صاحب کا سنا ہے اپنی مسجد میں انہوں وقت اذان دیتے سمجھ پڑھتے اندر نماز کی امامت کراتے۔ اور ان کی اقتدا میں غمازی ایک نہ ہوتا تھا۔ ساری عوامی عمل یہاں میں گزار دی۔ انہیں کبھی باطلت خورہ یا بچیدہ خاطر نہ دیکھا گیا۔ اس احتیاط کو کیا نام دیا جاسکتا

ہے۔ میں ایک ایسے لیڈر کو بھی جانتا ہوں جو برسوں سے ایک علاقے میں انقلاب کی تبلیغ کر رہا ہے انقلاب سے ان کی مراد سوشلزم ہے اب سوشلزم کئی قسموں کے ہیں مسلمانوں کے فرقوں کی طرح۔ کوئی اس لیڈر کا بھی ساتھی نہ بنا۔ اور وہ بھی کبھی مایوس نہیں پایا گیا۔ یہ بھی استقامت کی بات ہے۔ وہ مولوی اور انقلابی ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے ایک دوسرے پر معترض بھی نہ تھے اس حوالے سے اب لوگ ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں تو ان کا عمل بدتر نکلتا ہے۔ جو کام لوگوں میں کشادگی پیدا نہیں کرتا۔ تو یہ مان لینا چاہئے کہ کوئی غلطی نہیں ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود مولویوں اور لیڈروں کو عارفی فساد سے بچنا چاہئے ہیں۔ پھر بھی وہ اور ہم اس پر سچے میں مل ہو گئے ہیں۔

میں یہ بھول گیا کہ یہ کس کی قبر ہے۔ قبریں سماجی ہوتی ہیں صاحبِ قلب اور صاحبِ قبر ہر کسی کے ہوتے ہیں میں نے آخر پر چمکی اور مستحالی۔ منت کسی بھی قبر پر مانی جاسکتی ہے۔ عطا کو معلوم بھی نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے نہ بتایا کہ میں نے کیا منت مانی ہے کہ میں منت بتائی نہ جائے تو وہ ضرور پوری ہوتی ہے کہنے والوں نے کہا ہے جو یہ سب مان لیتے ہیں لپٹ لوگ وہی ہیں

ہی ہوتے ہیں۔ انگریزوں کو اسی ظالمانہ کارروائی کا بد نقصان پہنچا اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا سر شرم سے جھک گیا۔ آج اس سے بڑا واقعہ بھی ہو تا ہے تو ظالموں کا سر فخر سے اونچا ہوا چا تا ہے۔ جنوں ہوں زندگی آگے بڑھ رہی ہے اور پہلے لوگوں کو قہقہہ سب سے عاری ثابت کیا جائے گا کہ اس طرح کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ ظلم کرنے کے کیا کیا انداز نکل آتے ہیں۔ ظالموں کے فخر کا سامان زیادہ ہو رہا ہے۔ پہلے لوگوں کو تو سلیقے سے ظلم کرنا بھی نہ آتا تھا۔ اب سائنٹفک طریقے ہیں۔ سیاسی دواؤں ہیں۔ خاص سوشلسٹ ہیں۔ تباہ کن اسلحہ استعمال ہو کر رہا ہے۔ کوئی کسانے پیچھے کے بار وجود نہ لے کر کیا لڑائی کی پرتشدد ہی نہ کی جائے۔ ایک ہستی میں ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے فوجی قیادت کر دیئے گئے۔ کچھ دنوں تک ڈاکو سامنے نہ آئے تو فوجیوں نے شریف شہروں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ پوچھا گیا کہ یہ کیا انداز ہے۔ جواب ملا کہ اب ڈاکو سامنے نہ آئیں تو ہم کیا کریں۔ ہم نے کوئی چلانا ہے۔ اپنی ہتھکڑیوں کو بنگہ نہیں لگوانا۔ ہمارے گئے ہیں آپ امیں ڈاکو بچھ لیں۔

اہو کے پھول

ہم جلیانوالہ باغ میں اسی دروازے سے داخل ہو رہے تھے جہاں سے جرنل (ڈائزر) اپنے فوجیوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ اور کوئی رستہ ہی نہیں۔ میرے دل میں جذبات کا لنگر تھا۔ یہاں داخل ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی لنگر ساتھ ہونا ضروری ہے شاید۔ اب تک ایک لڑکھنگی یہاں موجود ہے۔ جن باتوں میں پہلے ہوں وہاں پھول سلامت نہیں رہتے۔ یہ باغ باغ کم اور جلسہ گاہ زیادہ لگ رہا تھا۔ یہاں تو خواہ مخواہ قہقہہ کرنے کو ہی چاہتا ہے۔ کس کس نے یہاں تقریریں کی ہوں گی۔ مگر وہ تقریریں جس کے دوران گورا فوج نے گولیوں کی برسات کر دی اور پھر افراتفری۔ فلم گاندھی میں بھی یہ منظر ال دہلا دینے والا تھا۔ وہ ساری جگہیں اب نگاہوں میں پھر رہی تھیں جہاں آزادی کے مطالبے گولیاں کھانکے گئے تھے۔ اس باغ کی چار دیواری باغیوں والی نہیں۔ قلعوں والی ہے۔ اس دروازے کے علاوہ جس سے جرنل ڈائزر اور پھر ہم داخل ہوئے تھے کوئی اور کسی طرح باہر بھی جاسکتا تھا۔ نہیں جاسکتا۔ ایک آدھ دروازہ ہے۔ مگر گنگا ہے کہ اسے بند رکھتے کے لئے بنایا گیا ہے۔ کچھ دیواروں پر اب تک گولیوں کے نشان محفوظ ہیں۔ جو گولیاں ہمسویں کو چوم نہ سکتی تھیں۔ دیواروں سے لپٹ کر نہیں۔ جانا زلو! حاکم آج بھی اس پر لفظ تمام پر ہنسی ہوئی ہے۔ بھارت میں ملک ہندوستان میں ملک دنیا میں کوئی باغ نکالا۔ ہار نہ ہوا ہو کیا یہاں لوگ پھول منگتے تھے۔ لیفٹ باغ روپوشی اور گول باغ ڈاکوؤں میں کچھ کچھ یہ ہو چکا ہے۔ مجھے لگتی ہے اس آسام میں کڑا ہوں۔ حیرت میں، کاش میں سری کرشن۔ دہلی میں 'اترنا میں ہندو اسیں ڈھاکہ میں' انداز کے مختلف لکھوں کے درمیان کڑا ہوں۔ اور میں ابھر پنجاب کے اتر سر میں کڑا ہوں۔ یہاں آج سکھوں اور ہندو حکمرانوں کی کشیدگی اس لوملوانے کو پھر بار بار ہے اور وہ لوم آہستہ آہستہ قریب تر ہوتا اور ادھر ادھر چھٹا چلا جا رہا ہے۔ تب بھی یہاں سکھوں اور مسلمانوں کی تعداد بہت تھی، سمجھ زیادہ تھے، ہندو بھی تھے توڑے تھے۔

باغ کے ایک کونے میں یاد گار بتائی گئی ہے۔ ایک ہال تعمیر کیا گیا ہے جس میں اس وقت کی ساری کمانی موجود ہے۔ لفظوں میں مرحوم ہے۔ لفظ چل رہے ہیں۔ انیسویں نو حہر کر رہی ہیں۔ تصویریں میں داڑھیاں زیادہ ہیں۔ تب مسلمان بھی داڑھی رکھتے تھے۔ اب تو جوان رکھتے ہیں فیشن کے طور پر۔ ہمارے فیشن مغرب کی طرف سے آتے ہیں ہماری جمہوریت بھی مغرب کی طرف سے آئی ہے۔ اب تو خواب و خیال بھی دوسرے آرہے ہیں زندگی کا پیمان بھی اور موت کا سامان بھی۔

اس واقعے کا ہر اس اس پورے ہر صفحہ میں پھر ایک احتجاج میں گیا۔ ہندوؤں کے محرکات ایسے

بھٹو مسلم اتحاد سے پہلے قربانی

جب کوئی قوم کسی معرکے پر تل جائے تو اسے کسی سیاسی یا سماجی میزان پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ بنیادیں ان کے کاروباری دماغ دماغ ہو گئے ہیں۔ ان کے سامنے ترازو پر ایک آدمی سینکڑوں آدمیوں پر کسی طرح بھاری ہو جاتا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت تو ایک سکہ ایک آدمی کے برابر تھا۔ دن میں دن ووٹ۔ ہندو سیاست کے سردار ضرور سنا سنا رہا تھا کہ اس شیشے میں انداز لگاتا۔ سرو کی بجائے ان میں سکوں کو دن میں اندازے نظر آگئے۔ تو سنت جرنیل سیکھ سیکھ رہا تھا کہ لٹو ٹیڈی توڑ دیا۔ جس کی کرچاں پورے بھارت پورے جنات میں بکھری رہی ہیں۔

جرنیل سیکھ گولڈ نیپل میں گر قاری دینے والے سکوں کے جتنے سے تھوہر کھڑا تھا۔ (ابھی گولڈ نیپل پر ہندو فوجی پڑے دوڑنے کی مشق کر رہی تھی)۔ اس شخص کو راجہ کر محسوس ہوا کہ ماں باپ نے اس کا نام کسی معروف کی گھڑی میں رکھا تھا۔ اس کی ماں نے اسے شری کی پجاری میں چھوڑ دیا ہو گا۔ سچی ماں کی گود کچھ کم نہیں ہوتی۔ شری کے ساتھ لٹو لٹو کیلئے شرط ہو کر گئی تھی کہ ان کی ماں زندہ ہو۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ شرط یہ تھی کہ ماں زندہ ہو۔ یہ دونوں باتیں درست معلوم ہوتی ہیں۔ شاید کسی زمانے میں شری کیلئے بھی کوئی شرط ہوئی ہو۔ مگر جرنیل سیکھ کا مقابلہ شری کی خالہ سے ہوا۔

اس بات پر یقین تو نہیں آتا مگر سنا ہے تو آپ بھی سن لیں کہ ایک سیکھ گولڈ نیپل میں سنت بھنڈراؤوالہ کے پاس آ کر آدمی سیوا (خدمت) کیلئے درخواست کی۔ سنتی نے اسے کہا کہ دو سالے جو مٹی کا گھڑا رکھا ہے۔ اس میں سے لیک پر پنی نکالو اس پر جس عالم کا نام لکھا ہے اسے کر ختم کر دو۔ سیکھ پریشان ہو گیا۔ شاید وہ ہندو یا کبھی ہندو تھا یا دل میں ہندو تھا۔ تو سنتی نے اس کے ہوت کی پکپکاتے سے پہلے پھر کہا تو پھر قریبوں کرو۔ ایک پر پنی پر اپنا نام لکھو اور اس گھڑے میں ڈال دو۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ راجی خاموش ہے، عالم کے خلاف نہ لڑنے والا بھی عالم ہے۔ مظلوم کا یہ اعزاز ہے کہ وہ عالم میں ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ جان قربان کر دے۔ میرے دل کے کہا کہ میں سنتی کی گونہ نیا نہی کا یہ شعر سنائیں

بھو شری اسے لوگ دی عالم سن
کچھ سچوں مرن دا شرق دی سن

میں اس کے بارے میں اور کیا کہوں کہ وہ تقسیم ہند کا محرم ہے۔ وہ کتاب ہے بلکہ ادھر کھنڈرا ملے۔ مسلمانوں نے اپنا ملک لے لیا۔ کراڑاں (ہندوؤں) نے اپنی حکومت چلائی۔ تے سدا نکھلن دا کیہ

جنرل نیازی بھی نذر ہیرا

ذات پات والے ہیرا میں ہتھے گیس بھی اپنے پیمانہ ہونے کی نظروں سے (ہر ترقی) غائب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ نیازی پیمانہ کے طوطے تھا اب وہی ہے وہی تھا۔ باہر جب تک جنرل اسے اس کے نیازی پر زندہ ہیں اور سحر خیال سے وہ بیحد زندہ رہیں گے۔ جان کی بازی لگانے والے نہت زندہ رہتے ہیں تو جان بچانے والے جیسے بھانے چاہتے ہیں۔ کبھی بھی بچا جان قربان کرنے سے مشکل ہوتا ہے۔ یہ مشکل کام کر گزرنے پر نیازی صاحب تعریف کے مستحق ہیں۔ کتنے ہیں جنرل نیازی ایک قابل جرنیل تھا۔ انگریزوں سے اسے ہتھی کر اس ویاور ویاگیر کما۔ کتاہے انہوں نے وہ موقع کو اسی دن کیلئے تیار کیا تھا۔ بھانے کپاں تھے، حق زیادہ دیا داتا ہے۔ سراجیادولہ یاد آتا ہے۔ شیخ سلطان یاد آتا ہے۔ یعنی پانچویں آئے پانچویں آپ یہ لوگ۔ ان لوگوں کو شرم آنی ہوگی۔ شیخ شہید کو گھبراہٹوں نے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا تھا۔ جنرل نیازی کی موت پر ہندویش کا ہر سرگلوں ہونا چاہئے اور بھارت سے کاتر کٹا بھی مگر جنرل صاحب نے مرستی جلدی نہیں۔ جنرل کو ہوموں تھا کہ جب کبھی جرنی جرنال دیر دیر لگاتے تو اس سے پہلے کیشیاں اپنے ماتھے پر گولی مار دیتا ہے۔ جنرل نے یہ ہماری بھائی ہوئی بعض عمل کرتے تھا نہ مگر کتنے ضروری ہوتے ہیں۔ اندر لے کر ختم نکال میں نظریہ پاکستان کے ڈوبنے کا سامان کر رہا تھا تو پھر دشمن کشمیر میں اپنے آپ کو بچا کر لانا نہی تو نہیں۔ کتنے میں تو اپنی پشتیاں چلانے کا عمل موجود ہے۔ ان گشتیروں کی راکٹ اب تک وقت کے دور میں بدستور پہنچ نکال سے دور آکر نکال کر اندر لے آئی آج کل میں لگائی۔ نظریہ بھگتی اس کی اور کچھ۔ میرا الو تو یہ توپ کر میرے اندر آواز دے گا کہ مسالو کی کاؤٹی سپوٹ کسی پانچاڑے میں سے سرخرو تاریخ کا ایک اور باب رقم کرے گا۔ اللہ کرے اس وقت تک جنرل نیازی میرے لیے بزدل کر داروں کا مہر ہے تاکہ انہیں اس تمام کارش کر لینے میں غلطی نہیں کیا کرتا۔ اس شرمناک سلسلے کے جو زیادہ بزدل تھے اور خالوں اور لپٹی تھے۔ پہلے ہی سرچکے ہیں۔ غیر طبی موت۔ ایک جنرل نیازی، جنرل جٹا اور کئی سیاستدان جو لوگوں کی نظروں میں نہیں آتے۔

تاریخ کی نظروں سے کیسے بھیجیں گے۔ وقت نکالنا ہمارے کھڑا ہے۔ مگر جو بے جنگ باری نہیں۔ کوئی یہ بتائے کہ جنگ بندی یا سہولت یا صلح ہماری نظروں کی کیا ہے۔ مگر جو بے جنگ باری نہیں۔ کوئی یہ بتائے کہ جنگ بندی یا صلح ہمارے دل کی عالمی سازش سے پہلے بھارتی فوجوں سے نہائی کیا۔ انچے میں یہ قید کیا تھا؟ وہ سرحدوں پر میڈر بھجلیاں دیتے رہے۔ "چانگرا" کی موت کے بعد وہ شرمینا داخل ہوئے۔ کتنے ہیں کہ ان کی موت آتی ہے تو وہ شرمینا پر کرتے ہیں۔ یہ گمانت تاریخی واقعہ بھی ہے کی ایک دن۔

پاک سرحد بینا پاکستان ملک

ہم نے کئی برس اس گھر میں گزار دیے۔ ہاتھیں تیش جھن گیت نہ تے۔ دوسرے دن رخصت ہوئے تو جیسے گھر سے رخصت ہوئے۔ گھر کسی کا جو گھر ہوتا ہے۔ وہ سب لوگ چپ تھے۔ پر آمدہ الوداعی خاموشیوں سے بھر پور تھا۔ میں نے ایک لمحے کیلئے سوچا کہ اس شے کا کیا نام ہو سکتا ہے۔ مجھے کچھ نہ سوجھا۔ ایک بات اچھی لگم جس کا عنوان ایک نظم ہو۔ حزن و مال کا کوئی کنڈنیشن نہ تھا۔ چرواہا پر نہ تھا۔ کوئی چھڑنے کی گھڑی نہیں نزدیک نہیں لگزی تھی۔ وہ باروٹے کی آس آرزو کی چنگ آکھوں میں تھی تو مت دور کیس تھی۔ آسانی سے نظر آتے والی تھی۔ پھر کیا تھا۔ کچھ تھا۔ جس کیلئے لفظ نہیں ہے۔ بنے ہوں گے۔ استعمال میں ہوتے۔ کون کس سے پیدا ہو رہا تھا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ شاید اس ہوا سے جو ان کے وجود سے معاف کرنے کے بعد ہم سے نکل رہی تھی۔ اس کھلنے سے جو اس گھر کے ایک بچے کے ہاتھ سے گرا تھا اور میں نے اٹھا کے اسے دے دیا تھا۔ وہ مسکرایا پھر شرابا یا تھا۔ یا شرابا یا پھر مسکرایا تھا۔ کھلنے بچوں کے ہاتھ سے نہیں گرا کر کے ٹوٹے تو سوچتا ہوں۔ وہ بڑے تو نہیں ہو گئے۔

اچھے لوگوں سے ملنے کی خواہش تو رہتی ہے دل میں۔ میں یہ اُٹی ہے۔ ہم امرتسر سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک بچہ سرگرم ہاتھ ہلا رہا تھا کہ ہمیں الوداع کہہ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کاہر سے باہر کیا اور اسے جواب میں سلام کیا تو وہ ایک اونگھی خوشی سے ٹھٹک اٹھا۔ وہ ہرگز نہ کی کاڑی کو الوداع کہہ رہا تھا۔ جب وہ فکروں سے اوجھل ہو گیا تو ایک لمحے کیلئے مجھ پر اس کا احساس مجھے ہوا۔ یہ بھی احساس مایوس کہ میں بھارت سے جا رہا ہوں۔ اگر میں نہ ہوتا تو میرے قدم ضرور رکستے۔ جب قدم زمین پر نہ ہوں تو تینے اٹھنے اٹھنے سے ہیں۔ مٹی اڑاؤ کر جا رہی آکھوں میں پڑ رہی تھی۔ مٹی پاؤں نہ چوسے تو آدمی اپنے زانوؤں میں چھوٹی مٹی نہ جاتا ہے۔

سرگرم کے ساتھ کچھ لوگ پیدل چل رہے تھے۔ مراد اور عورتیں بھی۔ مکمل نے بتایا کہ آج بھی کئی لوگ پیدل دیکھتے تک چلے جاتے ہیں۔ یہ توان کے چلنے کا انداز تھا۔ ہاتھ ہاتھ کا وہ چلتا جاتے ہیں۔ عورتیں مورنوں کی طرح چل رہی تھیں۔ ان کے چروں میں نئی پٹریں نہ تھیں مگر ان کی نور (چال) دیکھنے والی تھی اور وہ خاصی نور (شان) سے چل رہی تھیں۔

میںوں لے دے پانزیل نوایں
مے چے توں میری نور دیکھنی
جن کے پاؤں میں پانزیں نہیں ہوتیں۔ خواہشیں ٹھکروں کی طرح ان کے اندر بج اٹھتی ہیں۔

انجانی جسدانی

اپنے پیار سے وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی محسوس ہوا کہ جنت میں داخل ہوئے ہوں۔ یہاں مجھے اور کئی لاکھوں لوگوں کو تکلیفیں ہیں یہاں بھی جیون اور جنم میں بعض اوقات کچھ فرق نہیں ہوتا۔ مگر بھارت سے واپسی کے بعد کوئیوں سے بھری ہوئی ہینڈ سے بیواری کا احساس ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی خواہش تو خدائے خلقت کر سوائوں کو بھارت کا شہر رکھنا تھا پھر بے کسی کی حفاظت بھری راحت کا احساس کرانے کے لئے شور مچانے والوں کو ایک آدم غلط گویا لیتا چاہیے

عجب بات ہے کہ پاکستان ساری دنیا سے کرکٹ بلی کچ بچے جاتے تو کچھ نہیں ہوتا۔ مگر بھارت کے مقابلے میں کوئی کامیابی شادمانی کا ایک زندہ تحقیق کر رہا ہے۔ یہ دونوں ملک دو جی کے میدان میں بھی ٹیک دوسرے کے مقابلے میں گے یہ نفسیات دونوں طرف تذبذب و تاراج کی گمراہیوں میں اتر گئی ہے۔

پاک سرحد پر کوئی ہمارا استقبال کرنے والا نہ تھا پھر بھی ہوا کا پلاسما جو ٹکا ایک مانوس ڈانٹنے کی طرح ہماری سانسوں میں گھل گیا۔ ہوائی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ ابھی سانسے بھارت کی فضا میں نظر آ رہی تھیں۔ کسی احسان نے کچھ نہ کچھ بدل دیا تھا میری اُٹی ہے۔

ہم اوتھ سے شالاد باغ تک اُٹتے ہوئے آگے کرانے کی کار میں بیڑی تیر طرار ہوئی تیر شالاد باغ کی نسبت سے یہ علاقہ قریب پورہ لگتا ہے بھارت کے بندو سے بھگوان پورہ کہتے تھے۔ پھر شالاد باغ کا کیا نام ہوا۔ اب یہ باغ ایک عام سرگرم ہے۔ اس کے قریب ہی ایک اور تفریح گاہ بن گئی ہے۔ جہلو پارک۔ پنجاب کے ایک گورنر جنرل جیلانی خان نے بنوائے ہے۔ گورنر جیلانی کی زندگی نے ساتھ نہ دیا تو وہ پورے لاہور کو تفریح گاہ میں تبدیل کر دیا۔ جیلانی اچھی زندگی سے مکر گورنر نہیں تو یہ کیا زندگی ہوئی۔ گلشن اقبال ریس کورس گزرا تو بھارت پاکستان اور کئی دوسری چھوٹی بڑی پارکیں۔ ٹھکانہ میرے گھروں والے کچھ دیر کے لئے حرا لے لینے میں شایں اداسی کا حسن میں کچھ ہیں کئی میزیں ہوا رنگ شادمانہ ہو چکی ہیں البتہ جو راستے قریب نشیروں کو چاہتے ہیں۔ ان کا حال فریبوں میں رہا ہے لوگ دھائیں لگتے رہتے ہیں کہ ان کی طرف وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم کی جھکی آئے۔

ماڈل مکان بھی بننے ہیں شہروں میں کئی ایک بھی گاؤں کو ماڈل مکان میں کامیاب سکتا ہے۔ مدت بعد ایک شہری دلاؤ نواز شریف پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا ہے۔ شاید وہاں کی بھی قسمت جاگے اور نہ ماڈل پنڈو وزیر اعلیٰ افسر شایں کے ہاتھوں جن میں بھی اچیل فل بننے رہے ہیں۔ ہر حال لاہور میں ایسی جگہوں پر

کی طرح مرتجع خلافت ہو آئے۔ یہ کیا راز ہے۔ راز ہم سے روختے جا رہے ہیں سنا ہے پہلے کبھی میلہ چڑھا اے دن سارے شہر میں اندراج ہو جاتا تھا۔ شاہ حسین کے مزار پر ایک دیباچہ لکھا تھا۔ کیلکٹا ہو گا وہ ایک دیباچہ اس پر چرخ سے چراغ سے چراغ ملتے تھے۔ وہاں پہنچتی تھی۔ یہ مسکروں والا جانا تھا خالص تہذیبی سرگرمی پورے جہان پر تھی سارے شہر کے مزدور تھے پہنچ کر بڑے مجمع ہوتے تھے ان دنوں میں لاہور کی شہر کے شہرین جانا تھا۔ نہ کسی کی جیب تھی نہ کسی کا سر پہ پھٹا تھا نہ کسی کی ہتھیاری تھی۔ اب اس دن صرف چھتری ہوتی ہے۔ ویسے بھی سب ہم آج کل پچھلی پرچہ دیباچہ کے دن اندراج نہیں ہو جاتا پھر شہر میں منظر کچھ نہیں آتا لوگ کتے ہیں لنگر تو آ رہا ہے سب بچو۔ آگے آگے لوگ لڑکیاں و کالیں سرگرمی اور کٹافٹر آئے پہلے جاتا ہے کہ اس دن وہاں لڑکیاں نہ آئیں گے۔ گروہیں چکاچند نہیں آئیں گی۔ یہ وہ جاتیں دیکھنے والے سب لوگوں کے دلوں میں مٹی کا دیباچہ تھا اب لوگوں کو چند حیا دینے والی روشیاں چاہیں

جس طرف ہماری سواری جاری تھی دور تک کوئی قافلہ نہ آکر چھ نہیں اور گروہ تھے اور خوں کی طرح گھریں مگر کسی کامایہ ساتھ والے گھر تک نہیں جاتا

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے

اب کوئی کہیں کوئی نہیں جانتا ہے۔

کیونکہ دور ہمارے ہاتھ ضرر بردہ رہی ہے جو شہر لاہور کا یہ نہ سوار کے گزرتی ہے۔ خط مستقیم کی طرح سیدھی۔ خوش منظر۔ دونوں طرف راستہ۔ گھر سب کوئی ایک جگہ پیدل پہنچتا ناظر آئے گا۔ نہ منتظر دور تک بکھرتا ہے۔ نہ مسکراہٹ دیر تک کھتی ہے۔ نہ منتظر کے پرندے کاؤٹے دیا جاتا ہے۔ نہ آرزو کے منظر کو کھلنے دیا جاتا ہے۔ تاک کی سیدت میں دوڑے جاتے ہیں لانچ کی آمد میں بکڑے ہوئے لوگ۔ راہ راست بھی خوشگوار ہوتا ہے۔ گھر اس پہنچنے والے جو بھی ہیں۔ وہی ہو جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ آپ رواں کے کنارے کوئی درندہ کسی چادر پر حملہ نہیں کرتا۔ اگر اب کبھی ایسا ہو جاتا ہے تو اس درندے سے ضرور کوئی آدمی چھاپا بیٹھا ہوگا۔ سر نہ دے ہی اپنی جگہ پر۔ اور ہم سب سے پیشینہ و سہولت سے گزرتے ہوئے شیر اٹھالے گیت سے بھی آگے بٹھ جاتے۔ مگر خوشبو سے روک لیا۔ وہی خوشبو جو مولانا علی لاہوری کی وفات پر ان کی قبر کی مٹی سے آتی تھی۔ آج بھی کوئی اس خوشبو سے ریاضت کھتا ہوتا ہے محسوس کر سکتا ہے۔ یہی بیچوانی کی لارپ کی تجربہ گاہوں میں کہہ چکے ہیں۔ خوشبو کے اجڑاؤ نہیں ہیں پھر بھی ہے۔ فیصلے کسی دیباچہ خوشبو ہے۔ لاہوری صاحب بھی مسجد سے بازار میں پہنچتے تھے تو کہتے۔ ”کوئی انسان نظر نہیں آتا کوئی کتابت کوئی پھیرا۔ کوئی ہندو کوئی گدھا کوئی سانپ کوئی بچہ“ پھر ان میں سے خوشبو کس کو آئے۔

لاہوری لڑکے سے ایسے دیکھیں نکل نکل کر اپنے سہولت کو جاری تھیں۔ بیوں اور وہاں سے ایک سی آواز میں دوزخ کے باہر آ رہی تھیں۔ ہمیں گاتے ہوئے تھے ہمیں خبر نہ ہو رہی تھی۔ دونوں ایک

چاہتا ہوتا ہے جو بیانی صاحب یاد آتے ہیں اب دور گورنمنٹ کوان سے ملاقات بھی ہو جائے گی میری ملاقات اب خاں سے بھی ہوئی تھی۔ جب وہ صدر نہیں رہے تھے۔ یہ ملاقات بھی کسی ایسی یاد کے کونے کھدے میں ہوئی تھی۔ اس قسم کے لوگ مجھ ایسوں کے لئے وقت سے پہلے رونا رہ جاتے ہیں۔

کیونکہ اس سے پہلے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ نہ ہمارے پاس ہوتا ہے

صدر ضیاء الحق سے میری ایک سرسری ملاقات ہو چکی ہے جیسی کوان کو رونا رہنے کی ایسی جلدی نہیں۔ جب میں ان سے ملکہ وہ مجھ سے ملے تو اس وقت صدر نہیں تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ بالکل صدر نہیں ہوتے۔ کون جانے کسی وقت وہ کیا ہوتے ہیں ان کی کیا بات ہے وہ ان لوگوں سے خود ملنے چل پڑتے ہیں جن سے ملنا تھا ضروری بھی نہیں ہوتا کسی بھی ان سے بھی مل آتے ہیں جو ان سے ملنا نہیں چاہتے اس وقت پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں صدر ضیاء کی فکر کا یا ستان کم کم ہے۔

نجانے کیوں ہمارے ہاں لوگ وزیراعظم سے زیادہ صدر کے لفظ سے مایوس ہیں۔ لفظ کی بھی اپنا ایک شخصیت ہوتی ہے۔ صدر بننا آسان بھی ہے۔ کسی شخص کی سیاسی جماعت یا فیصلہ سازی تنظیم کسی ادنیٰ تقریب کا صدر بننا جاسکتا ہے۔ کبھی اعظم کا لفظ وزیر کے ساتھ لگ کر اتنا بھی اور مجرم ہو گا کہ وزیراعظم کہتے ہی کوئی شخصیت ذہن میں آجائے۔ جس طرح سکندر اعظم، خاندوق اعظم، اشوک اعظم، مغل اعظم، شاہی اکبر اعظم۔ یہ نام سیاست و ریاست کے نوالے سے مجھے یاد آتے ہیں۔ کچھ بھول بھی گئے ہوں گے۔

شالامار اور جلو پارک سے کچھ دور وہاں کے لافانی شاعر شاہ حسین کا گھر ہے ہمارے ایک عالمی شہرت کے انفعیات دان ڈاکٹر محمد اہمل کہتے ہیں کہ شاہ حسین اور خواجہ غلام فرید دنیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ وہ خواجہ فرید کو بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ میں اس فرصت میں سلطان بابو بیٹھے شاہ حسین محمد نچل سرست کو بھی شامل کر آجوں۔ یہ سب لوگ صوفی تھے۔ عاشق تھے۔ کشادہ دل تھے۔ اللہ کے دوست تھے اللہ کے بندوں کے دوست تھے۔ شاہ حسین کو زیادہ تھا۔ اس نے ایک ہندو لڑکے کا حوالہ لے کر عشق کیا اور مرنے کے بعد بھی اپنے ساتھ لے آیا۔

شاہ حسین حیات کو زمین مرن توں پہلے مرو

شاہ حسین تو حیات چاہتا ہے تو مرنے سے پہلے میرا بیٹو توں آئیں لا موت۔ اس نے شادی نہ کی۔ بے اولاد مرا۔ مگر بے اولادوں کی گورہی کرنے کے حوالے سے اس کی خوشبینی کی طرح مشہور ہیں خدا کا در ہے وہ چاہے تو کہیں سے بھی ہندو پھر آکر سکتا ہے۔ اس سے بڑی کرامت کیا ہوگی کہ خود شاہ حسین ماوراءالہا بن گیا۔

ماوراءالہا مسلمان ہوا نہ شاہ حسین ہندو بنا۔ دونوں دونوں چیزیں بن گئے۔ ظلم ہے کہ ہمارے اکثر سیاسی دانشور لڑ صرف اردن کے شاہ حسین سے واقف ہیں شاہ حسین کے مزار پر میلہ چڑھا لیا گیا ہے ہمارے ہاں تقریباً بھی میلے صوفیوں یا صوفی شعرا کے مزاروں پر لگتے ہیں جان لوگوں کا مرقہ۔ ان کی مجلس

الگ بات ہے کہ اس راز کا مداری عمر سے اپنے تہہ پہلے۔
 علامہ اقبال اور قائد اعظم کو بھی بھیجا گیا تھا۔ زمینیں ایسے آدمی کی شکر رہتی ہیں۔
 غرض موجود ہوتا ہے۔ کسی خاص لمحے میں اس کی موجودگی قیادت میں بدل جاتی ہے۔ اور لوگ اسے حلیم
 کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی پاکستان جیسے نئے عمر میں داخل ہو رہا ہے۔ ۱۳۔ اگست ۱۹۸۷ء کو پورے چالیس
 برس اور ہے ہیں۔

تاریخ و تہذیب کے استوں پر بیش ایک آدمی زمانے کی آنکھ میں نمودار ہوا۔ اور سب کو سب کچھ
 نظر آنے کا بحر الرسول اللہ، عربین عبدالعزیز، شیر شاہ سوری، صلاح الدین ایوبی، لکھنؤ، جیسے زمین داد
 سوچی منہ، لکھنؤ، چاند اعظم، شاہ فیصل، فیاض الحق، گور باپوف۔ جب ہر طرف دایوی تاجی ہے تو پھر
 ایک انسان پیدا ہوتا ہے۔ کسی انسان کے اندر ایک اور انسان پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی جلد یہ واقعہ
 ہونے والا ہے۔ پھر یہ ثابت ہو جائے گا کہ پاکستان نہ بڑا و خلیج کے کسی ملک بھارت کی کاٹنی ہوتے۔ پاکستان
 ان عربوں کا مرکز ہو گا۔ جن کے نتیجے میں ان سب علاقوں کی خاک چمک اٹھے گی۔ جہاں مسلمان رہتے ہیں۔
 چارہ معنی ان زمینوں کو بھی منور کرتی چلی جائے گی۔ جہاں انسان بستے ہیں۔ ذرا سی دیر کیلئے کسی یہ کائنات
 ستر ہزار برس سے پہلے کھر کھر جائے گی۔ یہ منظر ہماری آنکھیں دیکھیں گی۔ ہم نہ بولے تو دیکھنے والے
 تیار ہی کیلئے ہو رہے دیکھیں گے۔

ملت اسلامیہ اور بنی نوع انسان کیلئے امیدوں اور خوابوں کے دروازے پر ایک انقلاب کی دستک ہو
 علامہ اقبال کی شاعری میں کوئی۔ اب ہر کسین ستانی اے رہی ہے۔ اقبال بیسویں صدی کا سب سے بڑا
 شاعر ہے۔ اس کا کہا بواج ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور وہ مفکر پاکستان بھی ہے۔ اس کے حبيب کا دروازہ
 پاکستان میں کھلتا ہے۔